قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ستمبر 2020 قیمت 15₹

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

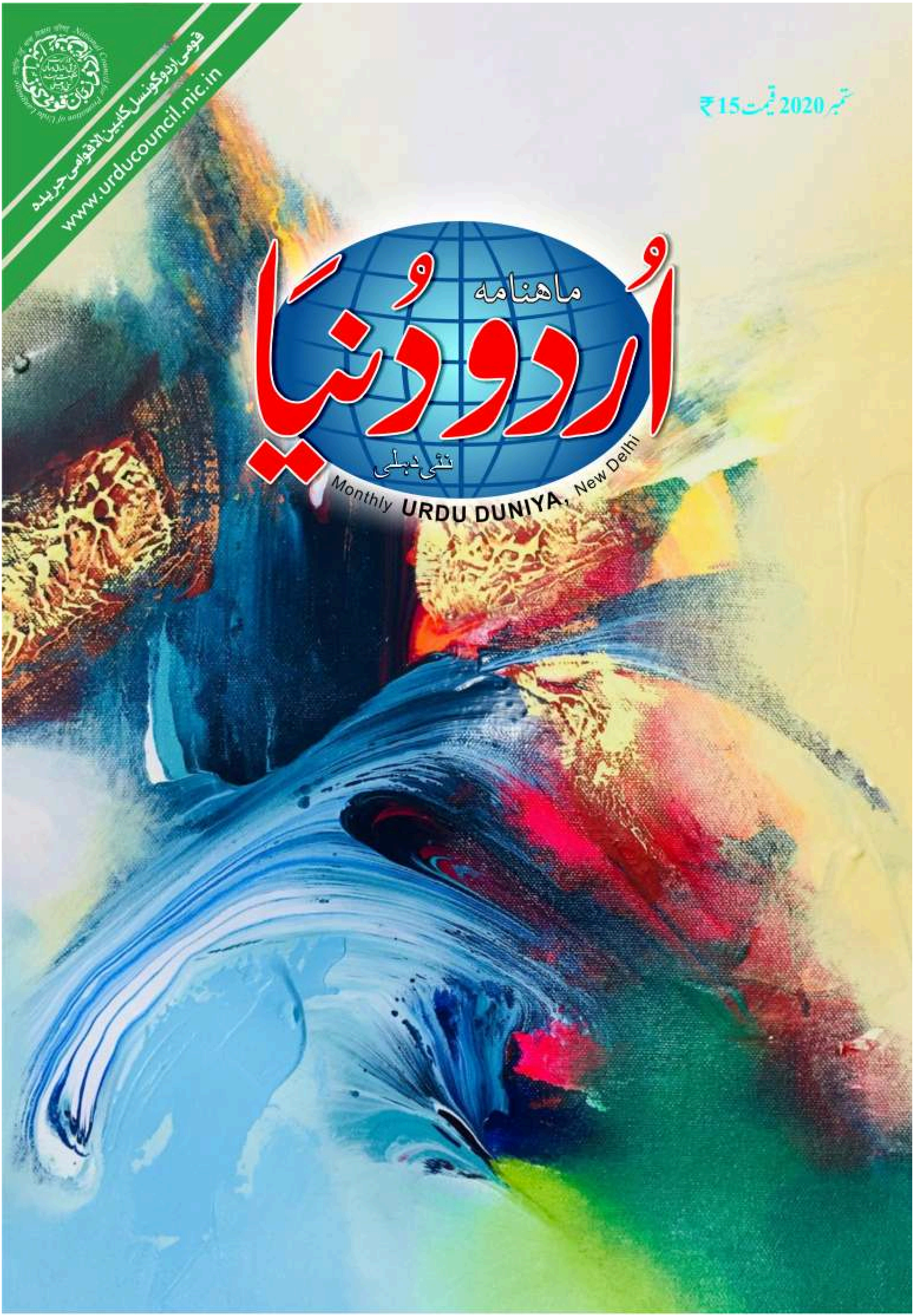

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

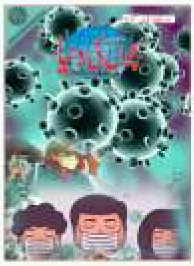

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

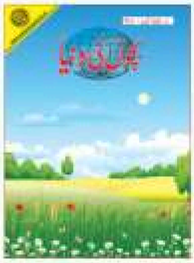

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22،شمارہ:09،ستمبر 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم،محکمۂ اعلیٰ تعلیم،حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز،بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ:محمد اکرام
ڈیزائننگ:محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPULاور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون،ایف سی 33/9،انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،۔
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8،ونگ-7 آر کے پورم،نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22،تھرڈ فلور،ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی،حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

زبان و تعلیم

طلبا کے ذہنی احتساب میں امتحان کا کردار شاہین پروین 7

نقد و نگاہ

جدیدیت: آغاز،عروج وزوال محمد توقیر عالم 11
چار بیت میں برسات کی بہاریں راشد میاں 16
ادبی تھیوری کیا ہے؟ اشرف لون 18
مرزا غالب کا طبی شعور ایم اے کنول جعفری 22
گجرات میں اردو غزل 1950 کے بعد غلام محمد انصاری 26

یاد رفتگاں

گلزار دہلوی معصوم مرادآبادی 31
نندکشور وکرم کے ساتھ ایک سیلفی خورشید اکرم 5
کبیر اجمل اشتیاق سعید 39
نصرت ظہیر آبگینہ عارف 42

باب تجزیہ

ساحل پر لیٹی ہوئی عورت شہناز رحمٰن 44
بلراج مین را کا افسانہ 'وہ' نور فاطمہ 47

ستمبر کے ستارے

حبیب تنویر: لوک تھیٹر کی بازیافت محمد شاہنواز قمر 50
مانک ٹالا کے افسانوں میں ہندو دیومالائی عناصر توصیف بریلوی 52

سلسلہ صحافت

مشرقی پنجاب میں اردو صحافت یوسف رامپوری 54
روزنامہ 'رہبر دکن' سے 'رہنمائے دکن' کا 100 سالہ صحافتی سفر شیخ عمران 57

شخصیت

ابوالقاسم زہراوی عبدالناصر فاروقی 60

طب و صحت

وبائی امراض اور انسانی رویہ شفیق احمد 63

ابتدائی طبی امداد لئیق احمد صدیقی 66

نیا آسمان نئے ستارے

سراج کی شاعری میں اسلامی تلمیحات صدیقی صائم الدین 69
اسکولی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مسائل غفرانہ بیگم 72
شہروں اور علاقوں کے نام پر اردو کے اثرات عائشہ صدیقہ 74

کمپیوٹر

ایم ایس۔ایکسل پر کام شروع کرنا؟ 76

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ ادارہ 79

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 86

ہماری بات

موجودہ حکومت نے بالآخر طویل غور وخوض اور مشاورت کے بعد نئی تعلیمی پالیسی 2020 کو منظوری دے دی ہے۔ تعلیمی پالیسی کو 34 سال بعد تبدیل کیا گیا ہے۔ وزیر تعلیم جناب رمیش پوکھریال نشنک نے اس پالیسی کو متعارف کرواتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ یہ پالیسی نئے ہندوستان کی تعمیر میں سنگ میل ثابت ہوگی۔ اس پالیسی پر ملک کے کونے کونے سے رائے لی گئی ہے اور اس میں تمام طبقات کے لوگوں کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ اس تعلیمی پالیسی کو تیار کرنے سے پہلے ملک بھر کی ڈھائی لاکھ گرام پنچایتوں، 6600 بلاکس اور 676 اضلاع سے مشاورت کی گئی ہے۔

اس پالیسی کے تحت اب ابتدا سے پانچویں درجے تک کے طلبا کو لازمی طور پر اور آٹھویں تک اختیاری طور پر مادری زبان، مقامی زبان اور قومی زبان میں تعلیم دی جائے گی، باقی مضامین (خواہ وہ انگریزی ہی کیوں نہ ہو) بطور سبجیکٹ پڑھائے جائیں گے۔ اس التزام سے دیگر زبان والوں کے علاوہ ان طلبہ و طالبات کو بھی خاص فائدہ ہوگا جن کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ آٹھویں کلاس تک کی تعلیم اردو زبان میں حاصل کر سکیں گے۔ اس پالیسی کے تحت ملک کی تمام شڈولڈ زبانوں کے تحفظ اور ان کی ترقی کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ انٹرپریٹیشن (آئی آئی ٹی آئی) کے قیام کے ساتھ ساتھ پالی، فارسی اور پراکرت جیسی زبانوں کے فروغ کے لیے قومی سطح کے اداروں کی بھی تشکیل کی جائے گی۔ اس پالیسی میں علاقائی زبانوں میں ای کورس شروع کرنے کی بھی تجویز رکھی گئی ہے۔ یہ پالیسی اس لیے بھی بہتر ہے کہ اس میں فرسودہ نظامِ تعلیم کو ختم کر کے نئے انداز میں تعلیم دینے کی بات کی گئی ہے۔ طالب علموں کو بنیادی سطح پر ہی ووکیشنل تربیت دی جائے گی، انھیں کوڈنگ سکھائی جائے گی اور چھٹی کلاس سے ہی انٹرن شپ کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ کتابی علم سے زیادہ خود سے سیکھنے پر توجہ دی جائے گی۔ حکومت کا مقصد ہے کہ 2030 تک ملک میں خواندگی کی شرح 100 فیصد تک پہنچائی جائے۔ یہی نہیں 2020 میں اسکول چھوڑ چکے 2 کروڑ بچوں کو دوبارہ اسکول سے جوڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ اعلیٰ تعلیمی نظام میں مضامین منتخب کرنے کی آزادی ہوگی، چنانچہ اگر ہندی، سماجیات یا فلسفے کے ساتھ کوئی طالب علم حساب یا علم حیوانات پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح علم کیمیا کے ساتھ تاریخ بھی پڑھ سکتا ہے۔ اردو کے طلبہ بھی اپنی دلچسپی کا کوئی بھی سبجیکٹ منتخب کر سکتے ہیں۔ اس پالیسی میں ورچوئل کلاسز اور آن لائن نظام تعلیم کے فروغ پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے، جو ایک خوش آئند اقدام ہے کیونکہ ہندوستان میں اب تک اس کی اہمیت پر اتنا غور نہیں کیا گیا تھا، مگر کورونا وائرس کی وجہ سے عالمی سطح پر نافذ ہونے والے لاک ڈاؤن نے انٹرنیٹ کے ذریعے، آن لائن طریقے سے تعلیم و تعلّم کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔

اب صرف بارہویں جماعت میں بورڈ کے امتحانات دینے ہیں، جبکہ اس سے پہلے دسویں میں بھی بورڈ کا امتحان دینا لازمی تھا۔ نویں سے بارہویں جماعت تک سیمسٹر میں امتحانات ہوں گے۔ 5+3+3+4 فارمولے کے تحت اسکول کی تعلیم دی جائے گی۔ اسی طرح کالج کی ڈگری 3 اور 4 سال کی ہوگی۔ یعنی گریجویشن کے پہلے سال سرٹیفکٹ، دوسرے سال ڈپلومہ اور تیسرے سال میں ڈگری دی جائے گی۔ تین سالہ ڈگری ان طلبا کے لیے ہوگی، جن کو اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کرنا ہے، جبکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو 4 سالہ ڈگری کورس کرنا ہوگا، اس کے بعد وہ ایک سال میں ایم اے کر سکیں گے۔ اعلیٰ تعلیم میں ایم فل ختم کر دیا گیا ہے، اب طلبا ایم اے کے بعد براہِ راست پی ایچ ڈی کر سکیں گے۔ اعلیٰ تعلیم میں 2035 تک مجموعی اندراج کا تناسب 50 فیصد تک ہو جائے گا۔ اسی طرح نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اگر کوئی طالب علم کسی کورس کے درمیان میں کوئی دوسرا کورس کرنا چاہتا ہے، تو وہ محدود وقت کے لیے پہلے کورس سے وقفہ لے کر دوسرا کورس کر سکتا ہے۔

اس تعلیمی پالیسی میں اور بھی کئی اچھے اصلاحی اقدامات کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیچر ٹریننگ اسکولوں، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے فنڈ میں اضافے اور یونیورسٹیز کے کورسز کے انتخاب میں آزادی وغیرہ پر زور دیا گیا ہے۔ ایک اچھا پہلو یہ بھی ہے کہ اب اساتذہ کو صرف تعلیمی سرگرمیوں تک محدود رہنا ہے، ان سے کوئی دوسرا غیر تعلیمی کام نہیں لیا جائے گا۔ اپنے ملک کے تعلیمی شعبے میں بہت سارے اصلاحی اقدامات کی بہت پہلے سے ضرورت تھی۔ موجودہ حکومت نے اس سمت میں قدم اٹھا کر غیر معمولی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ امید ہے کہ اس سے ملک کے تعلیمی نظام میں ایک خوشگوار انقلاب آئے گا اور اس پالیسی کے روبعمل آنے کے بعد ملک کا تعلیمی مستقبل نہایت روشن و تابناک ہوگا۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

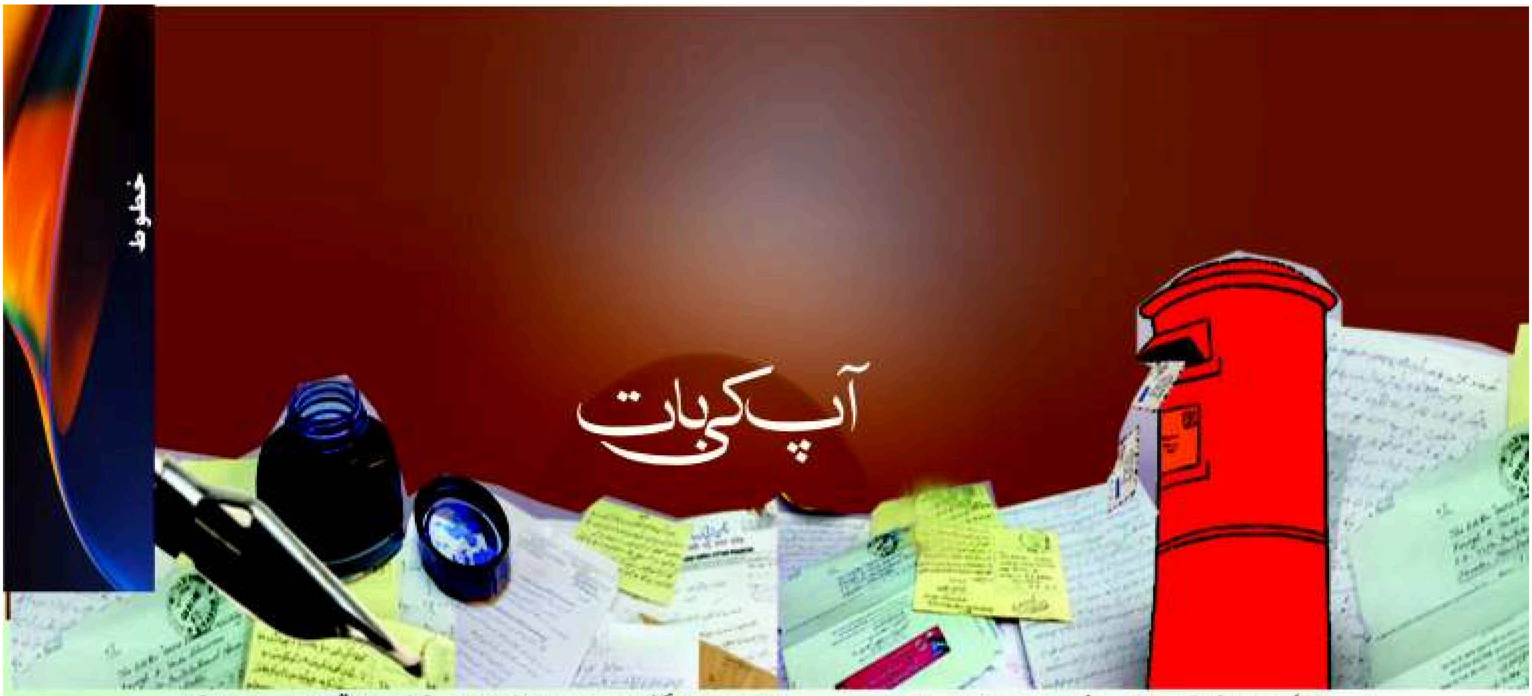

آپ کی بات

'اردو دنیا' مئی 2020 کے شمارے میں مدیر محترم نے ہماری بات میں ادب سے سماج اور معاشرے کے رشتے پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہر سچا ادیب اپنے معاشرے پر گہری نگاہ رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کی خوبیوں کو بھی پہچانتا ہے اور اس کی خامیوں پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔ مدیر نے سچ کہا ہے کہ اردو کا ادیب ہمیشہ سے اتحاد، اتفاق اور گنگا جمنی تہذیب کے گن گاتے ہیں۔ اردو میں رواداری، یگانگت اور انسانی ہمدردی ہے، انسانیت کی بقا کا سامان ہے۔ محمد جہانگیر وارثی نے جدید انفارمیشن ٹکنالوجی کا اردو میں استعمال صورت حال اور امکانات میں کہا ہے ابھی اردو مکمل طور پر ٹکنالوجی سے مربوط نہ ہوسکی جو کمی ہے وہ پوری کرنی ہوگی۔

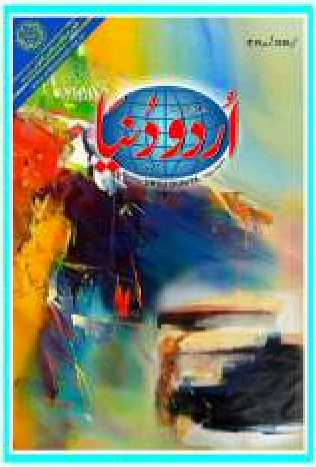

جدید ٹکنالوجی سے جڑنے کے بعد کئی سطح پر اردو کا دائرہ وسیع ہوا ہے۔ یوٹیوب چینلس کے علاوہ بہت سے ایسے واٹس ایپ گروپ ہیں جن میں اردو کے مسائل پر بات چیت کی جاتی ہے۔ لوگ ان گروپس میں اردو کے متعلق کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ غزلیں، کہانیاں، ناول، نئی نئی رائے، تبصرے، مراسلے وغیرہ انٹرنیٹ پر اردو کے دائرے کو وسیع کرنے میں یونی کوڈ نے اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے اردو سے ناواقف فرد بھی اردو لکھنے کی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔ فروغ اردو کے لیے ضروری اقدامات سورج دیو سنگھ نے لکھا۔ وہ کہتے ہیں دنیا کی کسی بھی زبان کو نہ تو کسی ایک مذہب سے یا قوم کے لوگ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ایک قوم کے چاہنے پر اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کے بننے اور سنورنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ فرحت نادر رضوی نے چکبست کی قومی ملکی وطنی شاعری کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ چکبست کی شاعری زمین اور مٹی سے مربوط ہے۔ انھوں نے وطنی و قومی یک جہتی کے جذبوں کو عام کرنے کی کوشش کی ہے ان کی کئی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ آگرہ بازار کے آئینے میں نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری کو حبیب تنویر نے ڈراما کے روپ میں پیش کیا۔ ڈراما پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آگرہ کی سماجی، معاشی، تہذیبی، تمدنی حالت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ غضنفر اقبال نے دکن کا نیر تخن احسن یوسف زئی کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ مسرور صغریٰ نے مومن کے کلام میں تصوف اور رومانیت کے عناصر اشعار کے ذریعے پیش کیے ہیں۔ محمد نہال افروز نے تقابلی مطالعے کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ تقابلی مطالعے سے دو علمی دنیاؤں سے آگہی ہوتی ہے پر زبان میں علم و ادب الگ الگ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ علمی وسعت ہوتی ہے۔ جسیم الدین کا مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور دہلی یونیورسٹی، فاروق اعظم قاسمی کا مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی مکتوب نگاری، عبدالباری قاسمی کا پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی: شخص و عکس، مسز عبدالقادر کے تحیر خیز افسانے، حمید الماس بحیثیت مترجم، علی گڑھ میں اردو سفرنامہ نگاری وغیرہ مشمولات ادبی و علمی بصیرت آگہی عطا کرتے ہیں۔ مئی کا شمارہ اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتا ہے۔ مضامین کی نوعیت نئے انداز سے ہے اور مواد بھی معلومات افزا ہے۔ اردو داں طبقہ اس سے استفادہ کرے تو بہت کچھ ملے گا۔

اردو دنیا اپریل 2020 کا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ اس شمارے کے اداریے میں مدیر نے اردو ادب میں لکھے گئے موضوعات پر عمدہ بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہماری تہذیب اور تاریخ کے بہت سے حوالے معدوم اور منسوخ ہوتے جارہے ہیں۔ ان حوالوں کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ان گم نام فنکاروں کو بھی تلاش کرنا چاہیے جنھوں نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ اس کے مشمولات میں سعود عالم نے ثانوی درجات میں اردو قصائد کی تدریس کے حوالے سے لکھا ہے کہ قصیدہ پڑھاتے وقت استاد کو یہ بھی واضح کردینا چاہیے کہ اردو شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ محمد افروز عالم تدریس کے عصری تقاضے میں لکھتے ہیں اچھا استاد ذوق مطالعہ و تحقیق رکھتا ہے۔ پوری زندگی طالب علم رہتا ہے اور ہمیشہ حصول علم کا شائق ہوتا ہے۔ آج کا معلم گلوبل خصوصیات کا حامل ہو وہ 24 گھنٹے اپنے پیشے کے فروغ و ترقی کے لیے فکرمند ہے۔ عالمی یوم مادری زبان کی پروقار تقریب میں مادری زبان کی اہمیت کو مختلف زاویوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ مادری زبان ماں کو آتی ہے لیکن بچے محروم کردیے جارہے ہیں۔ تنویر اختر رومانی نے اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور جائزہ لیا ہے۔ محمد زبیر نے وارث علوی کی تنقیدی بصیرت میں ان کی تنقیدی فکر، رویے، طریقے سے بحث کی ہے۔ وارث علوی نے کئی ایک ادیبوں کو Establish کیا ہے۔ منٹو کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اقبال اور غالب رؤف خیر کا مضمون ہے جس میں انھوں نے ان دونوں کی شاعری کا تجزیاتی تقابل کیا ہے۔ دونوں کی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اشعار کے حوالے سے تفہیم و محاکمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 17-7-335، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہ نامہ اردو دنیا جولائی کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اداریے میں ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب نے نئی نسل کی صحیح رہنمائی، ان کی حوصلہ افزائی، ان کی تخلیقی صلاحیت کو ابھارنے جیسے اہم نکات پر کارآمد مشورے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے موجودہ اصحاب فکر و دانش کو مشورہ بھی دیا ہے کہ اگر وہ معاشرے میں بہترین اور معیاری ادب تخلیق کرنا چاہتے ہیں نیز اپنے عظیم اسلاف کے سچے جانشین پیدا کرنا چاہتے ہیں تو نئی نسل کی صحیح رہنمائی کی جائے اور ان کا ہر ممکن تعاون کیا جائے۔

یہ شمارہ میرے لیے اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں شہر عزیز برہان پور کی دو عظیم شخصیتیں حضرت فاضل انصاری (وفات 12/ستمبر 1992) پر تحقیقی مقالہ اور حضرت محسن امیدی (وفات 20/نومبر 2018) کا انٹرویو شامل اشاعت ہے، جو کہ بحیثیت فرزند برہان پور ہونے کے میرے لیے بے حد مسرت کی بات ہے۔

انٹرویو کے کالم میں جناب اختر کاظمی صاحب کا محسن امیدی مرحوم سے لیے گئے انٹرویو میں محسن صاحب کی شخصیت وفن کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اہالیانِ بھیونڈی نے واقعی ان کی اردو زبان وادب کے تئیں خدمات کا حق ادا کیا ہے۔ مورخہ 21 جنوری 2018 کو بزم یارانِ ادب بھیونڈی کی جانب سے عالی شان پیمانے پر جشنِ محسن امیدی منایا گیا تھا، جس میں ان کی شخصیت وخدمات پر دانشورانِ ادب نے سیر حاصل گفتگو کی تھی مگر افسوس برہان پور میں ان کے شاگردان و جانشینان اور وابستگان نے ان کے انتقال پر تعزیتی نشست کے علاوہ آج تک کچھ نہیں کیا۔ محسن صاحب کی تقریباً 80 کتابیں ہیں جن میں سے چند کے علاوہ بھی منتظر اشاعت ہیں۔ وہ بارہا اپنی گفتگو میں کہا کرتے تھے کہ میری دو ہی خواہشیں ہیں ''زندگی میں ایک مرتبہ حج اور اپنی ساری کتابوں کی اشاعت۔'' امید ہے ان کی وفات کے بعد ان کے وابستگان اور شاگردان اس طرف توجہ دیں گے، اور برہان پور کے ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے میں اپنا تعاون پیش کریں گے۔

معین الدین عثمانی صاحب کا تحقیقی مقالہ 'فاضل انصاری اپنی شعری کائنات کے آئینے میں' میں موصوف نے مکمل طور سے دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ فاضل صاحب کے شعری افکار پر پر مغز گفتگو فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ نوشاد حسین صاحب کا 'ادبی سرقہ کیا ہے؟' اور محمد مبارک حسین کا 'عہد اکبری میں علوم وفنون اور تہذیب و ثقافت کی صورت حال' مضامین بھی پسند آئے۔

تنویر رضا برکاتی، ڈائرکٹر برکاتی مشن برہانپور، مدھیہ پردیش

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گزارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورت حال، تاریخ، آثار قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورت حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

طلبا کے ذہنی احتساب میں امتحان کا کردار

شاہین پروین

تدریسی عمل میں تعین قدر ناگزیر عمل ہے۔ تعین قدر سے استاد کو طلبہ کی کارکردگی اور تعلیمی کامیابیوں کو جانچنے اور پرکھنے کے مواقع میسر ہوتے ہیں۔ یہ عمل درس و تدریس کے دوران کمرۂ جماعت میں کچھ اور اہم امور بھی انجام دیتے ہیں، مثلاً:

1. کمرۂ جماعت کے مقاصد کو پورا کرنا
2. طلبہ کی آموزشی مشکلات کا اندازہ کرنا
3. آموزشی سرگرمیوں کے لیے طلبہ کو گروپوں میں بانٹنا
4. طلبہ کی پیش رفت کی رپورٹ تیار کرنا

E.Beeby (1997) کے مطابق تعین قدر ان شواہد کی منظم فراہمی اور تشریح ہے جو جانچ کے عمل کا ایک حصہ ہونے کے ناطے عمل کے نقطۂ نظر سے فیصلۂ قدر (Value Judgement) کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

طلبہ کی شرح آموزش و اکتساب کی جانچ کا طریقہ صدیوں سے رائج ہے۔ اساتذہ اپنے تمام تعلیمی نظریات و تصورات کو کمرہ جماعت میں پیمائش کے معتبر وسائل کا استعمال کر کے طلبہ کے ادراک اور اکتساب کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ دوران تدریس طلبہ کے تعلیمی معیار کا جائزہ طلبہ کی مختلف مواقع پر آزمائش اور کسوٹیوں کو لے کر جانچ منعقد کر کے کیا جاتا ہے۔ تعین قدر سے طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں، مہارتوں، دلچسپی اور رویہ کا پتا لگایا جاتا ہے اور طلبہ میں خود اعتمادی بھی بڑھ جاتی ہے طلبہ کے مزاج سے سہل پسندی اور آرام پسندی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ طے کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ طلبہ کی ترقی کس سمت میں، کن مراحل میں اور کہاں تک ہوئی۔ تعین قدر میں سب سے تکلیف دہ پہلو وہ طریقہ کار ہے جس کی وجہ سے طلبہ ذہنی اور جسمانی دباؤ و تناؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ طلبہ کے تعین قدر کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ جانچ کی شکل میں صرف تعلیمی ترقی کا ہی احاطہ کیا جاتا ہے اور طلبہ کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں سے یک لخت روگردانی برتی جاتی ہے۔

کمرہ جماعت میں طلبہ کی تعلیمی صلاحیتوں کی تشخیص و جانچ استاد کا ایک اہم فریضہ ہے ہر استاد کو سبق کی شروعات سے قبل، دوران سبق اور سبق کے اختتام پر طلبہ کے ادراک کو سمجھ بوجھ کر اور معیار کی جانچ کے لیے مخصوص تشخیصی طریقہ کار اپنانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ سیکھنے کی مقدار اور معیار کا علم ہونے کے بعد اساتذہ طلبہ کی تعلیمی رفتار اور معیار کی سطح کا کامیاب اندازہ قائم کر سکتے ہیں۔

استاد طلبہ کے تعلیمی فروغ کے لیے منصوبہ بندی اور حکمت عملیاں وضع کر سکتا ہے۔ اساتذہ کی تدریس اور متعلم کی آموزش دونوں ہی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ امتحان کے ذریعے طالب علم کی حقیقی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیا؟

Herbert ہربرٹ کے مطابق تعلیم کا مقصد صرف علمیت میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ طلبہ میں اعلیٰ جذبات، مستقل ذوق اور اعلیٰ نصب العین پیدا کرنا ہے ان ہی پر انکی سیرت کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ چونکہ امتحان کے ذریعے صرف تعلیمی جز کی جانچ کی جاتی ہے اور باقی اجزاء کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے بلا خوف یہ کہا جا سکتا ہے کہ امتحانات کے ذریعہ حقیقی تعلیم کا اندازہ لگانا صرف

> **کمرہ جماعت میں طلبہ کی تعلیمی صلاحیتوں کی تشخیص و جانچ استاد کا ایک اہم فریضہ ہے ہر استاد کو سبق کی شروعات سے قبل، دوران سبق اور سبق کے اختتام پر طلبہ کے ادراک کو سمجھ بوجھ کر اور معیار کی جانچ کے لیے مخصوص تشخیصی طریقہ کار اپنانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ سیکھنے کی مقدار اور معیار کا علم ہونے کے بعد اساتذہ طلبہ کی تعلیمی رفتار اور معیار کی سطح کا کامیاب اندازہ قائم کر سکتے ہیں۔**

مشکل ہی نہیں بلکہ محال بھی ہے۔

(National Curriculum Framework) NCF کا نظریہ اور امتحان کو آسان کرنے کی تجاویز

قومی درسیاتی خاکہ 2005 نے بڑی ہی باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے تنقید کی ہے کہ ہمارے مدارس میں تعلیم پا رہی نوخیز نسل کو سماجی ضرورتوں کے مطابق نہیں ڈھالنے کی وجہ سے اپنے جذبات پر قابو نہ رکھتے ہوئے گہرے تناؤ اور دباؤ کا شکار ہو رہی ہے دقیانوسی اور روایتی تدریسی طریقہ کار اور میکانکی امتحانی طریقہ کار بچوں میں بیزاری کا سبب بن رہے ہیں اور یہ بھی اعتراض کیا کہ کئی سالوں سے ہمارے مدارس میں درسی کتاب کا استعمال، تدریسی طریقے اور امتحانات وغیرہ بچوں کو صرف رٹانے کے واحد عمل پر گامزن رہے ہیں اور یہ بھی اعتراض کیا کہ بچوں کی ضروریات، خواہشات، رجحانات اور امیدوں سے لاتعلق موضوعات روز مرہ زندگی میں اور سماج کے مستقبل پر اپنا منفی اثر ڈال رہے ہیں۔ اب ان فرسودہ تجاویز کو فوری بدلنے کا وقت آچکا ہے۔ تعلیمی منصوبہ بندی، منصوبہ سبق اور امتحانی طریقہ کار وغیرہ کی از سر نو تشکیل کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے پھر مسلسل جامع قدر پیمائی اسکیم پر زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مدارس کی جانب سے صرف اس بات کو بنیاد بنایا جا رہا ہے کہ جانچ کے نام پر منعقد کیے جانے والے امتحانات سے طلبہ کو اذیت دی جاتی ہے تاکہ ان کے مدارسوں کی ساکھ اچھی بنی رہے۔

مسلسل اور جامع تعین قدر - (CCE)

Continuous Comprehensive Evaluation

مسلسل اور جامع تعین قدر اسکول پر مبنی ایک ایسا اقداری عمل ہے جو طلبہ کی ترقی پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کے نشوونما کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے اس ترقیاتی، احتسابی عمل کے دو مقاصد ہیں۔ اول طلبہ کی مسلسل اصلاح اور دوم شناختی پہلوؤں کی تشخیص اور رویوں کی تبدیلیوں کا مشاہدہ۔ اس اسکیم سے مراد طلبہ کی Growth and Development کا وہ پہلو ہے جو پورے تعلیمی سال کے ٹیچنگ اور لرننگ پر مشتمل ہوتا ہے جسے ایک مسلسل طریقہ تشخیص کی حیثیت حاصل ہوتی ہے دوسری جانب طلبہ کی تعلیمی سرگرمیاں اور غیر تعلیمی سرگرمیاں دونوں پہلوؤں کی نشوونما شامل ہے۔ طلبہ کی نمو اور نشوونما کے احاطے کے لیے سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے CCE کو نافذ کیا جس کا واحد مقصد طلبہ کے تمام ترقیاتی پہلوؤں کا پورے سال تعین کرنا ہے۔ اس عمل میں صرف تعلیمی مضامین کی ہی جانچ کرنا نہیں ہے بلکہ غیر تعلیمی سرگرمیاں مثلاً کھیل کود، آرٹ، موسیقی، رقص، ڈرامہ اور دیگر موضوعات بھی شامل ہیں جن سے طلبہ امتحان لفظ سن کر خوف زدہ نہ ہوں اور خوشی محسوس کریں اور پڑھنے میں ان کی دلچسپی بھی بنی رہے۔

امتحانی اصلاحات مسلسل قدر پیمائی: قانون برائے مفت و لازمی حق تعلیم 2009 کے مطابق بچوں پر امتحان کا بوجھ نہ ہو نہ ہی وہ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہو اس کے لیے جانچ وقفہ وقفہ سے اور مسلسل لی جانی چاہیے کیونکہ امتحان کا لفظ آتے ہی طلبہ کے ذہن میں تناؤ آ جاتا ہے اور جانچ کے نام پر منعقد کیے جانے والے امتحانات بچوں میں اسکول میں سیکھنے کے تئیں موزوں دلچسپیوں کے فروغ کے بجائے خوف و ہراس پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لیے مسلسل جامع جانچ (CCE) کو فروغ دیا گیا ہے تاکہ طلبہ پر کوئی دباؤ نہ ہو۔

ریاستی درسیاتی خاکہ 2011 کے مطابق نصابی امور میں کوئی فرق نہ کیا جائے دونوں یعنی تعلیمی سرگرمیوں اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کو نصابی امور کے طور پر ہی دیکھا جائے اس لیے CCE میں طلبہ کی جسمانی، ذہنی، جذباتی، سماجی ترقی کو مساوی اہمیت دی گئی۔

تعلیمی منصوبہ بندی، منصوبہ سبق اور امتحانی طریقہ کار وغیرہ کی از سر نو تشکیل کرنے کی اشد ضرورت ہے اس لیے پھر مسلسل جامع قدر پیمائی اسکیم پر زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مدارس کی جانب سے صرف اس بات کو بنیاد بنایا جا رہا ہے کہ جانچ کے نام پر منعقد کیے جانے والے امتحانات سے طلبہ کو اذیت دی جاتی ہے تاکہ ان کے مدارسوں کی ساکھ اچھی بنی رہے۔

جانچ اور معلم کا کردار

کمرہ جماعت میں طلبہ کی تعلیمی صلاحیتوں کی تشخیص و جانچ استاد کا ایک اہم فریضہ ہوتا ہے۔ سیکھنے کی مقدار اور معیار کے بعد اساتذہ طلبہ کی تعلیمی رفتار اور معیار کی سطح کا کامیاب اندازہ قائم کر سکتے ہیں اکتساب کی رفتار معیار اور مقدار سے باخبر ہو کر استاد طلبہ کی بہبود کے لیے جامع منصوبہ اور مناسب حکمت عملیاں وضع کر سکتا ہے۔ دوران تدریس اساتذہ کی جانب سے انجام دی جانے والی تشخیص نہ صرف طلبہ کے سیکھنے کی سمت و رفتار متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے بلکہ طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔

کمرہ جماعت میں طلبہ کو پڑھتے ہوئے مواد کی تفہیم و تشریح کے لیے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں تاکہ ہر طالب علم کی شرح اکتساب کا اندازہ قائم کیا جا سکے۔ طلبہ جس مضمون و موضوع میں الجھن اور مشکل کا شکار ہوں انھیں دور کرنے میں استاد ایک رہبر اور رہنما کا کردار انجام دیں۔

کمرہ جماعت میں انجام پانے والے اکتساب کی منظم جانچ اور تعین قدر میں درج ذیل امور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

1. آموزش کے دوران کہاں دقتیں محسوس ہو رہی ہیں اور بچہ کہاں پیچھے ہو رہا ہے اور کہاں سے رکاوٹ ہو رہی ہے معلم مشاہدہ کے ذریعے شناخت کرتے ہوئے مناسب مدد فراہم کرتا ہے۔
2. تعلیمی قدر پیمائی کے عمل سے استاد کو اپنی تدریس کی سمت طے کرنے میں مدد ملتی ہے استاد کو یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ کس مقصد کے حصول کے لیے کونسا طریقہ تدریس اختیار کرنا چاہیے۔
3. تعین قدر کے عمل کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شعبہ میں ترقی کم ہوئی ہے۔ اس ضمن میں انھیں

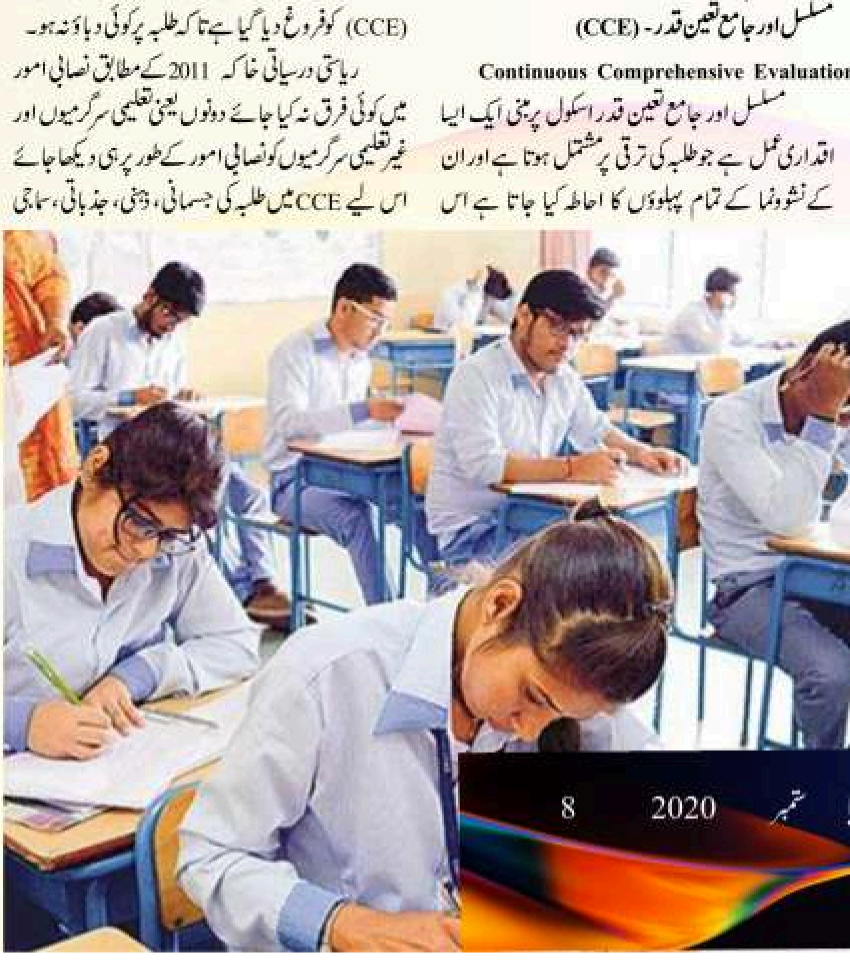

اپنے مطالعے کی سمت کا تعین کرنے میں مدد ہوتی ہے۔

4. تعین قدر کے عمل کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی شخصیت کی نشوونما تینوں زمروں میں متوازن ہو رہی ہے یا نہیں اور اس کی روشنی میں مناسب تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔

5. تعین قدر کے ذریعے والدین طلبہ اور اسکول انتظامیہ کو بچوں کی تعلیمی ترقی سے واقف کیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کی ترقی کے لیے وہ مستقل لائحہ عمل ترتیب دے سکیں۔

6. تعین قدر کی وجہ سے استاد میں تشخیصی نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ایک مخصوص ڈھنگ سے غور و فکر کرنے کا عادی بنتا جاتا ہے۔

7. تعین قدر کا عمل طلبہ کو ان کی ادراکی سطح اور مہارتوں کو پیش کرنے کے مناسب مواقع فراہم کرنے کے ساتھ بہتر تعلیمی مظاہرہ کرنے میں ایک محرک کا کام انجام دیتا ہے۔

تعین قدر کے وسائل اور تکنیک:

طلبہ کے علم اور کامیابیوں کی جانچ کے لیے تعین قدر کے مختلف پیمانے اور وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے جن سے صرف درس و تدریس اور اکتساب کے نتائج کی پیمائش ہی ممکن ہے۔ کمرہ جماعت میں جانچ کے لیے عام طور پر مندرجہ ذیل وسائل سے کام لیا جاتا ہے۔

مشاہدہ Observation

عملی کام/تجربہ Practical/Experiment

سرگرمیاں Activities

منصوبہ Project

تفویضات، Assignment Classwork، اور بھی کچھ دیگر وسائل کا استعمال کیا جاتا ہے۔

خود تعین قدر Self Assessment

سوالنامہ Questionnaire

طلبہ کا پورٹ فولیو Student's Portfolio

مصاحبہ/انٹرویو Interview

معاشرہ پیمائی کی تکنیک Sociometric Technique

نامزد کرنے کی تکنیک Nominating Technique

ہم جولیوں سے اور موازناتی قدر پیمائی Peer and Comparative Evaluation (اس کے ذریعے ہم عمر طلبہ کے کاموں کو طے شدہ معیارات کی مدد سے جانچا جاتا ہے)

آزمائش Tests (آزمائش میں مختلف اقسام کے سوالات معروضی، مختصر اور طویل جوابات اور آزمائش اور open book test کے تحت طلبہ میں تفہیم اور اطلاق کے مقاصد پر مبنی سوالات ہوتے ہیں۔)

ان تمام وسائل کو معیاری پیمانہ تصور کیا گیا ہے طلبہ کی ہمہ جہت ترقی کی پیمائش کے لیے تاہم ابھی تک کوئی ایسا واحد طریق کار وجود میں نہیں آیا جسے مستند اور معتبر کہا جاسکے۔ ماہر تعلیم و نفسیات Wiggins کے مطابق "Every method has its strength an weakness and its place" اس قول کی روشنی میں استاد چاہے کوئی بھی آزمائش کا طریقہ کار وضع کرے وہ قابل اعتماد ہونا چاہیے۔

طلبہ میں امتحان کے تئیں مثبت رویوں کو فروغ کے طریقے اور امتحان کے خوف کو دور کرنا

تعین قدر کے عمل میں مندرجہ ذیل طریقہ کار پر عمل پیرائی کے ذریعے طلبہ کی، تفہیم، ادراک، مہارتیں، دلچسپی، رجحان اور معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا اور طلبہ میں تعلیم کے تئیں مثبت رویوں کو فروغ دینے کے طریقے اور امتحان کے خوف کو دور کیا جاسکتا ہے۔ عموماً طلبہ میں امتحان کے تئیں منفی رویہ پایا جاتا ہے اسکا خوف طلبہ میں کم عمری سے ہی پیدا ہوجاتا ہے، اسے دور کرنے کے لیے:

(1) ہر گھنٹہ کے اختتام پر بہتر طریقے سے تیار کردہ سوالات کے ذریعے طلبہ کی اکتسابی سطح اور معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(2) ہر سبق و یونٹ کے اختتام پر زبانی، تحریری، عملی و مظاہراتی امتحانات کے انعقاد سے بھی تعین قدر کا کام بخوبی انجام دیا جاسکتا ہے۔

(3) طلبہ کی کمزوریوں کی شناخت کی جائے اور ان کے ازالے کے لیے منظم کوشش کی جائے، کمزور سے کمزور طلبہ کی بھی حوصلہ افزائی کریں۔

(4) طلبہ کے بنیادی تصورات کی تدریس پر خصوصی توجہ مرکوز کرنی چاہیے اگر ان کے بنیادی تصورات اچھے رہتے ہے تو وہ کسی بھی امتحان سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔

(5) طلبہ کو ان کے تعلیمی عمل ردعمل وغیرہ کو ضبط تحریر میں لانے پر مائل کیا جائے تاکہ طلبہ کو تحریری مواد کو تخلیقی انداز میں پیش کرنے کی دعوت دی جاسکے۔

(6) تعین قدر کے لیے اساتذہ کا طلبہ کے تئیں ہمدردانہ، جمہوری اور مشفقانہ رویہ طلبہ کا خوف کو دور کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے اور والدین کو بھی چاہئے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ معاون و مددگار رہیں۔

(7) اساتذہ تعین قدر کے لیے معتبر وسائل کا استعمال اور ہر امتحان اور جانچ کے بعد طلبہ کی رہبری کریں ان کی خوبیوں اور خامیوں سے آگاہ کروائیں۔ اساتذہ کی طرف سے فراہم کردہ تجزیہ طلبہ کی تعلیمی صلاحیتوں کو استحکام فراہم کرتے ہیں، طلبہ کی کمزوریاں اور خوبیاں بدلنے لگتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں ماہر تعلیم Wiggins کے مطابق ''جو طلبہ اپنی کارکردگی اور ترقی پر نظر رکھتے اور کام کے معیار پر نگاہ رکھنا سیکھ لیتے ہیں ان کے کام میں بہتری پیدا ہونے لگتی ہیں۔''

(8) اساتذہ طلبہ کی جانچ کو جب بھی عملی جامہ پہناتے ہے اس سے قبل وہ Recording & Reporting سسٹم کو اچھی طرح سمجھ لیں کیونکہ جانچ کرنے کے بعد طلبہ کو Rank بھی دیا جاتا ہے۔ پہلے عددی شکل میں مارکس ملتے تھے اسکے بعد ان کو Rank دیا جاتا تھا اور Report Card پر Pass یا فیل (Fail) لفظ لکھ دیا جاتا تھا جس سے طلبہ ناامیدی اور احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتے تھے، جسے NCERT نے 2006 میں غلط قرار دیا اور یہ مشورہ دیا کہ طلبہ کے Report Card پر Phrases جیسے Unsatisfactory، ناقابل اطمینان/ Satisfactory، قابل اطمینان ٹھیک ٹھیک ہے لیکن

اورمحنت کی ضرورت ہےوغیرہ ریمارکس لکھے جائیں۔

(9) رپورٹ کارڈ دیکھ کرطلبہ کوکوئی ذہنی پریشانی نہ ہواور انھیں انکی صلاحیتوں کا بھی پتہ لگ جائے۔

(10) قومی تعلیمی کونسل (1986) میں گریڈسسٹم کا عمل میں لایا گیا جس کے ذریعہ طلبہ کا تعین قدر کرنا اور بھی بہتر ہوگیا کیونکہ:

گریڈنگ سسٹم ایک ایسا طریقہ ہے جوطلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مکمل طور پر پوائنٹس پر مبنی ہوتا ہے۔ گریڈنگ سسٹم کسی طرح کی بھی دانشورانہ قیاس آرائی میں ملوث ہونے کا موقع نہیں دیتا ہے یہ طریقہ دنیا بھر کے بہت سے اسکولوں میں وسیع پیمانے پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور اسے مضبوط اور قابل عمل طریقہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گریڈنگ سسٹم میں (A,B,C,D) کے ذریعے گریڈ دیا جاتا ہے جو پوری دنیا میں رائج ہے۔ گریڈ کی وجہ سے طلبہ کے اوپر سے امتحان کا تناؤ کم ہوتا ہےاور بڑی آسانی سے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی بھی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ گریڈ کی وجہ سے طلبہ میں رزلٹ کو لے کرکوئی خوف بھی نہیں ہوتا رزلٹ کو لے کر۔

(11) طلبہ کوتعین قدر کے نظام اوراس کی کارکردگی سے آگاہ کریں تاکہ وہ ذہنی طور پر امتحان دینے کے لیے تیار رہیں۔

(12) طلبہ کی کارکردگی کو اگر گریڈ کی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے تو ناکامیاب ہونے والے طلبا کو ظاہر نہیں کیا جاتا یعنی اس طریقے سے کچھ خاص اثرات والے رزلٹ جیسے پاس یا فیل ظاہر نہیں ہوتے۔

(13) گریڈسسٹم اپنے ہم جماعت کے Relative مقام کا تعین کرتا ہے اس میں کس نے سب سے زیادہ اور کس نے سب سے کم نمبرات حاصل کیے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

امتحانی نظام میں اصلاحات

نظام تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے سب سے پہلے نظام امتحانات میں اصلاحات کی ضرورت ہے۔ امتحانی اصلاحات کی اہمیت کا اندازہ رادھا کرشنن کمیٹی (1948) کی رپورٹ کے اس ریمارک سے لگایا جا سکتا ہے ''اگر ہمیں تعلیم میں کسی ایک واحد اصلاح کی تجویز رکھنی ہوتو وہ امتحانات کی ہونی چاہیے۔''

امتحانات کا مسئلہ تعلیمی نظام میں نہایت اہم مسئلہ ہے موجودہ امتحانی نظام کے نقائص اور ان سے ہونے والے نتائج سے ہم بخوبی واقف ہیں اگر ہم امتحانات سے جڑے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو

> **گریڈنگ سسٹم ایک ایسا طریقہ ہے جو طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مکمل طور پر پوائنٹس پر مبنی ہوتا ہے۔ گریڈنگ سسٹم کسی طرح کی بھی دانشورانہ قیاس آرائی میں ملوث ہونے کا موقع نہیں دیتا ہے یہ طریقہ دنیا بھر کے بہت سے اسکولوں میں وسیع پیمانے پر استعمال میں لایا جاتا ہے اور اسے مضبوط اور قابل عمل طریقہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔**

یقیناً تعلیم کی کچھ اور ہی شکل ہمارے سامنے ہوگی اور طلبہ کو امتحان کا ڈروخوف بھی نہیں ہوگا۔

پروگرام برائے عمل (POA-1992) نے کچھ مخصوص قلیل مدتی وطویل مدتی اقدامات کی تجاویز پیش کیں تاکہ امتحانی اصلاحات روبہ عمل لائی جاسکیں۔

- پرائمری سطح پر عدم روک تھام پالیسی (Non Detention Policy) اپنائی جائے۔
- تعین قدر کا اہم مقصد تشخیصی نوعیت کا ہونا چاہیے تاکہ طلبہ کو معالجی تدریس (Remedial Teaching) فراہم کی جائے۔
- مسلسل جامع تعین قدر ایک لچکدار اسکیم ہونی چاہیے تاکہ تعین قدر کے عمل کو تدریس واکتساب کا ایک لازمی حصہ بنایا جائے جو طلبہ کی مخصوص اور مختلف ضروریات کے لیے موزوں ہو۔
- عام طور پر مختلف مقاصد کے لیے مختلف اقسام کے امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں۔ تعین قدر میں سوالات کی نوعیت اور طریقہ بھی مختلف ہوتا ہے اس لیے اساتذہ کو احتیاط سے کام لینا چاہیے۔
- جب طلبہ کے اجتماعی اور انفرادی اکتسابی تفاوت کوملحوظ رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تب امتحان بامعنی اور نتائج شاندار اور روشن ہوتے ہیں۔ طلبہ اپنے معیار اور دلچسپی کے مطابق ہونے والے امتحانوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ آج کے اس جدید دور میں بھی معیار اور مسابقت کے نام پر معصوم طلبہ سے بدسلوکی کی جارہی ہے والدین اور اساتذہ کی جانب سے بہترین کارکردگی کے مظاہرے کی امید کی جاتی ہے جس کی بناء پر طلبہ دباؤ کا شکار ہوجاتے ہیں اور وہ تشویش اور تناؤ میں رہتے ہیں۔
- طلبہ امتحان میں ناکامی پر خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کررہے ہیں۔ بعض دفعہ امکانی ناکامی کے خوف سے بھی اپنی قیمتی جانیں تباہ کر رہے اور اپنے بچپن کو بھی گنوارہے ہیں اور کھیل کود سے بھی دور ہوچکے ہیں۔
- والدین اولاد کے بہتر مستقبل کی خواہش میں اپنے بچوں کی صلاحیت اور استعداد سے زیادہ ان پر دباؤ ہرگز نہ ڈالیں۔
- درس وتدریس بھی شیشہ سازی کی طرح نازک کام ہے جس طرح شیشہ گر کر یا ذرا سی غفلت سے بھی چور چور ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح اساتذہ کی لاپرواہی سے کئی مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔
- گریڈنگ اور نمبرات دینے کے عمل میں شفافیت (Transparency) ہونی چاہیے۔

اختتام: تعین قدر کے اصول وضوابط وضع کرنے والے تعلیمی نظام میں سدھار لانے کی اشد ضرورت ہے تاکہ کوئی طالب علم ذہنی طور پر پریشان نہ ہو اور امتحان سے خوف زدہ بھی نہ ہو بلکہ امتحان کا خوش دلی سے سامنا کریں اس کے لیے NCERT نے جو اہم تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کی عمل پیروی کریں۔ طلبہ کی فکری تربیت بھی ہوگی اور ان میں امتحان کا خوف بھی نہیں رہے گا۔

حوالہ جات

1. این سی آر ٹی (1975) کری کلم فار دی 10 ایر اسکول۔اے فریم ورک (Curriculum for the 10 Year School- A Frame Work) این سی آر ٹی، نئی دہلی
2. شری واستو کے ایس (1989) کامپر ہینسیو ایجوکیشن ان اسکولز (Comprehensive Education in School) این سی آر ٹی، نئی دہلی، بھارت
3. Ebel Robert، (1996)، Measuring Educational Acheivement، Pentice Hall of New Delhi
4. ڈاکٹر شاہین پروین، (2013)، تعلیمی قدر پیائش اور شماریات (Educational Evaluation and Statistics)، ڈی۔ ایس۔ آر پبلیکیشن، اورنگ آباد
5. کچھ تجاویز: مسودہ قومی تعلیمی پالیسی (2016)، وزرات برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند
6. رینو گپتا (2017)، میزرمینٹ، اویلیوایشن اینڈ اسسمنٹ فار لرننگ (Measurement Evaluation and Assessment for Learning)، شپرہ پبلیکیشن، نئی دہلی
7. ڈاکٹر فاروق طاہر، آرٹیکل (2018)، جانچ و پرکھ سے اذیت نہیں طلبہ کی صلاحیتوں کوفروغ دیں۔

■

Dr. Shaheen Parveen
Asst. Prof. Maulana Azad Urdu University
College of Teacher Education
DRP Education Campus
Mahmood Pura, Rauza Bagh
Aurangabad (MS)

محمد توقیر عالم

جدیدیت
آغاز، عروج و زوال

جدیدیت ادب کی ایک مسلمہ اصطلاح ہے۔ لیکن اس کے مضمرات، نقطۂ آغاز، صحیح مفہوم، سیاق و سباق اور نتائج کے متعلق اختلافات ہیں۔ جدیدیت کے سلسلے میں سرسری گفتگو بھی ملتی ہے اور گہرا فلسفہ بھی۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جدید اضافی اصطلاح ہے اور قدیم کے مقابل ہر شے جدید ہے اور ہر جدید وقت گزرنے کے ساتھ قدیم ہوجاتا ہے۔ زمانی حد بندی کے ضمن میں بھی اختلافات ہیں۔ ایک نظریہ کے مطابق جدید شاعری کا نقطۂ آغاز انیسویں صدی عیسوی ہے۔ اس دور میں افکار اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے نیا موڑ آیا لیکن یہ جدتیں اس جدیدیت سے مختلف تھیں۔ حالی وغیرہ کا دور اپنے دور ماسبق کے بالمقابل جدتوں کا دور تھا لیکن یہ مواد کی اہمیت کا دور تھا اور ادب میں مقصد کی بالادستی کا دور تھا۔

جدیدیت کی ابتدا کے سلسلے میں التباسات ہیں اور اس کی تردید کرنے والے زیادہ تر التباسات کے شکار ہیں۔ بعض جدیدیت کو حالی سے شروع ہونے والے جدید دور سے جوڑتے ہیں، بعض ترقی پسند تحریک کو بھی جدید کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک ہر نئی تخلیق نئی اور ترقی پسند دونوں تھی۔ اس دھوکے میں مبتلا وہ بھی ہوئے جو ترقی پسند تھے۔ رشید احمد صدیقی نے جو ترقی پسندی پر اعتراضات کیے اور احتشام صاحب نے جو جواب دیا اس سے اس سلسلے میں پائے جانے والے التباسات کا علم ہوا اور اس وقت کے اعتبار سے جدید چیزوں میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کا فرق واضح ہوا۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ترقی پسندی کے دور میں جو غیر ترقی پسندی تھی وہی جدیدیت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مطابق حلقۂ ارباب ذوق جدیدیت کی وراثت ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو جدیدیت ترقی پسندی کا ردعمل ہے۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔ ہر تحریک کا ردعمل موافقت اور مخالفت دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی طرح سرسیّد کی تحریک کے دور میں بھی ردعمل ہوا تھا اور سرسیّد اور حالی کے مقابلے میں قدیم اندازِ فکر اور اسلوب بیان کو ترجیح دی جاتی رہی۔ ترقی پسندی کے مقابلے میں حلقۂ ارباب ذوق کا وجود ہوا اور ادب برائے زندگی کے مقابلے میں ادب برائے ادب کا نعرہ لگایا گیا۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ جدیدیت ان سب سے علیحدہ ادبی میلان یا تحریک ہے۔ یہ بھی متنازعہ فیہ ہے کہ جدیدیت میلان ہے یا تحریک۔

جدیدیت صرف اردو میں نہیں بلکہ ہندوستان اور دنیا کی بیسیوں زبانوں میں پہلے یا بعد میں بحیثیت میلان سامنے آچکی ہے۔ مغرب میں جدیدیت کا میلان پہلے پیدا ہوا ہے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب نے جدیدیت کے عوامل و محرکات پیدا کیے۔ مشرق میں صنعتی انقلاب دیر سے آیا اس لیے جدیدیت کے آثار دیر سے رونما ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور یورپ میں جدیدیت کی عمر ایک جگہ چار سو سال اور ایک جگہ ساڑھے چار سو سال بتاتے ہیں اور ہندوستان میں اسے ڈیڑھ سو سال اور دوسری جگہ پونے دو سو سال کی پیداوار بتاتے ہیں۔ سرور صاحب ہندوستان میں جدیدیت کو نوعمر قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستانی ذہن ابھی پورے طور پر جدید نہیں ہوسکا۔ زمانے کے اعتبار سے سرور صاحب کا اندازہ قطعیت سے دور ہے۔ جدیدیت کی عمر نہ یورپ میں اتنی زیادہ ہے اور نہ ہندوستان میں۔

جدیدیت کا رشتہ بہت دور رونما ہونے والے صنعتی انقلاب سے جوڑا جاسکتا ہے لیکن دراصل اس کا نقطۂ آغاز صنعتی زندگی کا وہ نقطۂ عروج ہے جب قدروں اور تہذیبوں کا زوال شروع ہوگیا۔ تہذیبوں کا یہ زوال دوسری جنگ عظیم کے بعد آیا لیکن ہندوستان میں ملک کی آزادی اور تقسیم سے شروع ہوا۔

جدیدیت ایک طرز فکر ہے، صرف نئے زمانے میں پیدا ہونے اور لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عہد حاضر کے ادیب و شاعر طرز فکر کے اعتبار سے جدیدیت پسند یا روایت پسند ہیں۔ عصری حسیت یا معاصریت بھی جدیدیت نہیں ہے۔ ہر چیز اپنے زمانے میں جدید ہوتی ہے، یہ صحیح ہے لیکن ایسی ہر جدید چیز کو جدیدیت کا نمونہ نہیں کہہ سکتے۔ پھر بھی ن۔م۔ راشد نے بھی حالی اور آزاد کے زمانے کو اپنے دور کی جدیدیت کہہ کر وہی غلطی کی ہے جو جدیدیت کے مخالفین کرتے ہیں۔

جدیدیت کی پہچان کے لیے چند پیمانے بنائے گئے ہیں جو مختصر طور پر حسب ذیل ہیں:

(الف) روایتوں سے انحراف
(ب) ناوابستگی
(ج) اقدار، مثالیت اور اصول وضوابط سے انکار۔
(د) معروضیت، راست اظہار، بیان کی وضاحت وغیرہ کو رد کرنا۔
(ہ) نظم وضبط اور اداروں سے بےتعلقی۔
(و) فرد کا احساس، تنہائی، حقیقت کی چٹان سے تصورات کا ٹکرانا، سماج کی چیرہ دستی اور روزِ حشر سے پہلے نفسی نفسی کے عالم کا احساس۔
(ز) اظہار کی سطح پر ابہام۔
(ح) اشارات کی نجی ترسیل۔
(ط) لفظوں کا تخلیقی استعمال۔
(ے) نئے الفاظ کی تراش۔
(ک) قدیم اظہارات سے گریز۔
(ل) بندشوں، محاوروں اور مروجہ اوزان وبحور سے وحشت۔
(م) فنکار کی انفرادیت کو ترجیح اور اجتماعیت کا مردود ہونا۔

ان تمام مذکورہ خصوصیات کے باوجود جدیدیت کو کسی ایک پہچان کی بنیاد پر اسی کی حد تک محدود کر دینا ممکن نہیں۔ لفظ جدیدیت کا استعمال بھی موضوع بحث بنا ہے۔ انگریزی اصطلاح Modernity کا ترجمہ اردو میں جدیدیت کیا گیا ہے۔ اس ترجمے کو اردو کے اہل قلم کی سند بھی حاصل ہے۔ مقالہ نگار کی نظر میں جدیدیت Modernism کا ترجمہ ہے اور اس کی دلیلیں ہیں۔ اس کے باوجود سرور صاحب نے بھی جو Modernity کا ترجمہ جدیدیت سمجھتے ہیں، یہ اعتراف کیا ہے کہ بعض حلقوں میں انگریزی کے دونوں الفاظ کو مترادف سمجھا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو مقالہ نگار بھی جدیدیت کو Modernity کا مترادف تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرتا۔

جدیدیت ایک طرزِ فکر ہے، صرف نئے زمانے میں پیدا ہونے اور لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ عہد حاضر کے ادیب و شاعر طرزِ فکر کے اعتبار سے جدیدیت پسند یا روایت پسند ہیں۔ عصری حسیت یا معاصریت بھی جدیدیت نہیں ہے۔ ہر چیز اپنے زمانے میں جدید ہوتی ہے، یہ صحیح ہے لیکن ایسی ہر جدید چیز کو جدیدیت کا نمونہ نہیں کہہ سکتے۔ پھر بھی ن۔م۔ راشد نے بھی حالی اور آزاد کے زمانے کو اپنے دور کی جدیدیت کہہ کر وہی غلطی کی ہے جو جدیدیت کے مخالفین کرتے ہیں۔

موجودہ صورت حال سے بے اطمینانی، روایت کے فرسودہ حصے سے انحراف اور افکار کی جدت ہر دور میں ممکن ہے لیکن جدیدیت خالصتاً عہد حاضر کی پیداوار ہے اور انسانی تاریخ کے جبر سے پیدا ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آگے چل کر خود ایک روایت بن جائے۔ عہد حاضر کی زندگی کے مختلف عوامل وعناصر جدیدیت کے ذمے دار ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور مشینوں کی حکومت سے انسان گھٹ گیا ہے، احساسات مردہ ہو گئے ہیں، ہر فرد اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے اور معاشرہ کا شیرازہ اندر سے بکھرا بکھرا ہے۔ یہ صورت حال ساری دنیا میں بیک وقت یکساں نہیں ہے یورپ اور ہندوستان کا فرق اپنی جگہ پر ہے، شہروں اور دیہاتوں کا فرق بھی اپنی جگہ پر ہے۔ اسی طرح بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کا فرق ہے۔ لیکن سائنسی ترقی سے فاصلے سمٹ رہے ہیں، ایک ملک کے مسائل عالمی مسائل بنتے جا رہے ہیں۔ نیوکلیائی ہتھیاروں کا خطرہ ساری دنیا کو یکساں ہے اور اس میں شہر اور دیہات میں کوئی فرق نہیں۔ مواصلاتی نظام اور خبر ونشر کے وسائل ساری دنیا کو ایک دوسرے سے قریب لا رہے ہیں۔ اب کوئی بھی بات ایک جگہ ہو تو وہیں تک محدود نہیں رہتی، ہر جگہ پھیل جاتی ہے۔ جدیدیت بھی پہلے مغربی ادبیات میں منظرِ عام پر آئی اور پھر دنیا کی ساری زبانوں میں پھیل گئی۔ اس کے رجحانات مشرق ومغرب کی حدوں میں بند نہیں ہیں۔ جدیدیت کے پس پشت دانشوروں اور فلسفیوں کے اقوال وافکار ہیں۔ دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے سے لے کر شعر وادب کی تفہیم اور زبان وبیان کے مسائل تک فلسفیوں اور دانشوروں کی حکومت ہے۔

ان موضوعات پر جو افکار عام ہوئے، ان کا اثر شعر وادب کے جدید رجحان پر پڑا۔ اس سلسلے میں وہائٹ ہیڈ، ہیڈگر، بری کلے، برگساں اور سارترے وغیرہ کے فلسفے جدیدیت کی فلسفیانہ بنیاد بن گئے ہیں۔

اردو ادب میں جدیدیت تقسیمِ ملک کے بعد شروع ہوئی۔ اس سیاسی واقعے سے بہت سے انسانی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی مسائل پیدا ہوئے۔ برِصغیر میں کئی جنگیں لڑی گئیں اور ملک میں صنعتی ترقی کا جال بچھایا گیا۔ ان حالات نے ملک کو ترقی پذیر ممالک کی صف سے نکال کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لانے کی دوڑ میں شامل کر دیا ہے۔

ایک ادبی یا ذہنی رویے کی حیثیت سے جدیدیت کی جانب جو لپک ابتدائی برسوں میں دکھائی دی تھی اب باقی نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ جدیدیت کا زوال ہو، پھر بھی صنعتی زندگی کی انسانیت کش صورتِ حال ہمارے ملک میں سنگین تر ہوتی جا رہی ہے۔ مادی ترقی کی چمک دمک سے آدمی ہوس کا پتلا بن گیا ہے۔ مادی خوشحالی کے لیے جائز اور ناجائز ہر ممکن ذریعے کا استعمال ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ قدروں کا فقدان اور اخلاقی دیوالیہ پن، تاجرانہ بددیانتی، چور بازاری، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، دفتر شاہی، بدکرداری، اہل سیاست کی جنگ زرگری، فرقہ واریت، لسانی اور مذہبی تنگ نظری، اقتصادی نابرابری، کشت وخون، انتظامیہ کی ناانصافی اور لاقانونیت اس دور کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی خصوصیات ہیں۔ ان کے علاوہ جھوٹ، ریاکاری، نمود ونمائش، ظاہر و باطن کا تضاد، نفرت و عداوت، سازشی ذہنوں کی فساد انگیزیاں، عقائد ونظریات سے محرومی، تربیت یافتہ مذہبی زندگی کا فقدان اور اعتدال وتوازن میں کمی، وہ حالات ہیں جو انسانی معاشرے کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ایک ادبی یا ذہنی رویے کی حیثیت سے جدیدیت کی جانب جو لپک ابتدائی برسوں میں دکھائی دی تھی اب باقی نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ جدیدیت کا زوال ہو. پھر بھی صنعتی زندگی کی انسانیت کش صورت حال ہمارے ملک میں سنگین تر ہوتی جارہی ہے۔مادی ترقی کی چمک دمک سے آدمی ہوس کا پتلا بن گیا ہے۔ مادی خوشحالی کے لیے جائز اورناجائز ہرممکن ذریعے کا استعمال ہوتا ہے۔

اصلاح کی چند ناکام اور کمزور کوششوں کے باوجود ہر فرد اپنی اچھی یا بری زندگی انفرادی طور پر گزار رہا ہے۔ جدیدیت شعروادب کی سطح پر مختلف رنگوں اور رویوں سے عبارت ہے۔ ان رنگوں اور رویوں میں عصری اور مکانی اور ابدی و آفاقی دونوں طرح کے جوہر ہیں۔ مخصوص معاصر ذہنی اور جذباتی ماحول سے بھی جدیدیت کا تعلق ہے اور انسانی کرب اور ذات و کائنات کے مسائل سے متعلق فکر کی لہر بھی جدیدیت میں نمودار ہوتی ہے۔

انسانی کرب اور ذات و کائنات کے مسائل مختلف ادوار کی شاعری میں جلوہ گر ہوئے ہیں لیکن جدیدیت کے دور میں سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز جداگانہ ہے کیوں کہ بیسویں صدی کے مسائل جن سے بیسویں صدی کے بہت سے فلسفے وجود میں آئے اور جنھوں نے معاصر شعروادب کو متاثر کیا، قطعی مختلف ہیں۔

جدیدیت کوئی دستور العمل فراہم نہیں کرتی۔ فکری سطح پر اس کا منظرنامہ وسیع و بسیط ہے جس میں متضاد افکار اور عقائد اور ذہنی و جذباتی رویوں کے لیے یکساں گنجائش ہے۔ فنی سطح پر نئی شعری جمالیات کثیر الجہت ہے اور اظہار و بیان کی مختلف ہیئتیں بیک وقت اس سے مربوط ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور جدیدیت کو سائنسی عقلیت اور جمہوریت کے فروغ کی وجہ سے فرد کی آزادی اور فرد و سماج کے ایک واضح رشتے کے عرفان کا سلسلہ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر شمیم حنفی اور پروفیسر سرور کی رایوں کے برعکس ہر عہد میں جدیدیت کے سراغ پائے جاتے ہیں۔ ان کے مطابق جدیدیت ہمعصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہے اور یہ ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور ہر عہد میں حقیقی زندگی گزارنے والے لوگوں نے اس عمل میں حصہ لیا۔ بہر طور وحید اختر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہر عہد کی جدیدیت کے عناصر مختلف ہوتے ہیں اور غالب کے عہد کی جدیدیت ہمارے عہد کی جدیدیت سے الگ ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر جو ادب پیدا ہوا ہے وہ معاصر ادب ہے اور معاصر ادب کی تعیینِ قدر تحفظات اور تعصبات کی بنا پر دشوار ہے۔

جدید شاعری میں کارفرما داخلیت پر ڈاکٹر وزیر آغا نے زور دیا ہے۔ شاعری فنکار کی داخلی دنیا اور خارجی دنیا کے تصادم اور تعامل سے وجود میں آتی ہے۔ ترقی پسندی کے بالمقابل غزل کی تہہ داری اور اشاریت نے جدیدیت کے دور میں فروغ و ارتقاء کی منزلیں کچھ زیادہ ہی طے کی ہیں۔ جدیدیت کے زیر اثر اردو نظموں میں بھی اشاریت پیدا ہو گئی جس سے مفہوم کے ابلاغ میں رخنے پڑے۔

راست اظہار کا اسلوب جدید شاعری کے منافی سمجھا گیا۔ جدید شاعری میں مفہوم کی جدت اور انفرادیت کے باوجود اشکال اور الجھاؤ ہے۔ نئی غزل میں بانی اور ظفر اقبال سے محمد علوی اور احمد ہمیش تک انفرادیتوں کے ہجوم میں یکسانیت دیکھی جا سکتی ہے۔ نظموں میں ن۔م۔ راشد اور میراجی سے عمیق حنفی، بلراج کومل اور مخمور سعیدی تک اردو نظموں کا جدید تخلیقی رنگ تقریباً یکساں جھلکتا ہے۔

لیکن اس محاکے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سارے شعرا ایک دوسرے کا مثنیٰ ہیں۔ ان سب میں کہیں کہیں اور الگ الگ انفرادیتیں نمایاں ہوتی ہیں لیکن بہت سی باتیں سب میں مشترک ہیں۔ ان مشترک باتوں کو مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے:۔

(الف) جدید تر شاعری میں معاشرہ معدوم ہے اور فرد نمایاں۔

(ب) فنکار کا ذاتی کرب و نشاط یا محرومیاں اور الجھنیں یا مسرتیں، حسرتیں، سکھ اور دکھ، دیومالائی تناظر میں یا نئے اور نجی حوالوں کے ساتھ ملتے ہیں۔

(ج) غزل ہو یا نظم وضاحت کی جگہ رمزیت ہے۔

(د) غزل کی اشاریت کچھ اور بڑھ گئی ہے اور اس کا کیف و کم کلاسیکی دور سے بھی کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

جدیدیت کے زیر اثر غزل نے ترقی پسندی کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ لیکن جہاں جدتوں سے تقلید پیدا ہوئی ہے اور نجی حوالوں نے فیشن کی صورت اختیار کی ہے، غزل میں بھی انحطاط پیدا ہوا ہے۔ غزل کے اشعار میں بھی لاقدریت، بے کیفی یا سطحی جدت کے عناصر ملتے ہیں۔

جدید غزل میں لفظیات کا ایسا سرمایہ داخل کیا گیا ہے جو بالکل نیا ہے لیکن اس کا ایک حصہ کوئی قابلِ قدر اضافہ قرار نہیں پاتا۔ جدید شاعری میں افراط و تفریط کی مثالیں پائی جاتی ہیں اور جدیدیت میں سب کچھ خوشنما نہیں ہے۔ جدید شاعری نے بعض نئے مفاہیم کو اردو میں روشناس کرایا۔ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فنکار کی انفرادیت کو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

جدید شاعری میں علامتوں نے اپنی جگہ اس طرح بنائی ہے کہ اس کے دو رُخ سامنے آتے ہیں۔

(الف) تخلیقی سطح پر پہلی بار استعمال اور

(ب) تقلید کے طور پر انھیں دہراتے رہنے کا عمل

بیشتر جدید شعرا تقلید کے شکار ہیں لیکن بعض وہ بھی ہیں جو اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والوں میں ہیں۔ جدید شاعری نے شعری لفظیات میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ان لفظیات میں نئے پیکر، نئے استعارے اور نئے نئے الفاظ اور ان

کے تلازمے ہیں۔ ان الفاظ میں یونانی اور ہندوستانی دیومالا سے استفادہ کرنے کا پہلو بھی موجود ہے۔

جدید شاعری میں لفظیات کے اعتبار سے نظم کا دائرہ وسیع تر ہے لیکن غزلوں میں بھی وہ الفاظ داخل ہو گئے ہیں جو غزل کی روایات کی نرم و نازک اور لطیف فضا میں اجنبی محسوس ہوتے ہیں۔ چند ناقابلِ قبول الفاظ اور تراکیب سے قطع نظر نئی شاعری کے لفظی سرمائے کو انفرادیتوں اور تخلیقی جدتوں کے باوجود غریب اور نامانوس نہیں کہا جا سکتا۔ نئی شاعری کی لفظیات کی فہرست مختلف جدید شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کر مرتب کی جا سکتی ہے۔

خیال و احساس کی جدت سے اپنا مقام بنانے میں بعض جدید نظم نگار شعرا کامیاب ہیں۔ ان کے یہاں اسلوب و اظہار میں کلاسکیت ہے اور ہیئت میں شرر اور نظم طباطبائی کے دور تک جدتیں ملتی ہیں لیکن خیال و احساس میں یہ سب سے الگ ہیں۔ فکر و احساس کی جدتوں سے ان شعرا نے لفظیات میں بھی اضافے کیے ہیں جو معقول اور متوازن ہیں۔

ایسے نظم گو جدید شعرا میں وزیر آغا، خورشید الاسلام، وحید اختر، عمیق حنفی، ندا فاضلی، شمس الرحمن فاروقی وغیرہ ہیں۔ یہ مروجہ اوزان و بحور میں تبدیلی بھی فن کے اسرار و رموز کے واقف کار کی حیثیت سے کرتے ہیں۔

جدید شاعری میں نثری نظم بھی پھلی پھولی ہے لیکن یہ ترقی پسند شاعری میں بھی ملتی ہے۔ نثری نظم کا مستقبل ہنوز مشکوک ہے۔ جدید نظموں میں وزن و آہنگ سے بے نیازی بڑھ چلی ہے۔ شعری آہنگ اور نثری آہنگ کا فرق جدید دور میں اور زیادہ بحث طلب ہو گیا ہے۔

جدید شاعری میں لفظوں کی ترتیب کو تخلیقی برتاؤ کے نام پر اوزان و بحور سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض جدید نظموں میں مثبت تاویلوں کے ساتھ فرد کی انفرادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ انفرادیت حساسیت اور مریضانہ داخلیت کی غماز ہے۔ نیا شاعر کبھی کبھی انفرادیت میں اس طرح ڈوب جاتا ہے کہ وجودیت کے فلسفے کی براہ راست یا سنی سنائی معلومات کا پرتو اسے اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ شاعر اپنے وجود کی تلاش میں گم ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ایسے شاعروں میں ہیں جو وزن و آہنگ کا سلیقہ جانتے ہیں اور کلاسیکی شاعری پر نظر رکھنے کی وجہ سے اور جدتوں کے باوجود قادرالکلامی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جدید شاعری میں فرد کے وجود کا احساس طوفان کی طرح سر اٹھاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ مخمور سعیدی بھی وزن و آہنگ اور قدرتِ کلام کا بھرپور ثبوت دیتے ہیں۔

افسانہ:

جدیدیت میں مختصر افسانہ بھی اسی آب و تاب اور کر و فر کے ساتھ دکھائی دیتا ہے جو جدید شاعری کو میسر ہے۔ جدید افسانہ اور جدید شاعری میں ایک فرق ضرور ہے کہ جدید افسانے کو اتنے ہمنوا اور حامی میسر نہیں ہوئے جو جدید شاعری کے نصیب میں لکھے ہیں۔ جدید افسانے کے باب میں وہی ناقدین جو جدید شاعری کے ہم نوا رہے ہیں اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر جدیدیت کے حامی نقاد شمس الرحمٰن فاروقی جدید شاعری کی وکالت اور مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے لیکن جدید افسانے کے سو فیصد حامی نہیں ہیں۔ جدید افسانے

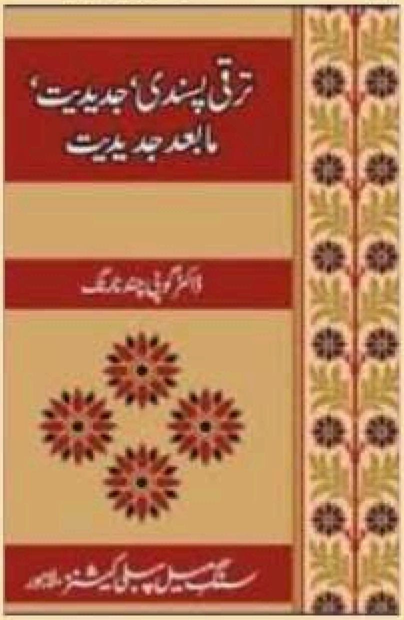

کی تکنیک اور اس کے اجزائے ترکیبی پر بھی اختلاف رائے ہے۔

افسانے میں افسانویت اس کی روح ہے یا نہیں اس پر جدید ناقدین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا کہنا ہے کہ بیانیہ کے بغیر افسانہ لکھا ہی نہیں جاسکتا کیوں کہ افسانویت یا کہانی پن جو بیانیہ کی دین ہے، افسانے کے لیے لازمی ہیں اور بیانیہ افسانے کے ہاتھ پاؤں کا کام کرتا ہے۔ جدید افسانے کی افسانویت کردار کے بغیر اور زمان و مکان کی کسی حد بندی کے بغیر بھی لکھا جاتا ہے۔ جدید افسانہ اختصار سے اس قدر معمور ہوگیا ہے کہ چند سطروں میں بھی افسانے لکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مشہور کہاوتیں، لطیفے اور چٹکلے بھی چند سطری تخلیق کے طور پر افسانوں کے نام سے پیش کیے جاتے ہیں۔

جدید افسانہ تکنیک کے اعتبار سے روایتی اور ترقی پسند افسانے سے قطعی مختلف ہے اور جدید افسانے میں اشاریت حد سے بڑھ چلی ہے۔ جدید افسانے میں بھی استعارات بڑھتے جاتے ہیں اور تقریباً اسی طرح کے استعارات ملتے ہیں جو جدید شاعری کو عہد ماقبل کی شاعری سے الگ کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جدید شاعری اور جدید افسانوں میں مشترک استعارات ہیں لیکن لفظوں کا استعاراتی اور خلاقانہ استعمال یکساں طور پر شاعری اور افسانوں میں ہو رہا ہے۔

استعاراتی استعمال کثرت کی بنا پر لفظ کو علامت کا درجہ عطا کر دیتا ہے اور انتظار حسین کو علامتی افسانہ نگاروں کا پیش رو قرار دیا جاتا ہے۔ استعارہ کب علامت بنتا ہے اور اس بات میں ناقدین کے درمیان اختلافِ رائے ہے کہ ایک ہی فنکار کے یہاں جب وہ بہ کثرت اور متعین معنوں میں یکساں برتا جائے تو وہ علامت کی صورت اختیار کرلیتا ہے لیکن جب اسے عمومیت کے ساتھ استعمال کیا جانے لگے تو اس کی علامتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

جدید افسانہ رویہ اور برتاؤ یعنی Treatment دونوں کے اعتبار سے کلاسیکی اور ترقی پسند افسانوں سے ممیز ہے۔ 1970 کے بعد کا افسانہ شاعری کے بہت قریب آگیا ہے اور اب افسانے میں بھی بات واشگاف انداز میں نہیں کی جاتی جس طرح شاعری میں غیر ضروری تفصیلات حذف کردی جاتی ہیں، اسی طرح افسانے میں بھی تراش و خراش کے بعد صرف جوہر یا عطر پیش کیا جاتا ہے۔

ناقدین اور مفکرین کے بیانات کی روشنی میں جو افسانے تقسیمِ ہندوستان کے بعد تقریباً دس پندرہ سالوں بعد وجود میں آئے ان میں تقسیم ہند کا المیہ جدید تر افسانوں کی پیش رو تخلیقات میں دیکھا جاسکتا ہے لیکن جدید افسانوں میں قدروں کا فقدان اور ذہن انسانی کا کرب زیادہ نمایاں ہے۔ جدید افسانے میں حالات اور محرکات سے قطع نظر انسان کی داخلی کیفیات اور اس پر طاری ہونے والی قنوطیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ شرافت کا استحصال اقتصادی لوٹ کھسوٹ، مختلف طبقوں اور فرقوں کی رسہ کشی اور اس طرح کے دیگر موضوعات جدید افسانوں کے مواد کے طور پر بروئے کار آئے ہیں۔

جدید افسانوں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نسبتاً قدیم افسانوں سے انحراف یا انہدام یا نئے موڑ کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔ جدید افسانوں کی جھلکیاں ترقی پسند تحریک کے ہراول مجموعہ 'انگارے' میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

علامت نگاری اور تجریدیت، تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے جدید افسانوں کے دو نہایت اہم پہلو ہیں۔ جدید افسانوں میں اخلاق و شرافت کے معیاروں سے ناآشنائی، تہذیب اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت اور ان کا فقدان نمایاں موضوعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نئے افسانوں میں جنسیت کو بھی بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

علامت نگاری اور تجریدیت کو مترادف سمجھنا غلط ہے کیوں کہ علامتی افسانے بھی جدید ہیں اور تجریدی افسانے بھی۔ اور ظاہر ہے کہ علامت اور تجریدیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جدید افسانوں میں تکنیک کے تجربے کہانی پن سے گریز کی صورت میں Anti Story یا اکہانی بھی بن گئے ہیں۔ کہانی پن سے گریز کے لیے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ افسانہ نہ تو داستان ہے اور نہ حکایت اس لیے اس میں بیانیہ انداز سے گریز چاہیے۔ جدید افسانے میں انسانی ذہن میں چلنے والی تصویری صورت کو فلم کی ریل کی طرح سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس طرح انسانی ذہن میں شعور کی رو ہمیشہ منطقی اور تجزیاتی طور پر کام نہیں کرتی ہے، اسی طرح جدید افسانے میں تجزیاتی تسلسل اور منطقیت کو دور رکھنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ یہ مشورہ فنکار اپنے عمل تخلیق سے دیتے ہیں۔

فاروقی کہانی پن کے باب میں جیسا پہلے بھی پیش کیا گیا ہے عام جدید ناقدین سے مختلف خیال رکھتے ہیں۔ فاروقی افسانے کے لیے اس فکرمندی کو ضروری سمجھتے ہیں جو قاری میں ہونی چاہیے۔ یہ فکرمندی تجسس سے ممیز ہے۔ تجسس کو افسانے کی دنیا میں پھر کیا ہوا سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن فاروقی یہ کہتے ہیں کہ اگر قاری یہ کہے

کہ مجھ سے کیا مطلب کچھ بھی ہو تو، اس سے اس کی عدم دلچسپی اور بیزاری کا پتہ چلتا ہے اور یہ صورتِ حال نئے افسانوں کے لیے خطرناک ہے۔ فاروقی یہ چاہتے ہیں کہ افسانہ تجسس انگیز اور دلچسپ ہو۔

جدید افسانوں میں اشاریت اور ابہام کو راہ دی گئی ہے چونکہ جدید افسانہ کہانی پن سے گریز کرتا ہے اس لیے اشاریت کے ساتھ ابہام کا ہونا بھی فطری ہے۔ جدید افسانہ بعض جہتوں سے جدید شاعری کے قریب پہنچ گیا ہے اور جس طرح عہدِ حاضر میں صنفوں کا اور مختلف چیزوں کا خط امتیاز مٹ رہا ہے، اسی طرح جدید شاعری اور جدید افسانوں کے درمیان خط فاصل کا تعین کرنا مشکل ہے۔

تنقید:

ہر عہد کا ادب اپنے ساتھ تنقیدی میزان و معیار لے کر آتا ہے۔ ادبی اقدار کی عہد بہ عہد تبدیلیاں فن کو پرکھنے کے نئے سانچے مہیا کرتی رہتی ہے۔ اردو ادب میں جدیدیت ایک رجحان یا تحریک بن کر ابھری اور اپنے جلو میں ان تمام افکار و نظریات کو لائی جو جدیدیت کے ساتھ مختص ہے۔

جس طرح جدید تخلیقی اصناف کے آغاز کا تعین ماہ و سال کے اعتبار سے دشوار ہے، اسی طرح جدید تنقید کے آغاز کا فیصلہ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جدید اردو تنقید جدیدیت کے بنیادی نظریات پر مبنی ہے اور جدیدیت کے سارے مزعومات اور مطالبات کی ترویج و توثیق کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید اختر کی رائے ہے کہ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے امتزاج کی صورت میں جدید ادب اور اس کی تنقید کا وجود ہوا۔ اس طرح ان کے نزدیک جدید تنقید ترقی پسند تنقید اور مارکسی تنقید کی توسیع ہے۔ دوسری طرف جدید تنقید کو ترقی پسند تنقید کی ادعائیت کا ردِ عمل کہا گیا ہے۔

جدید تنقید میں فنکار کی ذات اور اس کی داخلیت کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور فن برائے فن جو ایک زمانے میں کروچے کا نعرہ تھا ایک بار پھر جدید تنقید میں نمایاں حیثیت کر گیا ہے۔ جدید تنقید میں کسی منشور کی گنجائش نہیں ہے اور جدید تنقید فنکاروں سے کسی ضابطے کی توقع نہیں کرتی۔ جدید تنقید کے مطابق فن پارہ فنکار کی ناآسودگی اور بے اطمینانی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے لیکن کبھی کبھی سرخوشی اور انبساط بھی تخلیق کے تاروں کو چھیڑنے والے عناصر ہوتے ہیں۔ جدید تنقید ان تمام باتوں کا لحاظ کرتی ہے۔ جدید شاعری نے جس تنہائی کو اپنا موضوع بنایا ہے، جدید تنقید بھی فرد کی اسی تنہائی کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ جدید تنقید میں فنکار کی ذات اور اس کی معرفت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جدید تنقید میں اصناف ادب کی مروجہ تقسیم اور حد بندیاں ہیں اور جدید تنقید نے آزادی کو اس حد تک روا رکھا ہے کہ نثری نظمیں اور آزاد غزلیں اور آزاد رباعیاں بھی وجود میں آچکی ہیں۔ نئی تنقید نے بعض پرانے تنقیدی دبستانوں کو از سرِ نو تقویت پہنچائی ہے اور یہ اس طرح ثابت ہے کہ جدید تنقید کے اہل قلم مختلف دبستانوں سے نظریاتی اختلاف اور وابستگی رکھتے ہیں۔ جدید ناقدین نظریاتی اعتبار سے کبھی کبھی قطبین کے فاصلے پر نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کو جوڑے رکھنے والی جو قدریں ہیں وہ صرف یہ رسمیت، معروضیت اور روایت پرستی سے انحراف واعراض میں سب متفق ہیں۔ نئی تنقید نئے تجربوں کی اور نئی ہیئتوں کی حمایتی کرتی ہے اور نئے استعاروں اور نئی علامتوں اور اچھوتے پیکروں کی تحسین اور ابہام کی ہر دل عزیزی پر زور دیتی ہے۔ نئی تنقید زبان کے تخلیقی استعمال کی قائل ہے اور لسانی اور خالص ادبی اصطلاحوں پر فکر ونظر کے وہ دروازے کھولتی ہے جو اب تک بند تھے۔

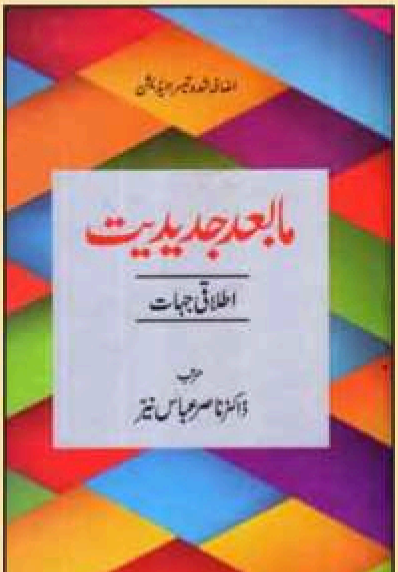

جدید تنقید مغربی ادیبوں، فلسفیوں، ناقدوں اور دانشوروں سے استفادہ کرتی ہے۔ جدید تنقید کے اہل قلم میں فلسفیانہ تنقید لکھنے والے بھی ہیں اور نفسیاتی تنقید لکھنے والے بھی، یہاں ہیئتی تنقید بھی مقبول ہے اور ہیئتی تنقید کی مذمت بھی۔

مجموعی طور پر جدید تنقید بہرحال ادبی پیمانوں کو اختیار کرتی ہے اور خارجی اور سماجی پیمانوں کو رد کرتی ہے۔ جدید تنقید میں جمالیاتی اور تاثراتی تنقید بھی ملتی ہے۔

ہر عہد کا ادب اپنے ساتھ تنقیدی میزان و معیار لے کر آتا ہے۔ ادبی اقدار کی عہد بہ عہد تبدیلیاں فن کو پرکھنے کے نئے سانچے مہیا کرتی رہتی ہے۔ اردو ادب میں جدیدیت ایک رجحان یا تحریک بن کر ابھری اور اپنے جلو میں ان تمام افکار و نظریات کو لائی جو جدیدیت کے ساتھ مختص ہے۔

جدید تنقید جن مفکروں اور دانشوروں سے استفادہ کرتی ہے ان میں بیشتر مغربی اہل فکر و نظر ہیں اور خاص طور پر سارترے، کافکا، ریبنٹ اور رین سمر وغیرہ کو جدید تنقید نے اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا ہے۔ جدید تنقید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ تخلیقی فنکار بھی ناقدین بن بیٹھے ہیں۔

جدید تنقید کے اسالیب میں بھی رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ فلسفیانہ تنقید میں عالم خوندمیری، جیلانی کامران اور وحید اختر اردو کے جدید ناقدین ہیں۔ جدید اردو تنقید کے ممتاز نمائندوں میں وحید اختر، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا اور شمیم حنفی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح نفسیاتی تنقید میں وزیر آغا، محمد حسن عسکری، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر شبیہ الحسن وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بھی بہت سے نفسیاتی مباحث پر تنقیدی نگارشات پیش کی ہیں۔ جدید تنقید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وہی لوگ منظر عام پر آئے ہیں جو تخلیقات کی دنیا میں بھی روشناسِ خلق ہیں۔

مجموعی طور پر جدید اردو تنقید نے شعر و ادب کی تفہیم کے لیے نئے زاویے فراہم کیے ہیں اور تنقید کی کہنگی پر ضرب کاری لگائی ہے۔ نئی تنقید تقلید سے بظاہر بیزار ہے لیکن اس میں بھی مقلدین کی ایک جماعت نے از سرِ نو تقلید کی بنائے کہنہ ڈال دی ہے۔ جدید تنقید کا مستقبل کیا ہوگا یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس میں ابھی تکمیل کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی کوتاہیاں اور نارسائیاں مسلم ہیں اور اسالیب کے تنوع کے باوجود مستقبل کا مؤرخ ہی یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ تنقید کس حد تک اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکی ہے۔

■

Prof. Dr. Md. Tauquir Alam
Former Pro-Vice Chancellor
M. M. H. Arabic & Persian University,
34, Harding Road, Patna, 800001 (Bihar)
E-mail-proftauqiralam@gmail.com
Mobile : 9934688876

راشد میاں

چار بیت میں برسات کی بہاریں

اردو شاعری کی بیشتر اصناف میں برسات کا بیان بخوبی ملتا ہے۔ بالخصوص چار بیت گو شعرا نے تو اسے بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے۔ واضح ہو کہ چار بیت ٹونک، رام پور و بھوپال کی مقبول عوامی صنفِ سخن ہے۔ ان مقامات کے تقریباً ہر معروف شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ملک کے دیگر خطوں میں بھی چار بیت کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے چار بیت ایک ایسی نظم ہے جس میں سرے (مطلع) کے ساتھ چار چار مصرعوں کے چار بند اس طرح کہے جاتے ہیں کہ ہر بند کا آخری مصرعہ سرے سے ہم قافیہ و ردیف ہوتا ہے۔ اس میں بھی شعرا نے ہیئت کے متعدد تجربات کیے ہیں۔ ڈیڑھ مصرعی، دو مصرعی، ڈھائی مصرعی چار بیتیں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بعض قدیم چار بیتوں میں سرے کا ایک مصرع بھی ہوتا تھا، مگر اب دو مصرعوں پر مشتمل مطلع ہی رائج ہے۔ چار بیت میں ہر بند کا آخری مصرع ٹیپ کا مصرع ہوتا ہے۔ چار بیت کے بند کو 'چوک' بھی کہا جاتا ہے۔

ابتداً چار بیت اَلّڑھ فوجی سپاہیوں اور کم خواندہ تک بندوں کا مشغلہ تھا، لیکن بعد میں سنجیدہ پڑھے لکھے لوگوں اور شعرا نے اس صنف میں ادبی رنگ داخل کیا اور بے شمار معیاری مضامین پر مشتمل چار بیتیں لکھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج چار بیت کی شناخت لوک صنف کے مقابلے ادبی صنفِ سخن کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

چار بیت کا پس منظر عربی قبائل سے شروع ہوتا ہے۔ عرب میں ابتدا ہی سے دَف نوازی کے ساتھ نغمہ سرائی عام ہے۔ یہی عربی قبائل جب افغانستان میں آباد ہوئے تو وہاں بھی انھوں نے مذکورہ روایت کو قائم رکھا۔ ہندوستان میں بھی چار بیت انھی افغانی قبائل کی رہینِ منت ہے۔ اسی لیے چار بیت کو 'پٹھانی راگ' اور 'پٹھانوں کا لوک گیت' بھی کہا جاتا ہے۔ دَف چونکہ شرعی قوانین کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی و اسلامی ممالک میں آج بھی دَف نوازی کے ساتھ نغمہ سرائی رائج ہے۔

ابتدائی دور میں عموماً رزمیہ چار بیتیں کہی گئی ہیں، جن میں تفاخر ذاتی اور جنگی کارناموں کا ذکر اکثر ہوتا ہے مگر جس طرح چار بیت میں ہیئت کے مختلف تجربات ہوتے ہیں اسی طرح موضوعات کے اعتبار سے بھی اس کا دامن خاصا وسیع ہے۔ اس میں مذہبی و اخلاقی، عاشقانہ، مدح، ہجو، قومی و وطنی، تاریخی، ماتمی، واقعاتی، مختلف موسموں اور تہواروں کا بیان، محبوب کا سراپا، سہرا، برساتی، (ملہار) غرض کہ حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

مذکورہ اقسام میں ایک قسم برساتی چار بیت کی بھی ہے، چار بیت کے تقریباً ہر معروف شاعر نے برساتی چار بیتیں کہی ہیں۔ منشی سید علی مرحوم ہر دو چار بیت کے شائع شدہ اوّلین مجموعے 'بہارِ چندن' (1966) کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

''ہندی کی یہ برسات سو چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے''

پورے ہندوستان میں مشہور ہے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ یہ مضطر خیرآبادی کی ہندی چار بیت ہے۔ (مقدمہ بہارِ چندن: چندن بھارتی، 1966، ص 11)

برساتی چار بیت میں عموماً دو قسمیں ہیں۔ پہلی وہ جس میں برسات (کی) آمد اور موسم بہار کی مختلف کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ دوسری وہ جس میں ملہار رَس شامل ہوتا ہے، اس میں ہندی کلچرل و ہندی گیت کے اثرات نمایاں ہیں، جس میں تخاطب عورت سے مرد کی جانب ہوتا ہے۔ اس قسم کی چار بیت میں ایک عورت موسم برسات میں اپنے محبوب و شوہر کے ہجر میں جو کہ پردیس چلا گیا ہے، اپنے مضطرب دل کے مختلف جذبات و کیفیات کا اظہار کرتی ہے۔ فراقِ محبوب میں نہ تو اسے چولی، چندری بھاتی ہے، نہ ہی کنگھی، چوٹی اور بناؤ سنگھار اُسے اچھا لگتا ہے۔

اس فراق کی ماری کو کوئل کی کوکو اور پپیہے کی صدائیں اس کے محبوب کی یاد دلاتی ہیں۔ موسمِ برسات میں سہیلیوں کا جھولا جھولنا اور آپس میں ہنس بولنا اس کے دل پر نشتر زنی کرتے ہیں۔ ایسے عالم میں اسے پھول بھی خار نظر آتے ہیں، پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کی طرح چبھتی ہے۔ ان تمام باتوں کا اظہار وہ پر درد اور پر کرب الفاظ میں کرتی ہے۔

وہ مختلف ذرائع سے خبر پہنچا کر اپنے محبوب سے وطن واپس لوٹنے کی التجا کرتی ہے اور اپنے خدا سے دعا کرتی ہے کہ اس کا شوہر (برساتی (ملہار) چار بیت میں محبوب کوئی غیر مرد نہیں، بلکہ خود اس عورت کا شوہر ہے۔) خیر و عافیت سے جلد گھر لوٹے، اس قسم کی چار بیت میں ہندی گیت کے زیرِ اثر ہندی الفاظ کا بھرپور استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں دیگر ہندوستانی زبانوں کے الفاظ بھی مستعمل ہوئے ہیں، خواتین کی زبان کا دلکش اور

خوبصورت انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ الغرض نسوانی جذبات و احساسات کی جتنی معصوم، سچی اور بہترین ترجمانی برساتی چار بیت میں ہے۔ وہ اردو شاعری کی دیگر اصناف میں بہت کم نظر آتی ہے۔

برساتی چار بیت سے قبل کے زمانے میں ہندی، اردو اور بعض علاقائی زبانوں میں بارہ ماسہ کی روایت رہی ہے جس میں شاعر بارہ مہینوں کی مختلف موسمی فضاؤں سے متعلق گیت کی شکل میں اپنے منظوم جذبات رقم کرتا ہے۔ شبیر علی خاں شکیب رامپوری نے اپنی تصنیف 'چار بیت، تعارف و انتخاب' میں برساتی چار بیت (ملہار) کی ایجاد کا سہرا بھی عبدالکریم خاں کے سر بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''عبدالکریم خاں نے یہ سوچ کر کہ مرد تو چار بیتیں گا کر اپنا جی بہلا لیتے ہیں، خواتین کے لیے بھی کوئی ایسی چیز ہو جسے وہ بے تکلفی سے گا سکیں، ان کی نظر ہندی شاعری پر گئی جس میں بالعموم عورت کی طرف مرد کے لیے اظہارِ محبت ہوتا ہے۔ انھوں نے آسان ہندی آمیز اردو میں برساتی یا ملہار لکھی۔'' (چار بیت تاعرف و انتخاب: شبیر علی شکیب 1995، ص 14)

عبدالکریم خاں کی ایک ڈیڑھ مصرعی برساتی (ملہار) چار بیت کا بند ملاحظہ ہو۔

پردیس پی گئے ہیں، میں ہوں زمیں پہ سوئی
خالی پڑا پلنگ ہے
ان سوکنوں نے موہ لیا ہے میرے سجن کو
آتا نہیں وطن کو
تم کھولوں سے باسنا مرے بھاگوں کی آج پوچھی
آنے میں کیا درنگت ہے

اپنے ذکر کردہ تاثرات کے جواز میں اور قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے برساتی چار بیتوں کے چند بند یہاں پیش ہیں۔

اب تو خبر لے پیا، موسم برسات ہے
دھڑکے ہے مورا جیا، موسم برسات ہے
چنری اور مہندی کا رنگ   ہے ترے چرنوں کے سنگ
من کی مری ہر امنگ   سجنا تورے سات ہے

(راج ماتا رفعت زمانی بیگم عصمت آف رام پور)

رم جھم، رم جھم مینھا برسے
پیا دیکھن کو جیارا ترسے
آ جا آجا گھر میں بیری،   راہ تکت ہوں دیر سے تیری
مقلاس کری گر کچھ بھی دیری   سر کو پھوڑوں گی میں در سے

(قیوم خاں مقلاس)

چار بیت برساتی (موسمِ بہار)

عالم کچھ اور ہی ہے گھٹا زوردار کا
کیا لطف دے رہا ہے زمانہ بہار کا
کیسا سہانا سین چمن کا یہ نور ہے   رم جھم پھوار پڑتی ہے دل کو سرور ہے
بدمست پی کے پہلو میں اک رشکِ حور ہے   تقدیر سے ملا ہے یہ دن وصلِ یار کا
عالم میں نظر آتی ہے کیا قدرتِ باری
اللہ کی رحمت ہے یہاں ابر سے جاری
ساون کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے   برسات کے موسم کی بہار آئی ہوئی ہے
اور بادِ صبا آپ ہی اترائی ہوئی ہے   اٹھکھیلیاں کرتی ہے کہیں بادِ بہاری

(شمشیر جنگ)

باقی نہ رہی دل میں غمِ گردشِ ایام
بھر بھر کے پلا ساقیٔ گلفام وہی جام
آیا ہے بڑی دھوم سے ساون کا مہینہ   دیکھے کوئی پانی کی روانی کا قرینہ
ہو وجد میں جیسے سرمست حسینہ   ساقی نہ لگا دیر، اٹھا جام اٹھا جام

(نواب اسمٰعیل علی خاں تاج)

جھوم کے آگئی گھنگھور گھٹا ساون کی
دل اڑائے لیے جاتی ہے ہوا ساون کی
اُف یہ برسات کے رنگین مناظر جوہر   کیوں نہ بے تاب کریں مجھ کو یہ آخر جوہر
کیوں نہ ہو دیکھ کے مضطر دلِ شاعر جوہر   یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضا ساون کی

(جوہر ٹونکی)

رنگین بہاروں نے دیوانہ بنا ڈالا
ہر چیز کو گلشن کی پیمانہ بنا ڈالا
پرکیف ستارے کیا، رنگین فضائیں کیا   دلچسپ نظارے کیا، مستانہ گھٹائیں کیا
گلشن کی ہوائیں کیا جاں بخش بہاریں کیا   خود سے بھی محبت نے بیگانہ بنا ڈالا

(عبدالبصیر بصر)

(چار بیت برساتی ملہار) سہ مصرعی

چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے
سن ریا کوئل باوری تو پی پی کیوں چلائے ہے
چونچ سونے میں منڈھوں آرے کا گا تو اِدھر
پی کی بتیا موں سے کہہ اور پی کی تو لادے خبر
رنگت اڑتا ہے جوانی یوں ہی بیتی جائے ہے

(مضطر خیرآبادی)

اُف یہ ساون کی گھٹائیں
پی بنا جیورا، ڈرائیں
پی سے کہہ دو کوئی جاکر   تم بنا رہ رہ کے اکثر
تیر سی لگتی ہیں دل پر   یہ پپیہے کی صدائیں

(محمد صدیق خاں صائب)

میری بدریا رم جھم، رم جھم اَب تو رس برسا وری
بولے پپیہا پی ہو، پی ہو کوئل کوکے باوری
برہا موہے ستائے، یاد پیا کی آئے ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہلکی پَون بھی میرا من برمائے ہے
سب کے من میں سکھ کی آشا میرے من میں ہائے ہے
جاتے رہے پردیس میں بالم، کوئی سندیسہ لا وری

(محمد عبدالحئی فائز)

■

Dr. Rashid Miyan
Sr. Asstt. Professor Urdu
Govt P.G. College
Tonk- 304001 (Raj)
Mob.:7240302056

ادبی تھیوری کیا ہے؟

اشرف لون

ادب کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں۔ کسی نے اسے حظ پہنچانے کا ذریعہ کہا ہے تو کسی نے زندگی کی تنقید۔ لیکن ادب میں زیادہ اہمیت زبان کے تخلیقی استعمال کی ہے۔ ادب لفظوں کی ایسی ترتیب ہے جو ہمیں کہانی سناتا ہے، صورت حال کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے، جذبات کا اظہار کرتا ہے، خیالات کا تجزیہ کر کے انھیں پیش کرتا ہے۔ ادب سے متعلق یا اس کی معنویت کو مختلف مفکروں اور نقادوں نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ جان پال سارتر کے نزدیک ادب کا سب سے بلند اور صحیح نظریہ ہے کہ ادیب لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آزادیوں سے باور کرانے کے لیے لکھے اور یہ کہ آزادی ایک ایسا جذبہ ہے جسے موت نہیں آتی۔ بہر حال ادب سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے اور یہ زندگی کی تنقید بھی ہوتا ہے۔

''ایک ادیب آپ کی رہنمائی تبھی کر سکتا ہے اگر وہ ایک جھونپڑی کا نقشہ کھینچتا ہے اور اسے سماجی انصاف کی علامت کے طور پر پیش کرتا ہے اور آپ کے جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔''[1]

ادب کے اندر دراصل ایک طرح کا احتجاج ہوتا ہے اور یہی وہ احتجاج ہے جو بالآخر ہمیں آزادی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ بقول جان پال سارتر 'ادب اور فن انسانوں کے لیے آزادی کا پیغام لے کر آتے ہیں چاہے بظاہر ان سے غصہ، نفرت اور تلخی ہی کیوں نہ ظاہر ہو رہی ہو۔ اگر امریکہ کے کسی کالے ادیب کے ناول سے غصہ اور نفرت کا اظہار ہوتا ہے تو اس نفرت کے اظہار سے بھی کالوں کی آزادی مقصود ہے۔ ادب آزاد لوگوں کی آزاد لوگوں سے ہم کلامی ہے جس کا موضوع انسانی آزادی ہے۔'[2] سارتر آگے لکھتے ہیں:

''اگر ہم مزید اس (ادب) کی تشریح کرنا چاہیں تو ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ایک ادیب دیگر فنکاروں کی طرح اپنے قاری کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے جسے جمالیاتی حظ کہتے ہیں، اور جسے میں جمالیاتی خوشی کہنا چاہوں گا، اور اس احساس کا پیدا ہونا ہی کہ کام (ادب کی تخلیق) کی تکمیل ہو چکی ہے۔''[3]

بہر حال ادب کی تفہیم اور جامع تعریف کے لیے سارتر کی کتاب 'ادب کیا ہے' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

1970 کے آس پاس ادب کی تعریف و تفہیم کی مختلف و متعدد تھیوریاں سامنے آئیں جنھوں نے ادب کو مختلف زاویوں سے سمجھنے، سمجھانے پر زور دیا۔ ان میں زیادہ تر تھیوریوں کا تعلق مابعد جدیدیت کے عہد سے ہے۔ ان تھیوریوں میں ردتشکیل، ساختیات، پس ساختیات، تانیثیت اور مابعد نوآبادیاتی اور اکتشافی نظریے قابل ذکر ہیں۔ بنیادی طور پر ان تھیوریوں کا مقصد ادب کو مختلف زاویوں سے جانچنا تھا اور یقیناً ان تھیوریوں نے ادب کو سمجھنے کے مختلف در وا کیے اور کلاسیکی اور جدید ادب کی تفہیم کی نئی راہیں کھولیں۔

ادبی تھیوری کیا ہے۔ اس سوال کا آسان جواب یہی ہے کہ ادبی تھیوری خیالات اور قواعد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا استعمال ہم ادب کے عملی مطالعے میں کرتے ہیں۔ ادبی تھیوری سے ہم کسی ادبی تحریر کے معنی مراد نہیں لیتے بلکہ ایسے نظریات جو ادب میں پوشیدہ معنی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ادبی تھیوری ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے ہم ادب کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبی تھیوری ادبی تنقید سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ تنقید، تھیوری کی عملی شکل ہے۔ اس کا مطلب پہلے تھیوری وجود میں آتی ہے اور بعد میں جب نقاد کسی تھیوری کی مدد سے یا اس کے تناظر میں ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو تنقید وجود میں آجاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ کوئی بھی تنقیدی نظریہ بنا تھیوری کے وجود میں نہیں آتا اور یہ کہ ہر تنقیدی نظریہ پہلے تھیوری ہی ہوتا ہے۔

> تھیوری کی تعریف جتنی آسان دکھائی دیتی ہے اتنی ہی یہ مشکل ہے۔تھیوری نے ہمیں ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف ذریعے مہیا کیے ہیں۔اور یہ تھیوری ہی ہے جس کی بدولت ہم آج ادب سے مختلف معنی کشید کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ایک شعر کے مختلف اور متضاد معنی تھیوری کی وجہ سے ممکن ہیں۔تھیوری کا اس سے پہلے ادب میں اتنا ذکر نہیں تھا جتنا بیسویں صدی میں ہوا اور اس طرح اس نے ادب میں بہت اہمیت حاصل کی اور یہاں تک کہا جانے لگا کہ جب تک ادب ہے تب تک تھیوری کی اہمیت برقرار ہے۔

تھیوری کی تعریف جتنی آسان دکھائی دیتی ہے اتنی ہی یہ مشکل ہے۔ تھیوری نے ہمیں ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف ذریعے مہیا کیے ہیں۔ اور یہ تھیوری ہی ہے جس کی بدولت ہم آج ادب سے مختلف معنی کشید کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک شعر کے مختلف اور متضاد معنی تھیوری کی وجہ سے ممکن ہیں۔ تھیوری کا اس سے پہلے ادب میں اتنا ذکر نہیں تھا جتنا بیسویں صدی میں ہوا اور اس طرح اس نے ادب میں بہت اہمیت حاصل کی اور

یہاں تک کہا جانے لگا کہ جب تک ادب ہے تب تک تھیوری کی اہمیت برقرار ہے۔ رچرڈ رورٹی کے مطابق:

''گوئٹھے، مکاولے اور کارلائل اور امرسن کے زمانے میں تحریر کی ایک نئی قسم سامنے آنے لگی جو نہ تو ادب کی روایتی اہمیت سے تعلق رکھتی ہے، نہ دانشورانہ تاریخ ہے، نہ اخلاقی فلسفہ ہے نہ سماجی پیش گوئی ہے، مگر ایک نئی صنف میں یہ سب چیزیں ایک ساتھ ملا دی گئی ہیں۔[4]

اور بقول جوناتھن کلر بعد میں اسی کو آسان لفظوں میں 'تھیوری' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تھیوری ان علوم سے مدلتی ہے یا ان علوم کے ایک مجموعے کا نام ہے جن سے عموماً ادب کے ایک طالب علم کو کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن یہ تھیوری ہی ہے جن سے وہ نئے علوم سے متعارف ہوتا اور ادب کے حوالے سے ان کے کیا امکانات ہیں یا ادب کے میدان میں ان سے کہاں مدد لی جاسکتی ہے، ایک طالب علم اس سے متعارف ہوتا ہے۔ اس طرح تھیوری ادب، معنی اور تجربے سے متعلق عام مفروضات سے ہٹ کر سوچنے کا نام ہے۔ مثلاً جوناتھن کلر کے نزدیک تھیوری مندرجہ ذیل نکات پر سوالات اٹھاتی ہے:

1. ایسا تصور، کہ الفاظ یا تحریر کے معنی مصنف یا مقرر کے ذہن میں تھے۔
2. یا ایسا خیال، کہ تحریر ایک ایسا اظہار ہے جس کی حقیقت کہیں اور ہے، ایک ایسے تجربے یا ایسی حالت میں جس کا یہ اظہار کرتی ہے۔
3. یا ایسا تصور، کہ حقیقت وہی ہے جو اس وقت (موجودہ ساعت میں) موجود ہے۔[5]

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں تھیوری زبان و ادب اور معنی کی مختلف سطحوں سے بحث کرتی ہے۔ ان مختلف سطحوں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور پھر اپنے فیصلے سناتی ہے۔ یہ ادب و زبان اور ادب میں چھپے مختلف معنی کے متعلق عام رائے یا ایک ہی رائے کو نہیں مانتی۔ بلکہ یہ ادبی فن پارے کے اندر چھپے مختلف معنی کو کھنگالتی ہے۔ جوناتھن کلر نے اپنی کتاب 'ادبی تھیوری' میں تھیوری کی چار اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے:

1. تھیوری بین العلومی ہے— اصل شعبے سے باہر نتائج کے ساتھ ڈسکورس۔
2. تھیوری تجزیاتی اور قیاسی ہے— ایک ایسی کوشش، یہ دیکھنے کے لیے کہ جنس یا زبان یا تحریر یا معنی یا موضوع سے دراصل کیا مراد ہے یا اس کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔
3. تھیوری 'عام فہم' کی تنقید ہے، ایسے تصورات کی تنقید جن کو ہم الہامی یا خلقی مان لیتے ہیں۔
4. تھیوری ایک اضطراری چیز ہے، کسی خیال کے متعلق سوچنا۔ ایسے زمروں کے متعلق جو ہمیں مختلف چیزوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، جیسے ادب یا دوسرے فکری اعمال یا پیشوں میں۔[6]

ان توضیحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تھیوری مختلف علوم کو اپنے دائرے میں لاتی ہے۔ یہ معنی کی تکثیریت پر زور دیتی ہے اور ادب کے عام فہم تصور کو رد کرتی ہے کہ اس کے مطابق ادب کثیر الجہت اور کثیر المعنی ہے۔ ادب کا کوئی بھی نظریہ حتمی نہیں۔ بلکہ ادب اور اس میں استعمال ہونے والی زبان میں یک رنگی نہیں ہوسکتی بلکہ یہ مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ تھیوری نے اس بات کو چیلنج کیا کہ ادب کے اندر زبان کا کردار محدود ہے اور مصنف اپنی تحریر میں جو حقیقت یا خیالات بیان کرتا ہے اس میں وہ آزاد نہیں۔ گریگری کاسل فرماتے ہیں:

''ادبی نظریہ سازوں کے مطابق ہر تھیوری کی اپنی ایک آڈیولوجی ہوتی ہے اور ہر ایک نظریہ ساز اپنی اپنی مخصوص آڈیولوجی کے تحت کام کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ادبی تحریر کے متعلق کہا جاسکتا ہے جو ایک مخصوص شخص کی تخلیق ہوتی ہے، یا کسی مخصوص وقت میں، مخصوص سماج اور ثقافت میں اشخاص کی تخلیق ہوتی ہے۔ ادبی تھیوری ہمیں اس مخصوص تناظر اور آڈیولوجیکل نظریہ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے جس میں یہ ادبی تحریر وجود میں آئی ہے۔''[7]

پہلے پہل ادب سے اوپری یا فوری معنی ہی مراد لیے جاتے تھے یا چند مفروضوں یا نظریات کی بنیاد پر ادب کی تعیین قدر ہوتی تھی۔ یہ سوچ بنا کہ ادب کی اپنی ایک وسیع دنیا ہے اور اس میں معنی کے لامحدود امکانات ہیں جو تاریخ، جغرافیہ، وقت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ تھیوری نے ادب میں معنی کے امکانات کا ازسرنو پتا لگایا اور ہمیں یہ باور کرایا کہ ادب صرف وہ نہیں جو آج تک آپ اس سے مراد لیتے ہیں بلکہ اس سے بڑی چیز ہے اور یہ کہ ادب کے اندر ہزار ہا معنی پوشیدہ ہیں اور یہ تھیوری ہی ہے جو ان معنی تک ہماری رسائی کو یقینی بناتی ہے۔ پہلے ادب کو مصنف کی ذات تک محدود کیا جاتا تھا یا محض حالات و واقعات کو سامنے رکھ کر اس کا مطالعہ کیا جاتا تھا، تھیوری نے ان نظریات کو چیلنج کیا اور بتایا کہ ادب کسی مخصوص معاشرے کے طرز فکر کا نمائندہ ہوتا ہے۔ نظریہ ساز اس تحریر کا غائر نظر سے مطالعہ کرتا ہے اور اس مخصوص طرز فکر کا پتا لگاتا ہے۔ رولاں بارتھ نے بھی کہا ہے:

''اب ہم جانتے ہیں کہ متن، الفاظ کی ایسی سطر نہیں ہوتی جو کسی واحد الہیاتی معانی (یعنی مصنف / خالق کے پیغام) کا اظہار کرتی ہو بلکہ یہ ایک کثیر الجہات خلا ہے جس کے اندر کئی طرح کی تحریریں، جن میں سے کوئی بھی تخلیق نہیں ہوتی، یکجان بھی ہوتی ہیں اور متصادم بھی۔ متن کلچر کے بے شمار مراکز سے اخذ کردہ اقتباسات کا مجموعہ ہے۔''[8]

تھیوری متن میں ان مختلف معنی کا پتہ لگاتی ہے۔ اس کا کام یہ بھی ہے کہ تحریر کس حد تک کثیر الجہاتی ہے اور ثقافت سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ بارتھ دراصل متن کے ثقافتی تفاعل کو مرکز میں لانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اس ثقافتی نظام کو مرکز توجہ بنانا چاہتے ہیں جس میں یہ تحریر وجود میں آئی یا لکھی گئی۔

یہ بات طے ہے کہ ادب کا کوئی بھی کلامیہ (ڈسکورس) ادبی تھیوری کے بغیر ممکن نہیں اور یہ کہ ادبی تھیوری کی ضرورت تب تک رہے گی جب تک ادب لکھا جائے گا۔ ادبی تھیوری نہ صرف ہمیں جدید ادب بلکہ کلاسیکی ادب کو نئے اور عصری تناظر میں بھی سمجھنے میں رہنمائی کرتی ہے۔ اس نے ہمیں میر، غالب، مومن، فیض، اقبال، منٹو، بیدی، پریم چند کو نئے سرے سے پڑھنے پر اکسایا ہے۔ ظاہر ہے غالب یا میر کی معنویت ہمیشہ برقرار رہے گی لیکن ادبی تھیوری اس معنویت کا سراغ لگاتی ہے اور تنقید کے لیے وہ آلات مہیا کرتی ہے جو اس معنویت کا پتہ لگائے۔ جب کوئی نقاد کسی بھی ادبی تھیوری کے ذریعے کسی فن پارے کو جانچتا ہے تو وہ ذاتی تاثرات سے ہٹ کر منطقی انداز میں اور دلائل کے ساتھ اپنی بات پیش کرتا ہے۔ اس کے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ میر اور غالب یا منٹو اور پریم چند کو کون پسند کرتا ہے یا ناپسند بلکہ اس کا سروکار اپنے وسیلے یا تھیوری سے ہوتا اور یہاں پر وہ انھیں آلات پر انحصار کرتا ہے جو تھیوری اسے عطا کرتی ہے۔ وہ اپنے فیصلے کسی مخصوص تھیوری کا سہارا لے کر سناتا ہے۔ ایسا نہیں کہ سب اس کے فیصلے سے متفق ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ جس تھیوری کے ذریعے وہ یہ فیصلہ سنائے وہ منطقی ہو اور ادب کی تشریح میں معاون ہو۔

ادبی تھیوری ادب کا عرفان عطا کرتی ہے اور یہی وہ عرفان ہے جس سے ہم تخلیق کی ماہیت کو سمجھتے ہیں۔ تخلیق میں پوشیدہ معنی اور زبان کا استعمال اور اس زبان کے پیچھے ثقافتی عوامل کیا ہیں، ادبی تھیوری اس سے بحث کرتی ہے۔ ادب میں ہزار معنی پوشیدہ ہیں جس کا ہمیں بیسویں صدی میں سامنے آنے والی تھیوریوں سے پتا چلا۔ تھیوری کسی بھی تحریر کے پوشیدہ معنی کی تہہ تک جاتی ہے اور انھیں

کھنگالتی ہے اور پھر فن پارے کا مقام متعین کرتی ہے۔ اردو میں مابعد جدیدیت کے اہم نقاد گوپی چند نارنگ نے اپنے کئی مضامین میں تھیوری اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت پر لکھا ہے۔ تھیوری کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نظریہ (تھیوری) ادب فہمی ہے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ادب کیا ہے، اچھا ادب یا ناادب کیا ہے، ادب کی نوعیت و ماہیت کیا ہے، ادب اور زندگی میں کیا رشتہ ہے، زبان ادب میں کیوں کر جادو جگاتی ہے، معنی آفرینی، تہہ داری جدت وندرت کیا ہیں، نشاط وکیف، اثر پزیری اور جمالیات کیا ہیں، اقدار کیا ہیں، اور انسان، سماج اور تہذیب میں کیا رشتہ ہے اور ادب میں ان پُر اسرار رشتوں کی نبض کس طرح ذوقی ابھرتی اور جمالیاتی فن پارہ بنتی ہے تو ان امور کی افہام وتفہیم یا ادبی تربیت کی کوئی بھی کوشش دراصل نظریہ فہمی یا نظریہ سازی (تھیوری) کی کوشش ہوگی اور تخلیقی عمل کی ذمے داریوں کی آگہی اور ادب شناسی کے لیے اس کی اہمیت کم وبیش ویسی ہوگی جیسے زندہ رہنے کے سانس لینے کی۔''[9]

گوپی چند نارنگ کی ان توضیحات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ عصری تناظر میں ادب کی معنویت کو اجاگر کرنے میں تھیوری کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کہ تھیوری نے ادب کو سمجھنے کے کیسے در وا کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تنقید کی طرح تھیوری بھی ادب کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس اہمیت سے ہم انکار نہیں کرسکتے کیوں کہ اس سے ہم ادب یا کسی بھی تحریر کے مختلف معنی کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور اس طرح ادب کا یک رُخا مطالعہ سامنے آئے گا، جو کسی بھی طرح ادب یا اس کی تفہیم کے لیے مفید نہیں۔ اس طرح ادب کے جامع مطالعے کے لیے تھیوری کی اہمیت مسلم ہے۔

نارنگ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''تھیوری کی بحث بے شک نظریہ سازی کی بحث ہے، لیکن اس کا مقصد نہ کوئی نئی تحریک چلانا ہے نہ ضابطہ متعین کرنا۔ نئی تھیوری سرے سے ضابطہ نافذ کرنے یا نظام وضع کرنے ہی کے خلاف ہے، بلکہ ہر طرح کی سابقہ ضابطہ بندی کی نفی کرتی ہے، کیوں کہ تمام ضابطے اور نظام بالآخر کلیت پسندی اور جبریت کی طرف لے جاتے ہیں اور فکری وتخلیقی آزادی پر پہرہ بٹھاتے ہیں۔ نئی تھیوری کی سب سے بڑی یافت زبان وادب وثقافت کی نوعیت وماہیت کی وہ آگہی ہے جو معنی کے جبر کو توڑتی ہے اور معنی کی طرفوں کو کھول دیتی ہے۔ متن ہرگز خودمختار وخود کفیل نہیں ہے کیوں کہ اخذ معنی کا عمل غیر مختتم ہے۔ یہ تاریخ کے محور پر اور ثقافت کے اندر ہے۔ دوسرے لفظوں میں تنقید قرأت کا استعارہ ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ تھیوری چونکہ زندگی اور ثقافت سے الگ نہیں۔ یہ سماجی عمل کا حصہ ہے اور اپنے وسیع تر تناظر میں نئی تھیوری موجودہ عہد کے انسانی کرائسس سے نمٹنے ہی کی کوشش ہے۔''[10]

غالب یا میر کو اپنے عہد میں جس طرح پڑھا جاتا تھا یا سمجھا جاتا تھا ضروری نہیں کہ آج بھی ان کو اُسی طرح پڑھا جائے بلکہ آج کی تاریخ میں ان کو یا دوسرے کلاسیکی مصنفین کو عصری تناظر میں پڑھا جائے گا یا ان کا مطالعہ موجودہ دور میں سامنے آنے والی تھیوریوں کے تناظر میں ان کا اور دیگر شعرا کا مطالعہ کیا جائے گا۔ آج کا قاری میر یا غالب یا اقبال کو اپنے ماحول اور لیاقت کے مطابق پڑھے گا اور یہ بات طے ہے کہ اس کے نکالے ہوئے معنی غالب یا میر کے عہد کے قاری (تنقید نگار) سے مختلف ہوں گے۔ پس ثابت ہوا کہ کوئی بھی تحریر جامد نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کو کسی وقت کے چوکھٹے میں محدود کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ تحریر کے معنی وقت اور لوگوں کے مزاج کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور اس وقت اور مزاج کے بدلنے میں تھیوری کا اہم رول ہے۔ ادبی تھیوری نے ادب کی قرأت کے نئے طریقے بتائے بلکہ صحیح قرأت پر زور دیا۔ اس سلسلے میں ٹیری ایگلٹن کا کہنا ہے:

''(دوسرے الفاظ میں) تمام ادبی تحریریں ان معاشروں کے ذریعے غیر شعوری طور پر دوبارہ لکھی جاتی ہیں جو ان کو پڑھتے ہیں۔ فی الحقیقت تحریر کی کوئی ایسی قرأت نہیں جو اس کو دوبارہ تخلیق کرنے کے مترادف نہیں۔''[11]

ادبی تھیوری سے ہم مصنف اور اُس کے تحریر سے رشتے کو جانتے ہیں۔ جیسا کہ ادب کی نفسیاتی تھیوری میں ہوتا ہے کہ ادب کے نفسیاتی مطالعے میں ہم مصنف کی زندگی تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور پھر اُس کی تحریروں کا اسی تناظر میں مطالعہ کرتے ہیں کہ وہ کون سے نفسیاتی محرکات تھے جنھوں نے ادیب یا شاعر کو کوئی تحریر لکھنے پر مجبور کیا۔ دوسرے یہ کہ نفسیاتی مطالعے میں ادیب کی شخصیت کی بھی اہمیت ہے اور ساتھ ہی ایسے مطالعے میں فن پارے کے کسی کردار کا بھی نفسیاتی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔ ادب کی نفسیاتی تھیوری میں ہم سگمنڈ فرائڈ کے نظریات سے مدد لیتے ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کلی طور پر ادب سے متعلق نہیں بلکہ ان کا سارا زور انسانی نفس یا ذہن تک رسائی ہے لیکن بعد میں فرائڈ اور اس کے ساتھی یونگ کے نظریات کو ادب پر منطبق کیا گیا اور اس سے نئے نئے معنی برآمد کیے گئے۔ مابعد جدیدیت میں جاک لاکاں نے سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کی مدد سے ادب کی تفہیم میں مدد لی اور اسے نئے تناظرات میں استعمال کیا۔

ادب کے ثقافتی تناظرات اور اسے ایک ثقافتی شے کو سمجھنے پر زور بیسویں صدی کے آخر میں دیا جانے لگا۔ اس طرح ادب کے مختلف معنی کو سمجھنے میں ادبی تھیوری کی اہمیت پر مضامین اور کتابیں سامنے آنے لگیں۔ اس طرح ایسے بہت سے نئے نظریات سامنے آئے جنھوں نے ادب یا بہت سی ادبی تحریروں کے ایسے معنی بتائے جن تک اس سے پہلے نقادوں کی نظریں نہیں یا کم ہی گئی تھیں۔ ادبی تھیوری کی اہمیت پر بات کرتے ہوئے ٹیری ایگلٹن کہتے ہیں:

''کچھ لوگ کہتے ہیں ادبی تھیوری، قاری اور تحریر میں حائل ہوتی ہے۔ اس کا صحیح جواب یہی ہوسکتا ہے کہ بنا کسی تھیوری کے، چاہے وہ تھیوری کتنی ہی مبہم یا واضح ہو، ہم یہ جان ہی نہیں سکتے کہ ادبی فن پارہ اصل میں کیا ہے، یا ہمیں اس کو کس طرح پڑھنا چاہیے۔''[12]

ادبی تھیوری نسل، طبقہ اور جنس کے حوالے سے ادب کو سمجھنے کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ یہاں ہم مثال میں نوآبادیاتی عہد، نوآبادیات یا ان سے متعلق جو ادب لکھا گیا ہے اُس کی مثال پیش کرسکتے ہیں۔ تھیوری اس سے بحث کرتی ہے کہ نوآبادیاتی عہد کے دوران میں جو ادب لکھا گیا اُس میں ایشیا یا افریقہ کو کس طرح پیش کیا گیا یا کس طرح مغربی مصنفوں اور ادیبوں نے یہاں کے عوام کو رزیل اور نچلے درجے کا شہری بنا کر پیش کیا اور اس طرح یہاں برطانوی حکومت یا استعماریت کا جواز پیش کیا اور یہاں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آج بھی ایسے ادیبوں کی کمی نہیں جو یہ کام امریکہ کے ایشیائی یا افریقی ملکوں پر اُس کے تسلط کے لیے کر رہے ہیں۔ ادبی تھیوری اس چیز کا پتا لگاتی ہے کہ مصنف کا اس نوآبادیاتی یا سامراجیت کو استحکام بخشنے میں کیا رول رہا ہے۔ کہیں مصنف اپنی تحریر کے ذریعے نوآبادیات یا (آج کے دور میں سامراجیت) کا جواز تو نہیں پیش کر رہا ہے۔ یہ ادب میں طبقاتی کشمکش کا بھی پتا لگاتی ہے اور نچلے طبقات اور حاشیائی طبقات میں صحیح عکاسی پر بھی زور دیتی ہے۔ اسی طرح ادبی تھیوری (تانیثیت) یہ دیکھتی ہے کہ ادب میں آج تک عورت اور ان کے مسائل کی عکاسی کن کن زاویوں سے ہوئی ہے اور

کہاں ہم نے عورت اور اُس کے مسائل کا صحیح خاکہ پیش کیا ہے۔

ادبی تھیوری کسی بھی تحریر کی تاریخی اہمیت اور اس کو تاریخی تناظر میں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ ادب اور تاریخ کے از سر نو رشتے پر غور کرتی ہے۔ جیسا کی نو تاریخیت کسی تحریر کو اس ثقافتی حوالے سے سمجھنے پر اصرار کرتی ہے۔ نو تاریخیت ادب کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کی بھی قائل ہے اور یہ تاریخ کو ادب اور دوسرے فنون کے ذریعے سے بھی سمجھنے پر اصرار کرتی ہے۔

ادبی تھیوری تخلیق میں زبان اور اس کے تفاعل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ تھیوری کا یہ بھی کام ہے کہ وہ متن میں موجود تہوں کو دیکھ سکے، اس کی ان کہی کو سُن سکے، الفاظ کے بیچ اور اندرون موجود خلا سے کلام کر سکے اور معنی کی ہر پرت کے نیچے موجود دوسری پرت تک رسائی حاصل کر سکے۔ زبان کس ثقافت کی نمائندگی کر رہی ہے اور کسی بھی کردار کی زبان سے ہم اُس کی نفسیات یا اس کے اندرون کا پتہ لگاتے ہیں۔ تحریر کے پیچھے کون سے ثقافتی، سیاسی اور تاریخی عوامل کرفرما ہیں تھیوری ان سے بحث کرتی ہے اور کس طرح زبان یا تحریر ایک نئی دنیا کو خلق کرتی ہے لیکن اُس کا حقیقی دنیا سے تعلق ہوتا ہے۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعے میں زبان یا تحریر نے بنیادی اہمیت اختیار کی ہے۔ جیسا کہ مابعد نوآبادیاتی مطالعے کے مطابق تحریر اور قاری کے بیچ رشتہ نوآبادکار اور نوآبادی کے بیچ کے جیسا رشتہ ہے۔ ایڈورڈ سعید نے ہمیں بتایا کہ کس طرح تحریر کی سیاسی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت ہوتی ہے اور قوموں کی تاریخ میں یہ (زبان یا تحریر) کیا رول ادا کرتی ہے۔ ادب کے ثقافتی، سیاسی اور تاریخی مطالعے کی اہمیت پر زور مابعد جدید عہد میں بڑھ گیا۔ اور اس دوران میں دریدا کی ردتشکیل، رولاں بارتھ کے مصنف کی موت (متن کی اہمیت) اور ایڈورڈ سعید کے مابعد نوآبادیاتی مطالعے کے نظریات سامنے آئے۔ ان نظریات نے ادب کے سابقہ نظریات کو اس شدت کے ساتھ چیلنج کیا جس کا اثر آج بھی باقی ہے اور یہ ایسے نظریات ہیں جن کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی پہلے تھی اور مستقبل میں ان کی اہمیت یقینی ہے۔

متعدد نقادوں نے اپنی اپنی تصانیف میں تھیوری کے مختلف اسکول کا نام لیا ہے۔ ان ناقدین کے مطابق تھیوری کی ابتدا روس میں ہیئتی تنقید یا تھیوری سے ہوئی۔ جوناتھن کلر نے اپنی کتاب کے اختتام میں مختلف نظریاتی اسکولوں پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ جیسے روسی ہئیت پسندی، نئی تنقید، مظہریات، ساختیات، پس ساختیات، ردتشکیل، تانیثیت، نفسیات وغیرہ۔

اس طرح تھیوری ادب و زبان کے متعلق مختلف سوالات قائم کرتی ہے۔ ان میں کچھ سوالات یہ ہیں:

1. کیا ادب بنیادی طور پر ثقافت، سماج سے متعلق ہوتا ہے یا سماج میں رہ رہے انسانوں کے مختلف گروہوں سے متعلق ہے۔
2. کیا ادب زبان کی خوبصورتی، تخیل، مصنف سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کیا یہ رتبہ، اشراف، اعلیٰ ثقافت، تخلیقی تحریر سے متعلق ہے یا مصنف کی ذات کا انکشاف ہے۔
3. کیا ادب ترسیل کے امکانات یا ناکامی سے عبارت ہے یا زبان کا نمائندہ ہے۔
4. کیا ادب انسانی نفسیات سے متعلق ہے اور یہ الفاظ کے ذریعے کیا دکھاتا اور چھپاتا ہے۔
5. کیا ادب تاریخ سے متعلق ہے، اور کیا یہ تاریخ پر اثر انداز ہوتا ہے یا اس کا عکس ہے۔

ان توضیحات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں اور جس سے بیشتر مفکرین متفق ہیں کہ تھیوری کی ابتدا اصل میں ارسطو سے ہوتی ہے۔ جیسا کی پہلے ہی ذکر ہوا کہ تھیوری ادب کے ثقافتی مطالعہ پر زیادہ زور دیتی ہے۔ یہ جنس، نسل، قومیت کے مفروضوں پر سوال اٹھاتی ہے۔ اور اس ادب کے اس کھیل کو بے نقاب کرتی ہے جس کے تحت اس نے پہلے وقتوں میں نابرابری، ثقافتی اور سماجی طاقت کو ایک محدود طبقے تک محدود رکھا اور اسے فروغ دیا۔ تھیوری مزاحمتی ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کرتی ہے، جس کے تحت یہ مختلف طبقات (ثقافتی وسماجی) کو آواز عطا کرتی ہے، تاکہ ادب کا رشتہ سیاسی انصاف و ثقافتی حقائق کے ساتھ بہتر طور پر استوار ہو سکے۔ اس تناظر میں تانیثی کی تھیوری، افریقی امریکی مطالعات کی تھیوری، کیور تھیوری، نسل کی تھیوری، مابعد نوآبادیاتی تھیوری اہمیت رکھتی ہیں۔

اور جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہوا، کہ تھیوری تحریر کی ساخت اور اس کے تفاعل، خصوصیات اور اس میں استعمال ہونے والی زبان کی کارکردگی کو مرکز توجہ بناتی ہے۔ زبان اور زبان و تحریر اور مصنف کے رشتے کو موضوع بحث بناتی ہے۔ یہاں رومانیت، روسی فارملزم، نئی تنقید، ساختیات، پس ساختیات، ثقافتی مطالعات وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

تھیوری مختلف الفاظ، معنی اور علامتوں کے درمیان رشتے کو سمجھنے پر زور دیتی ہے۔ یہ مختلف تحریروں کے اندر چھپے معنی کو ثقافت اور زبان کے ذریعے سمجھنے پر زور دیتی ہے۔ اس تناظر میں ساختیات، نشانیات اور قاری اساس تنقیدی تھیوری اہمیت رکھتی ہیں۔

تھیوری شناخت، ذہن، جسم (مادی وجود)، ذات اور ان چیزوں کی مصنف، قاری یا کردار سے کیا رشتہ ہے، اس کو کھنگالتی ہے۔ یہ ان لوگوں کی خواہشات، خوف، اغراض وغیرہ اور لفظ کے درمیان رشتے کا تجزیہ کرتی ہے جو زبان کے ذریعے اپنے آپ کا اظہار کرنا چاہتے ہیں یا کرتے ہیں۔ ادب کا نفسیاتی مطالعہ انہی چیزوں کو سمجھنے پر زور دیتا ہے۔

مجموعی طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ادب کو سمجھنے میں تھیوری کی اہمیت مسلم ہے اور یہ تھیوری ہی ہے جس سے ہم تنقیدی آلات لیتے ہیں اور پھر ان آلات کی مدد سے ہم کسی بھی فن پارے کو جانچتے ہیں اور اُس میں پوشیدہ معنی عام قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تھیوری کے بغیر شاید ہم ادب یا کسی بھی تحریر کے اتنے معنی تک رسائی حاصل نہ کر سکیں جو ادب اور اُس میں استعمال ہونے والی زبان میں چھپے ہوتے ہیں۔

حواشی:

1. Jean Paul Sartre, What is Literarture (Translation by Bernard Fretchman), Philosophical Liberary, United Kingdom, p.10
2. ایضاً،ص63
3. ایضاً،ص58
4. Jonthan Culler, Literary Theory, A Very Short Introduction, Oxford University Press, New York, 2011, p.3
5. ایضاً،ص4
6. ایضاً،ص15
7. Gregory Castle, The Blackwell Guide to Literary Theory, Blackwell Publishing, USA,p.3
8. مصنف کی موت، رولاں بارتھ (ترجمہ: امتیاز احمد)، مشمولہ 'مابعد جدیدیت: نظری مباحث' مرتب: ناصر عباس نیر، بکن ہکس، لاہور، 2014،ص211
9. گوپی چند نارنگ، جدیدیت کے بعد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2005،ص92-93
10. گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2004،ص۔11
11. Terry Eagleton, Literary Theory, An Introduction, The University of Minesota Press, Minneapolis, p.11.
12. ایضاً،ص x

■

Dr. Ashraf Lone
Wagub Sopore,
Distt. Baramulla - 193201 (J&K)
Email: ashjnu.09@gmai.com
Phone : 9811112564

مرزا غالب کا طبی شعور

ایم اے کنول جعفری

اُردو اور فارسی کے مقبول و معروف شاعر مرزا اَسد اللہ خاں غالب کا شمار ایسے شاعروں میں کیا جاتا ہے، جنھوں نے شعروسخن کے علاوہ فن طب کی جانب بھی خصوصی توجہ دی۔ مرزا غالب کے کتنے ہی اشعار طب کی جانب ان کا رجحان ہونے کی دلیل تو ہیں ہی،ان کے حکیم ہونے کی تائید بھی کرتے ہیں۔کئی شعرا نے طبی موضوع کو اپنے اشعار کی زینت بنایا۔ ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین جلانوی کے مضمون سے بھی اس دعوے کی تصدیق ہوجاتی ہے:

''کچھ شعرا نے فن طب کی طرف بھی خصوصی توجہ مبذول فرمائی اور اس فن میں بھی مہارت حاصل کی۔بعض شعرا نے طبی موضوعات کو نظم بھی فرمایا۔مثلاً حکیم یوسفی نے جو ایک اچھے شاعر تھے،طب کے مختلف موضوعات مثلاً کلیاتی،معالجی اور تشخیصی موضوعات کو منظوم صورت میں پیش کیا۔اور اس مجموعہ کو 'طب یوسفی' کے نام سے موسوم کیا۔یہ کتاب متعدد بار مطبع منشی نول کشور سے شائع ہوئی۔اسی طرح ایک کتاب 'مجربات فطن' کے نام سے دارالمسیح قرول باغ دہلی سے علامہ حکیم محمد کبیرالدین صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔''

('غالب اور طب' ماہ نامہ حسن وصحت،کلکتہ،ستمبر 1982،ص 5)

مرزا غالب ایک مایہ ناز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ اَدیب بھی تھے۔انھوں نے فارسی الفاظ پر مشتمل دقیانوسی اور دقیق روایت کے طلسم کو توڑتے ہوئے خط لکھنے کی ایسی آسان راہ نکالی،جس نے مراسلے کو مکالمے میں تبدیل کر دیا۔غالب کے خطوط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے دو شخص آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہوں۔اُن میں اعلیٰ درجے کی فلسفیانہ اور صوفیانہ صلاحیت پائی جاتی تھی شعروادب اور تصوف میں کمال حاصل کرنے والے غالب کی علم طب میں بھی گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔ غالب کے زمانے میں ان کے دوست و احباب میں حکیم الملک،حکیم میر اشرف،حکیم احسن اللہ،حکیم عبدالرحیم،حکیم رضی الدین،حکیم غلام نجف اور حکیم غلام رضا خان وغیرہ کئی ممتاز و معروف شخصیات موجود تھیں۔غالب کی زندگی میں ان حکما کے ماحولی اثرات کا پڑنا تو یقینی تھا ہی،لیکن اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے کی درس گاہوں میں طلباء کو دیگر علوم کے ساتھ ساتھ علم طب سے بھی روشناس کرایا جاتا تھا۔قابل ذکر یہ بھی ہے کہ ان کی رہائش دہلی کے علاقہ بلی ماران اور گلی قاسم جان میں رہی ہے،جو اُس وقت میں حکیم و اطباء کا خاص مرکز ہوا کرتا تھا۔اس صورت میں یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کہ مرزا غالب کی دلچسپی اور رغبت علم طب کی جانب نہ ہو۔یہی سبب تھا کہ اپنی عمر میں بہتر بہاریں دیکھنے والے مرزا غالب نے کئی قسم کی تکالیف و مصائب کی شدت کے باوجود اپنی صحت کا ہر ممکن خیال رکھا۔غوروخوض سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالب کو ایک ایسا مرض تھا،جس سے چھٹکارا پانے اور مکمل طور پر صحت یاب ہونے کے لیے قوی دوا کا استعمال کیا جانا ضروری تھا۔دقت یہ بھی تھی کہ قوی دوا سے مرض تو ٹھیک ہوسکتا تھا،لیکن اس کے دوبارہ لوٹ آنے سے جسم کے دوسرے اعضا پر منفی اثرات پڑنے کا بھی اندیشہ تھا۔کوئی دیگر مرض بھی لاحق ہوسکتا تھا۔اُن کی یہی سوچ انھیں قوی دوا کے استعمال سے مانع رکھتی تھی۔اپنے مرض خاص کے بارے میں غالب خود فرماتے ہیں۔

دَرد منّت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا،بُرا نہ ہوا

مرزا غالب کی زندگی اور کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ راز بھی کسی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا کہ انھیں بھی آخر کار وہی بیماری لاحق تھی،جو کم وبیش دیگر غزل گو شعرا میں عام پائی جاتی رہی ہے۔عشق کے نہایت خوبصورت اور پُرلطف درد دینے والے روگ کو غالب خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔وہ اس مرض کو قلب کی گہرائی میں لگنے والی ایک ایسی آگ بتاتے ہیں،جسے لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی،بلکہ یہ خود بخود لگ جاتی ہے۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آتش عشق کی زیادتی کے سبب وہ زیست کے فرائض سے بھی آنکھ چراتے پائے جاتے ہیں۔ ایسے نامصائب حالات میں وہ خود کو ایک طرح سے ناکارہ اور نکما تصور کرنے سے ہی گریز نہیں کرتے، بلکہ اپنی بے بسی اور لاچاری پر رونے دھونے تک کی نوبت کو بھی صیغۂ راز نہیں رکھتے۔ یہ بات الگ ہے کہ ایسے نمناک اوقات میں بھی وہ عشق کی پاکیزگی کا ہر ممکن اعتراف کرنے سے نہیں چوکتے ہیں۔ غالب کے مندرجہ ذیل اشعار میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز کا بیانیہ موجود ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

عشق کو کبھی روگ اور کبھی دماغ کا خلل بتانے والے مرزا غالب کو اپنے مرض کی دوا نصیب نہیں ہوئی اور اگر ہوئی بھی ہے، تو مرض میں کسی طرح کا افاقہ دکھائی نہیں دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے ماہر اطبا کو آزما کر تھک چکے تھے۔ چونکہ مرض کی زیادتی سے عاجز آ چکے غالب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے مردوں کو زندہ کر دینے کے معجزات سے واقفیت رکھتے تھے، اس لیے اب وہ ابن مریم کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہو گئے۔ اتنے پر ہی بس نہیں، وہ چیلینجنگ موڈ میں آ گئے اور اپنے وقت کے وید اور حکیموں کو للکارتے ہوئے یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ اگر کوئی اس وقت کا ابن مریم ہے، تو فوراً سامنے آ جائے اور جس طرح ہو سکے ان کے دُکھ کا علاج کر کے دکھائے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

عشق کے روگ کو معالجات طبیہ کی کتابوں میں مالیخولیا میں تبدیل ہو جانے کی وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ ایک وسواسی مرض ہے، جس میں عاشق کو معشوق کی تمام تر عادات و خصائل ہر حال میں اچھی اور دلکش معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ انسان کے ہر وقت سوچ و تفکرات میں غرق رہنے کی دیوانگی کی وجہ سے رگوں میں گردش کرنے والا خون جل کر سودا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سبب (فکر) کے قوی ہونے کے بعد مسبب (مرض عشق) بھی طاقتور ہو جاتا ہے اور پھر یہ حالت بڑھتے بڑھتے مالیخولیا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس بابت ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین جلانوی نے 'ماہنامہ حسن وصحت کلکتہ' میں کتاب شرح اسباب، تصنیف علامہ نجیب الدین سمرقندی کے ترجمہ کبیر جلد اول طبع دوم 1924 دفتر المسیح قرول باغ دہلی کا حوالہ پیش کیا ہے:

''عشق مالیخولیا کا نام سبب کے نام پر رکھا گیا ہے۔ مالیخولیا کے لغوی معنیٰ 'سیاہ خلط' کے ہیں اور سیاہ خلط یعنی سودا کے غلبہ اور غیر طبعی مزاج سوداوی کے پیدا ہونے سے چونکہ یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس مرض کا نام مالیخولیا رکھا گیا ہے۔ مالیخولیا میں سوء مزاج سوداوی کے باعث دماغ میں خلل پیدا ہو جاتا ہے جو روح نفسانی کو وحشت میں مبتلا کر دیتا ہے جس کی بنا پر مالیخولیا کا مریض غم کے لیے آمادہ رہتا ہے اور غم پیدا کرنے والے معمولی اسباب بھی اسے غمزدہ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں، چنانچہ اس مرض کا مریض عموماً غمگین رہتا ہے۔ روح نفسانی میں تاریکی اور وحشت کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ روح نفسانی (دماغی روح) روح حیوانی (قلبی روح) سے متصل ہوتی ہے، بلکہ اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بنا پر دماغ تاریک اور مکدر ہو جاتا ہے۔ یہ دماغی تاریکی نفس ناطقہ انسانی میں موثر ہوتی ہے اور نفس ناطقہ کو دماغ کے ساتھ مشارکت حاصل ہے جو سوء مزاج سوداوی (بادیاس) کے غلبہ کے سبب وحشت میں مبتلا رہتا ہے اور وحشت کے ساتھ کمزوری بھی پیدا ہوتی ہے اس لیے کہ سودا کا مزاج (بادیاس) روح کے مزاج (حار رطب) کے برخلاف ہوتا ہے۔''

(غالب اور طب، ماہنامہ حسن وصحت ستمبر 1982 ص 9-8)

مرزا غالب کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عشق کے مرض میں اس حد تک مبتلا تھے کہ اسے مالیخولیا کے درجے میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا عشق عامیانہ نہ تھا، بلکہ بلند کسوٹی پر کھرا اترنے والا تھا۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

دراصل مرزا غالب کے عشق کے مالیخولیا کی حد تک پہنچنے کی وجہ صرف عشق ہی نہیں تھا، دماغی محنت کی زیادتی بھی تھی۔ ایسی کیفیت جس میں خوشی اور شادمانی کی بات پر بھی ہنسنے کو جی نہ چاہتا ہو، حالت ایسی ہو جائے کہ جس میں انسان حواس کھو دے اور اُسے اپنا ہوش تک باقی نہ رہے، مالیخولیا کی واضح علامتوں میں سے ہیں۔ اکثر حکما، علما اور فضلا کو بھی اس قسم کے عارضے سے سابقہ پڑ چکا ہے اور وہ بھی تنہائی پسندی کے شکار رہے ہیں:

''پھر مرزا غالب کے مالیخولیا میں مبتلا ہو جانے کا سبب عشق کے علاوہ دماغی محنت کی کثرت بھی تھی۔ روِش کا قول ہے کہ یہ مرض اکثر حکماء و فلاسفر کو ہو چکا ہے۔ مثلاً افلاطون وغیرہ۔ نیز طبری کا قول ہے کہ میں نے علماء و فضلا کی ایک جماعت دیکھی ہے جنھوں نے تنہائی اختیار کر لی تھی۔ علم کے علاوہ دوسرے مشاغل کو ترک کر دیا تھا جس سے ان کے اخلاط جل گئے تھے۔ اور ان کے مالیخولیا پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً فارابی اور عیسیٰ ابن ماسویہ۔ مرزا غالب بھی چونکہ اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے، لہٰذا وہ بھی مالیخولیا میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایسے مالیخولیا میں کہ جو جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ جیسا کہ ان کے کلام سے واضح ہوتا ہے۔''

(مرزا غالب اور طب، ماہنامہ حسن وصحت، ماہ ستمبر 1982 ص نمبر 9)

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مالیخولیا کے سبب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں سوء مزاج سوداوی ہو جاتا ہے اور دل پر غم و آلام کا سایہ منڈرانے لگتا ہے۔ انسان تنہائی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ دماغ میں خشکی کے بڑھ جانے اور قلب سے سکون کے غائب ہو جانے کی پُر پیچ کیفیت کی وجہ سے مریض کی آنکھوں سے راتوں کی نیند تو اُڑ ہی جاتی ہے، دن کا سکون بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے لیے خوشی اور رنج میں تفاوت کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مرزا غالب کی حالت بھی کچھ کچھ اسی طرح کی ہے۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

عشق کے مالیخولیا میں تبدیل ہو جانے کے بعد غالب کو جہاں دل میں گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ہے وہیں انھیں لوگوں سے وحشت بھی ہونے لگتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ وقت بھی آ جاتا ہے کہ مرزا گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اتنے پر ہی بس نہیں اب غالب ایسی جگہ کی تلاش و جستجو میں لگ جاتے ہیں، جہاں صرف وہ ہی وہ رہیں۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا وہاں آنا جانا

ممکن نہ ہو سکے۔ تنہائی کی اس دنیا میں انھیں نہ تو کسی پڑوسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی کسی شخص سے گفت وشنید کی خواہش باقی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ دل کی گہرائی سے یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ بیماری کی حالت میں تو اُن کی خیر خبر لینے اور تیمارداری کرنے والا کوئی ہو ہی نہیں، موت واقع ہو جانے پر آس پاس کے علاقہ میں کوئی آہ بھرنے یا بین کرنے والا بھی موجود نہ رہے۔ غالب کے ذیلی اشعار میں ان کی آرزو کی مکمل عکاسی موجود ہے۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اطبا کا خیال ہے کہ انسان کے جسم میں طبیعت ہی وہ قوت ہے جس پر بدن کے جملہ امور کی اصلاح وتدبیر کا انحصار رہتا ہے۔ اگر طبیعت درست رہتی ہے تو بدن کے نظام و افعال صحیح سلامت کام کریں گے اور اگر طبیعت میں کسی قسم کا ضعف پیدا ہو جائے گا، تو بدن کا نظام متاثر ہو جائے گا اور پھر افعال بھی درست نہیں رہ پائیں گے۔ چونکہ مرزا غالب بھی ایک انسان ہیں، اس لیے مرض اور اس کی تکلیف کے لگاتار جاری رہنے کی وجہ سے اب وہ صحت و تندرستی کے لیے دواء کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ اب غالب یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو گئے کہ وہ جو بھی دوا لیں، وہ ایسی ہونی چاہیے جو محرک ومقوی ہو اور اعضائے بدن کی کمزوری کو بڑی حد تک دور کر کے حرارت عزیزی کو مشتعل کر سکے۔ اسی تصور میں اُن کی زبان پر یہ شعر آ گیا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالب اپنے وقت کے عالم وفاضل تھے۔ شریعت اور طریقت سے اچھی طرح واقفیت رکھنے کی وجہ سے اُس حدیث کی جانکاری بھی رکھتے تھے، جس کے مفہوم میں کہا گیا ہے کہ ہر مرض کی کوئی نہ کوئی دوا ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کے مرض اور دردِ عشق کی دوا کہیں موجود نہ ہو۔

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم اُلفت ہی کیوں نہ ہو

بدن کا ضعف دُور کر کے قوت وتوانائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غالب یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوا کچھ ایسی ہو جو انھیں پوری طرح سے بے خود بنا دے، تاکہ ترددات اور پریشانیاں قلب وذہن کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکیں۔ آخر کار انھوں نے اس سنگین مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ یونانی محرکات ومقویات میں اچھی طرح غور وخوض کرنے کے بعد دونوں خواص سے بھر پور انھیں صرف اور صرف ایک ہی مرکب پسند آیا۔ حالانکہ مذہبی اعتبار سے اسلام میں شراب نوش کرنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن غالب اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ وہ دختِ رز کا استعمال عیش و نشاط کے لیے نہیں کریں گے، بلکہ بے خودی حاصل کرنے کی غرض سے دوا کے طور پر کریں گے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

شراب کے ذریعے اپنے مرض کا علاج کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے مرزا غالب فرماتے ہیں کہ چونکہ ان کا مزاج بلغمی ہو گیا ہے اور اس کی تعدیل واصلاح کے لیے شراب کا استعمال مفید ثابت ہوا کرتا ہے، اس لیے انھوں نے بغرض علاج دوا کے طور پر مے کے استعمال کو لازم کر لیا ہے۔

حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر (شراب) پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی، اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ دوسرے اُس میں دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے، جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک شعر میں اپنی اس عادت کے ساتھ گلاب کی ترکیب کو بیان کیا ہے:

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے است
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را ''

(ماہنامہ حسن وصحت، کلکتہ، ماہ ستمبر 1982 ص 12)

حالانکہ مرزا غالب نے شراب کا استعمال بدن کی کمزوری اور مالیخولیائی کیفیت سے پریشان وعاجز ہو کر بے خودی کے لیے کیا تھا، لیکن اس سے انھوں نے جہاں خاطر خواہ فائدہ محسوس کیا، وہیں دوسری جانب شدید طور پر نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ شراب کی لت اور اس کے بے جا استعمال سے بدن میں سوداویت بڑھ گئی۔ اس سے خون میں فساد پیدا ہو گیا۔ جسم میں سودا کا فساد بڑھنے سے شبور واورام وغیرہ کئی دیگر امراض پیدا ہو گئے۔ غالب نے اپنے مکتوبات میں ان امراض کا تذکرہ جس طبی انداز سے کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم طب میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ المخاطب بہ میرزا تفتہ کے نام لکھے خطوط میں بیماری کا تذکرہ موجود ہے:

''....ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال باور نہیں، اور کسی نے جو کہہ دیا کہ 'غالب' کے پاؤں کا ورم اچھا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے۔ تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا۔

بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر باراں میں یا پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شراب شبانہ معمولی میں مجرانہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں، بڑے بڑے مینہ برسے، پینا ایک طرف دل میں بھی خیال نہ گزرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی۔ پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا۔ کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں ان کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھرتہ بندھے گا، وہ پکا لائے گا، تب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی۔ تلوا زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامرد بے درد جھوٹا ہے، تو اوس پر ہزار لعنت؛ اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔''

(غالب کے خطوط، باہتمام سید تفضیل حسین، پبلشر انوار بک ڈپو لکھنؤ، خط نمبر 100، ص نمبر 169)

منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھے ایک دوسرے خط میں اپنی عمر اور بیماری کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''....ستر برس کی عمر، آلام روحانی، نہ میں کہوں نہ کوئی باور کرے، امراض جسمانی میں کیا کلام؟ بائیں پاؤں میں مہینہ بھر سے ورم ہے، کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعال دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں...''

(غالب کے خطوط، باہتمام سید تفضل حسین، پبلشر انوار بک ڈپو لکھنؤ، خط نمبر 101، ص نمبر 169)

مرزا غالب کے ذریعے منشی ہرگوپال تفتہ اور چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھے خطوط کے حوالے سے ڈاکٹر حکیم سید محمد کمال الدین حسین جلانوی نے اپنے مضمون، 'غالب اور طب' میں غالب کے عوارض فساد خون میں مبتلا ہونے کی وجہ سے پورے بدن پر جگہ جگہ پھوڑے نکل آنے کی وجہ سے رات ودن پلنگ پر لیٹے رہنے اور پیشاب بار بار آنے کی شکایت سے بروقت نپٹنے کی غرض سے حاجتی کو اپنے پلنگ کے بالکل قریب کر لینے کا تذکرہ کیا ہے:

''.....غالب کے بدن میں سوداء کا فساد بڑھا تو اس سے اورام وشبور پیدا ہوئے۔ اور ساتھ ہی سوداء محرقہ سے گردہ مثانہ کا سوء مزاج حار پیدا ہوا تو اس سے انھیں

سلس البول کا مرض عارض ہوا۔ غالب نے اورام وبثور کی تکلیف سے پریشان ہوکر طبّی اصول علاج کے مطابق رواد عات ومحللات استعمال کیے اور جب ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو پھر پھوڑوں کو پھوڑنے کے لیے نیم کا بھرتہ باندھا اور پھر مرہم اندمال کے لیے استعمال کیا جس سے ان کی طبّی مہارت واضح ہوتی ہے۔''

(ماہنامہ حسن وصحت کلکتہ، ماہ ستمبر 1982 ص نمبر 13)

پاکستان سے شائع ہونے والی کتاب 'ادبی خطوط غالب' میں مرزا محمد عسکری لکھنوی نے مرزا تفتہ کے نام ایک اور خط کے حوالے سے بدن کے زخم اور پھوڑے پھنسیوں کے سبب ہر وقت پلنگ پر پڑے رہنے کے باوجود خطوں کا جواب دینے میں مخل نہیں کرنے کا ذکر کیا ہے۔ خط نمبر 54 صفحہ نمبر 145

''.......میں قریب بمرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرنا اور میرے سب آدمی بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں، وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے۔ سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رام پور اور ایک تم ان کی اصلاح رہ گئی۔

(ادبی خطوط غالب، مرزا محمد عسکری لکھنوی، مبارک بک ڈپو کراچی، پاکستان خط نمبر 54 ص نمبر 145)

مرزا غالب نے میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو 24 نومبر 1834 کو لکھے خط میں اپنی بیماری کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''......مگر کیا کروں کہ مجھ میں دم ہی نہ تھا۔ کاش کہ جب ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔ میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خونچکاں ایک درجن بھالے لگ جاتے تھے۔ جسم میں جتنا لہو تھا، پیپ ہوکر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے، وہ کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں سے اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔

معہذا متورم ہیں۔ جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا، مگر یہ میرا شعر۔

درکشا کش ضعفم نہ گسلد رواں از تن
اینکہ من نمی میرم ہم زنا توانی ہاست''

(ادبی خطوط غالب، مرزا محمد عسکری لکھنوی، مبارک بک ڈپو کراچی، پاکستان خط نمبر 95 ص نمبر 193)

مرزا غالب نے بیماری کے سبب موت سے متعلق اس حقیقت کو بھی فراخ دل سے قبول کیا ہے کہ دُنیا میں آنے والے ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے۔ مرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی روح بدن سے مفارقت کر جائے۔ اس کے لیے حرکت کی ضرورت ہے۔ اور ہر حرکت اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہے، جب بدن میں طاقت موجود ہو۔ اب چونکہ بدن میں یہ طاقت باقی نہیں رہی، اس لیے اب روح بھی بدن سے نہیں نکل سکتی۔ اس کا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ اب غالب اپنی ناطاقتی اور کمزوری کی بدولت ہی زندہ ہیں۔

اسی طرح غالب نے شہزادہ بشیر الدین کو لکھے مکتوب میں اپنی جسمانی کمزوری، اعضا کی بوسیدگی اور لاچارگی کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

''پیر و مرشد سلامت: اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح ان میں دوڑتی نہیں پھرتی مگر ابھی مفارقت نہیں کر گئی۔ خدا جانے کس ممکن میں ہے۔ اعضا نکمے ہو گئے۔ اب وہ کلام جوان سے متعلق تھے بند ہو گئے......''

(ادبی خطوط غالب، مرزا محمد عسکری لکھنوی، مبارک بک ڈپو کراچی، پاکستان خط نمبر 77 ص نمبر 167)

مرزا غالب اپنی بیماری اور پریشانیوں کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے تھے، بلکہ موقع بہ موقع عزیز واقربا میں بھی ان کا تذکرہ کیے بغیر سکون سے نہیں رہتے تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے پیٹ میں پیدا ہونے والے سخت قسم کے اُس جان لیوا درد کو کسی پر ظاہر نہ کریں، جس میں زندگی کی امید تک باقی نہ رہی تھی۔ مرزا تفتہ کو تحریر کیے ایک خط میں بُخر شدید اور پھر اس کی وجہ سے پیدا ہوئے درد قولنج کا ہی ذکر نہیں کیا، بلکہ اس کے علاج وافاقے کو بھی بیان کیا ہے۔ ''بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ توقع زیست کی نہ رہی قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارہ افشردہ اس پر مدار رہا۔ کل سے خود مرگ گیا ہے۔ صورت زیست کی نظر آئی۔''

مرزا غالب کے ذریعے مرزا تفتہ کو لکھے گئے خط سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے مرض قولنج کی تشخیص ہی نہیں کی بلکہ روگ سے خلاصی کے لیے اس کی دوا بھی خود تجویز کر لی۔ مرض کی نوعیت کے مطابق پرہیز کرنے میں بھی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی۔ اتنا ہی نہیں اصولِ طب کے نظریے سے صحت کی حفاظت کے لیے بوقتِ ضرورت یا پھر سوداویت سے آنتوں کو پاک و صاف کرنے کی غرض سے مسہل کا سہارا بھی لیا۔

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز بن حاضر ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح کی کاوش صرف شاعر نہیں کر سکتا۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب شاعر کو طب کا علم بھی ہو۔ مرزا غالب، چونکہ ایک ماہر طبیب بھی تھے، اس لیے انھوں نے مرضِ سودا سے نجات کے لیے مسہل یعنی دست آور دوا کا استعمال کیا۔ بدن میں فسادِ خون کے غلبہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے لیے کم سے کم تین مسہل لینے کو لازمی قرار دیا۔ غور طلب ہے کہ مسہل لینے کے لیے مسہل سے پہلے منضج یعنی مواد کو پکا کر قابلِ اخراج کرنے والی دوا کے استعمال اور پھر مسہل کے بعد تبرید یعنی مسہل کے بعد اس کی حرارت کو دُور کرنے کے لیے دیے جانے والے مشروب یا دوا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر دو مسہل کے دوران کچھ وقفہ اور مریض کے لیے آرام بھی لازمی ہے۔ غالب کی طبّی مہارت کے لیے یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے عارضۂ قلب کے لیے جواہر مہرہ کا وہ نسخہ تجویز کیا، جس کا جزو اعظم کشتۂ الماس تھا۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

حالانکہ مرزا غالب کے دیوان اور مکتوبات کی طرح علم طب سے متعلق ان کے ذریعے تحریر کی گئی کوئی کتاب یا دستاویز تو دستیاب نہیں ہے، لیکن ان کے ذریعے قلمبند کیے گئے کتنے ہی اشعار اور دوست واحباب کو لکھے گئے خطوط کی روشنی میں یہ بات وضاحت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو علم طب سے صرف واقفیت ہی نہیں، بلکہ طب کے شعبے میں کسی قدر مہارت بھی حاصل تھی۔

■

M.A. Kanwal Jafri
127/2, Jama Masjid
NEENDRU, Tehsil Dhampur
Distt.: Bijnor - 246761 (UP)
Mob.:09917767622

غلام محمد انصاری

گجرات میں اردو غزل 1950 کے بعد

دنیا میں کسی بھی زبان میں ذریعۂ اظہار کسی مخصوص طبقے یا گروہ کا محتاج یا پابند نہیں رہا۔ جس نے اپنا انداز بیاں پیدا کیا وہ تحریر کرتا چلا گیا۔ اس لحاظ سے گجرات کو دیکھا جائے تو ہر طبقے کے لوگوں نے اردو میں شاعری کی ہے یا اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اس میں اقتصادی پیمانے پر اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا بھی شمار ہوتا ہے اور ایک مل مزدور کا بھی جن کی مشق سخن بھی جاری رہی اور مل کی مزدوری ومشقت بھی۔

جغرافیائی حالات، سماجی حالات اور سیاسی حالات میں جو تبدیلیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ ان کا سیدھا اثر ہماری زندگی پر رونما ہوتا ہے اور اسی کے تحت ہماری زندگی میں نئی سوچ، نئی تبدیلی، نئے تغیرات اور زندگی گزارنے کے نئے پیمانے داخل ہوتے ہیں۔ جب ہماری روزمرہ کی زندگی تجربات سے روشناس ہوتی ہے تو وہ تجربات ایک عام آدمی کے ذہن اور اس کی زبان سے لے کر ادیبوں کی تحریروں میں بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

1950 کے بعد گجرات میں مختلف ذرائع سے کیے گئے اظہار رائے کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی زندگی کے متاثر کن عنوانات کو مختلف پیمانے پر ادیبوں نے اپنا ذریعۂ اظہار بنایا ہے اور ان ذرائع اظہار میں اگر یہ کہا جائے کہ 'غزل' نے سب سے زیادہ عوام کو متاثر کیا ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

جہاں تک 1950 کے بعد کی اردو غزل اور گجرات کا تعلق ہے تو سب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ معاملہ 67 سال پر محیط ہے۔ اس دوران بہت کچھ بدلا، بہت کچھ نیا محسوس ہوا۔ 1950 کے بعد کے دور کو ایک طرح سے 'آزادی یعنی 1947 کے بعد' ہی سے تصور کیا جائے گا۔ اس دوران آزادی کی جدّ وجہد میں شریک ہو کر ایک نسل اپنے تجربات اور اظہار کے ساتھ بوڑھی ہو چکی تھی، دوسری نسل پروان چڑھ رہی تھی، ہاں مگر دیر تک دونوں نسلوں پر ملک کی آزادی کا معاملہ اور اس سے پیدا ہونے والے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات حاوی تھے۔ ان تجربات کو لے کر جب گجرات ذرا سا آگے بڑھا تو اس کی آزادی کا معاملہ پروان چڑھا، نتیجتاً 1 مئی 1960 کو گجرات نے بھارت میں ایک خودمختار صوبے کی حیثیت اختیار کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ادیبوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی۔ جس نے غزل کے علاوہ دوسرے کئی ذریعہ اظہار کو سامنے رکھا، حالانکہ 'غزل' تب بھی اتنی ہی مقبول تھی اور اس کے بعد بھی اور آج بھی اتنی ہی مقبولیت رکھتی ہے۔ یہاں سے اگر یہ کہا جائے کہ گجرات میں بھی جدید اردو شاعری نے اپنے قدم جمائے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت اور اب تو غزل اس سے بہت آگے نکل گئی ہے۔

جہاں تک گجرات کی اردو غزل کی بات ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ صوبائی ادیبوں نے جہاں ایک طرف برسات کی رم جھم پھواروں میں ذہن کو بھگو کر اپنا کلام کہا ہے تو دوسری طرف شدید گرمیوں کی کڑی دھوپ میں بھی وہ تھکے ہارے نہیں بلکہ اپنی منزل کی سمت بڑھتے ہی رہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ گجرات کی اردو شاعری نے بھی نہ صرف ملک گیر پیمانے پر بلکہ عالمی پیمانے پر اپنا اثر دکھایا تو غلط نہ ہوگا، مزید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ 1950 کے بعد گجرات کے بیشتر اردو شعرا نے اردو ادب میں باقی رہنے والی شاعری کی ہے۔

دنیا میں کسی بھی زبان میں ذریعۂ اظہار کسی مخصوص طبقے یا گروہ کا محتاج یا پابند نہیں رہا، جس نے اپنا انداز بیاں پیدا کیا وہ تحریر کرتا چلا گیا۔ اس لحاظ سے گجرات کو دیکھا جائے تو ہر طبقے کے لوگوں نے اردو میں شاعری کی ہے یا اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ اس میں اقتصادی پیمانے پر اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا بھی شمار ہوتا ہے اور ایک مل مزدور کا بھی جن کی مشق سخن بھی جاری رہی اور مل کی مزدوری ومشقت بھی۔

احمد آباد کے علاوہ سورت، بڑودہ، بھروچ، پالن پور، جام نگر، نوساری، مہسانہ، داہود، پیٹلاد، جونا گڑھ، کھمبات، بھروچ، جمبوسر اور آمود پر مشتمل کئی اضلاع گجرات میں شعر وسخن کا مرکز رہے۔ یہاں سے بیشتر شعرا کے قابل قدر مجموعے بھی شائع ہوئے جنھیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا جاتا رہا ہے۔

گجرات چونکہ ہزاروں سال سے بھارت کا ایک اہم تجارتی مرکز رہا ہے اس لیے یہاں ملک اور بیرون

ملک کے مختلف لوگوں کا آنا جانا رہا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو گجرات میں بھارت کے مختلف صوبوں کے لوگوں نے آ کر یہاں نہ صرف قیام کیا بلکہ گجرات ہی کو اپنا گھر بنا لیا، اس میں اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، راجستھان کے علاوہ ملک کے دیگر صوبوں کے لوگوں نے بھی آ کر یہاں قیام کیا اور اپنی روزی روٹی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا شعری سفر بھی شروع کیا۔ حالانکہ کہ یہ آمد 1950 سے پہلے بھی رہی اور اس کے بعد بھی نیز اب بھی جاری ہے۔

1950 کے بعد گجرات سے جو شاعری اور شعر فہمی چھن کر آتی ہے وہ بڑی خوبصورت اور پر کشش ہے۔ اُس نے زندگی کو ایک الگ انداز سے دیکھا ہے، پرکھا ہے اور اُس سے جو نچوڑ سامنے آیا ہے وہ ملک کے کسی بھی شاعر کے شعر کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے خلش بڑودوی کا ایک شعر پیش خدمت ہے جس میں زندگی کے سرد و گرم تجربات کو نہایت قریب سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور میرا ماننا ہے کہ 1950 کے بعد جس پل صراط سے گجرات میں اردو غزل گزری ہے یہ شعر اس کی بھر پور نمائندگی کرتا ہے۔

دل لگانا بُرا نہیں لیکن
لوگ ملتے نہیں طبیعت کے

کیا یہ شعر کبھی مر سکتا ہے؟ اس قدر آسان اور سلیس زبان و انداز سے کہا گیا شعر اردو غزل میں اپنے آپ اپنا مقام بنا لیتا ہے۔ اور اُس خیال خام کو رد کرتا ہے کہ گجراتیوں کی اردو اچھی نہیں ہوتی۔ اردو شاعری میں ایک بڑی تعداد میں اشعار زندہ رہے اور ضرب لامثال بنے۔ خلش بڑودوی کا یہ شعر بھی ایسا ہی ہے جو ذہن میں کسی پلاننگ، سابقہ منصوبہ بندی اور دانستہ کوشش کے بغیر یاد رہ جاتا ہے۔ بڑی، سخت اور مشکل بحروں کے علاوہ آسان اور چھوٹی بحروں میں بھی گجرات میں عمدہ شاعری ہوئی ہے۔ میں اس خیال اور منصوبہ بند طریقے سے پھیلائی گئی غلط فہمی کو بھی رد کرتا ہوں کہ 1950 کے بعد سے شاعری اور غزل کے نام پر گجرات سے صرف ایک یا دو یا چند نام ہی لیے جا سکتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ اردو غزل کو لے کر ایک بڑی تعداد اچھے شعرا کی دکھائی دیتی ہے جو اپنے آپ میں ایک اپیل رکھتی ہے اور اس بات کی منتظر رہی کہ کبھی اُن پر صرفِ قلم کیا جائے۔ مگر انھیں دانستہ طور پر پروجیکٹ نہیں کیا گیا۔ لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا، ان شعرا کا کہا گیا کلام اپنی ایک دنیا رکھتا ہے اور اس بات کا پورا یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن اپنی بھر پور طاقت کے ساتھ سامنے آئے گا۔

1950 سے 1980 کے دوران گجرات کے جو شعرا اپنی جانب متاثر کرتے ہیں اُن میں فخرِ گجرات جناب فخر احمد آبادی، کلیم احمد آبادی، راز صدیقی شاہجہاں پوری، حکیم بشیر احمد خاں زخمی احمد آبادی، خلیل احمد آبادی، حزیں قریشی، محمد نظیر نصیری فیض آبادی، کامل چشتی احمد آبادی، وحید بناری، عیسیٰ خاں نشتر، عاشق جونپوری، خداداد خاں وحشی، عادل دہلوی، ضیا ناگوری، مرزا کوثر بیگ، منشی نسیم احمد صدیقی کامل امروہوی، زوّار حسین احمر، قمر احمد آبادی، خیال قریشی، بیکل جونپوری، تاج ٹونکی، کامل جونپوری، شاطر اصلاحی، محمود مائل، شور الہ آبادی، نادم اندوری، شمس قریشی اور رحمت امروہوی، اثر احمد آبادی، سرشار بلند شہری، فنا پرتاپ گڑھی نیز نفیس دھامپوری کا شمار ہوتا ہے۔ اس دوران اور بھی قابل قدر شعرا ہیں جن کے نام اور کلام تک تادمِ تحریر رسائی نہ ہو سکی۔

1950 کے بعد گجرات کی شاعری اعتماد سے بھر پور ہے اور اپنے اندر ایک وسیع اور سوچنے پر مجبور کر دینے والا تجربہ رکھتی ہے۔ غزل میں متعدد شعرا نے نہایت صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ انھی استاد شعرا میں ایک معتبر نام خداداد خاں وحشی کا آتا ہے۔ ان کا شعر دیکھیے اور سوچیے کہ زندگی کی کڑوی سچائی کو کس سلیقے سے اور کس ہنر مندی پر مشتمل دعوے کے ساتھ انھوں نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ شعر دیکھیں۔

یا تو دیوانہ ہنسے یا وہ جسے توفیق دے
ورنہ اس دنیا میں رہ کر مسکرا سکتا ہے کون

کچھ اشعار تو ایسے نکل کر سامنے آتے ہیں جو پر زور طریقے سے غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان اشعار کو اردو ادب میں کہیں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں استاد شاعر شور الہ آبادی کا شعر دیکھیں اور محسوس کریں کہ کسی چیز کی تعمیر کتنی مشکل سے ہوتی ہے۔

خوں کتنی بہاروں کا پیا نوکِ قلم نے
تب جا کے کہیں آپ کی تصویر بنی ہے

1950 کے بعد گجرات کی بہترین اردو شاعری میں اس شعر کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

شیشے اور پتھر کے استعارے اردو شاعری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ شمس احمد آبادی کے یہاں بھی ان کا برمحل استعمال ہوا ہے۔ اس شعر میں انھوں نے اپنی ایک پوزیشن اور اپنے ساتھ ہوئے کھلواڑ کو جہاں پیش کیا ہے وہیں اپنے خدشات کا اظہار بھی نہایت سلیقے سے کیا ہے۔ شعر دیکھیں۔

اب مجھے نیند میں پہنا دیا شیشے کا لباس
کوئی مارے نہ صداؤں کے نکیلے پتھر

اسی سلسلے کی ایک اور کڑی، استاد شاعر محمد نظیر نصیری فیض آبادی کی ایک غزل کے تین اشعار میں پیش کرنا چاہوں گا، مجھے پوری امید ہے کہ یہ اشعار آپ کو بور نہیں کریں گے بلکہ غزل کیا ہوتی ہے اور غزل کس سلیقے سے کہی جاتی ہے اُس کیفیت سے آپ آشنا ہوں گے۔ اردو غزل میں لمبے عرصے تک جو روایت برقرار رہی، جو کہنے کا انداز رہا اور جو اُس کی فریم رہی اُس فریم میں رہ کر پورے اعتماد کے ساتھ غزل کہی گئی ہے۔ غالب کی غزل پر غزل کہنا اور وہ بھی کامیابی کے ساتھ یہ بھی ایک بڑی بات ہے۔

خوں رگوں میں ہے ابھی جتنا بھی چاہے لے لے
پاؤں ہو جائیں گے محتاج حنا میرے بعد
بجلیوں کی ہے اُچھل کود مرے جینے تک
پھوٹ کے روئے گی ساون کی گھٹا میرے بعد

کسی کے شعر پر شعر کہنا ایک بات ہے اور غالب کے شعر پر شعر کہنا دوسری بات ہے۔ یہاں نصیری فیض آبادی نے پورے احتجاج کے ساتھ نہ صرف شعر کہا ہے بلکہ مقطع کا شعر کہتے ہوئے غالب کو ایک طرف سوالات کے گھیرے میں کھڑا کر دیا ہے تو دوسری طرف اس قربانی کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو بلا شرط پیش بھی کر دیا ہے۔ اس طرح گجرات سے اردو شاعری کو اپنا ایک یادگار اور باقی رہنے والا مقطع بھی دیا ہے۔ شعر دیکھیں۔

گجرات چونکہ ہزاروں سال سے بھارت کا ایک اہم تجارتی مرکز رہا ہے اس لیے یہاں ملک اور بیرون ملک کے مختلف لوگوں کا آنا جانا رہا. اس لحاظ سے دیکھا جائے تو گجرات میں بھارت کے مختلف صوبوں کے لوگوں نے آکر یہاں نہ صرف قیام کیا بلکہ گجرات ہی کو اپنا گھر بنا لیا. اس میں اترپردیش, بہار, مدھیہ پردیش, مہاراشٹر, راجستھان کے علاوہ ملک کے دیگر صوبوں کے لوگوں نے بھی آکر یہاں قیام کیا اور اپنی روزی روٹی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا شعری سفر بھی شروع کیا.حالانکہ کہ یہ آمد 1950 سے پہلے بھی رہی اور اس کے بعد بھی نیز اب بھی جاری ہے.

1950 کے بعد گجرات میں اردو شاعری اپنے عروج پر رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس میں ایک نیا چیپٹر داخل ہوا۔ کچھ نئے تجربات کے ساتھ ایک ایسا خمیر تیار ہوا جس نے جدید شاعری کو جنم دیا۔ ملک اور بیرونِ ملک میں جاری اس تحریک کا گجرات پر بھی معقول اثر ہوا اور یہاں بھی دیگر زبانوں، بالخصوص گجراتی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی جدید شاعری نے آنکھیں کھولیں۔

ہے نصیری کا مکاں کیسے کہا غالب نے
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

بارہا ایک سے ہونے والے تجربات آدمی کو تھکا دیتے ہیں اور کبھی کبھی وہ ایک ایسے تجربے سے ہمکنار ہوتا ہے، جس کا علاج ممکن نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا نادم اندوری کی طرح ایک عام آدمی کے پاس یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ

جانور کے کاٹ لینے کا تدارک ہے مگر
آدمی کو آدمی کھائے تو اس کا کیا علاج

ہر شاعر نے ہمیشہ چوٹ کھائی ہے اور چوٹ کھانے کے بعد ہی اس کی شعری دنیا میں ندرت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن چوٹ کھانے کا تجربہ کیا ہوتا ہے اگر اس کی تحقیق کی جائے تو نفیس دھام پوری کا یہ شعر ہماری تلاش کا جواب بن سکتا ہے۔ ایک تجی بات کتنی خاموشی کے ساتھ انھوں نے کہی ہے۔ شعر دیکھیں۔

یہ بتا سکتے ہیں محسوس ہی کرنے والے
چوٹ لگتی ہے کہاں درد کہاں ہوتا ہے

1950 کے بعد گجرات میں اردو شاعری اپنے عروج پر رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس میں ایک نیا چیپٹر داخل ہوا۔ کچھ نئے تجربات کے ساتھ ایک ایسا خمیر تیار ہوا جس نے جدید شاعری کو جنم دیا۔ ملک اور بیرونِ ملک میں جاری اس تحریک کا گجرات پر بھی معقول اثر ہوا اور یہاں بھی دیگر زبانوں، بالخصوص گجراتی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں بھی جدید شاعری نے آنکھیں کھولیں۔ حالانکہ اردو شاعری میں بہت پہلے سے اس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی مگر پوری طرح سے کھل کر اور غزل کی حد بندیوں نیز اُس کے مرتب لوازمات اور فریم سے سیاسی اور سماجی حالات نے باہر نکلنا ناگزیر کر دیا لہٰذا جدید شاعری کا انداز سامنے آیا۔

روایتی لب و لہجہ اور اندازِ فکر سے ہٹ کر جب گجرات میں اردو شاعری ہونے لگی تو اُس میں سب سے بڑا نام محمد علوی کا سامنے آیا۔ محمد علوی کے ساتھ ساتھ کچھ اور شعرا نے جدید شاعری کا دامن سنبھالا اور اردو شاعری کو نئے تصورات سے روشناس کرایا۔ اس قبیل سے گجرات سے جو نام اُبھر کر سامنے آئے اُن میں محمد علوی اور عادل منصوری کے ساتھ ساتھ رشید افروز، قیوم کنول، جینت پرمار، چینو مودی ارشاد، ریاض لطیف، تنویر صدیقی اور صادق نور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان شعرا نے آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ جدید اردو غزل کو بھی اپنے ہنر سے اپنے کینوس پر پھیلایا اور اسے ایک نئی امیج بخشی۔ اس ضمن میں محمد علوی ایک ایسا کامیاب نام رہا جس پر ملک اور بیرونِ ملک کے تقریباً تمام بڑے ادیبوں نے نہ صرف اپنی توجہ دی بلکہ نہایت خلوص کے ساتھ مضامین بھی لکھے اور اردو کی جدید شاعری میں محمد علوی کا مقام قبول بھی کیا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ گجرات اردو ساہتیہ اکادمی نے محمد علوی کو گورو پرسکار سے بھی نوازا۔

محمد علوی نے نہایت قریب کی اور دوٹوک انداز میں غزلیں کہیں۔ جو ہماری سماعت سے ٹکرانے کے ساتھ ہی ہمیں ایک خوشگوار تجربے کا احساس دلاتی ہیں۔ محمد علوی کی ایک غزل کے دو شعر دیکھیں۔

کبھی تجھ سے ایسا بھی یارانہ تھا
مصلّے سے اُٹھنا گوارا نہ تھا
بہت خوش ہوئے آئینہ دیکھ کر
یہاں کوئی ثانی ہمارا نہ تھا

محمد علوی کے ساتھ ساتھ ایک بڑا نام عادل منصوری کا بھی اُبھر کر سامنے آیا۔ حالانکہ ان دونوں کی گھریلو زبان گجراتی تھی اس کے باوجود اردو میں زندہ رہنے والی شاعری کی، غزلیں کہیں۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اہلِ زبان ہونا ہی بڑی بات نہیں ہوتی۔

عادل منصوری جتنا بڑا نام اردو شاعری میں ہے اُتنا ہی بڑا نام گجراتی شاعری میں بھی ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ عادل منصوری آج بھی گجراتی نصاب میں شامل ہیں۔ گجراتیوں نے انھیں بہت پیار دیا۔ اس موقعے پر گجراتی کا ایک نہایت خوبصورت مصرع میں ضرور پیش کرنا پسند کروں گا جس نے گجراتی زبان کو ایک نئی سوچ، ایک نئی سمت اور ایک نیا احساس بخشا اور وہ مصرع یہ رہا کہ ''ندی نی ریت ماں رمتو نگر ملے نہ ملے'' حالانکہ یہاں مجھے ان کی اردو غزل پر بات کرنی ہے۔ شعر دیکھیں۔

جو چپ چاپ رہتی تھی دیوار پر
وہ تصویر باتیں بنانے لگی

بسمل کی تڑپنے کی اداؤں میں نشہ تھا
میں ہاتھ میں تلوار لیے جھوم رہا تھا
کیوں چلتے چلتے رُک گئے ویران راستو!
تنہا ہوں آج میں ذرا گھر تک تو ساتھ دو
گھر سے میرے قدم جو گلی کی طرف بڑھے
دروازے پوچھنے لگے صاحب کدھر چلے

جدید شاعری اور غزل میں یہ بھی ہوا کہ عوام کی بات عوام کے لب و لہجہ میں کی گئی۔ بہت بھاری بھرکم الفاظ اور محاورات کا استعمال نہیں کیا گیا۔ نہایت صاف اور سلیس زبان جو بدلتے وقت کے ہمراہ اپنے انداز میں ڈھلتی چلی گئی۔ اُس نے اپنے ایک نئے مزاج کا احساس دلایا۔ حالانکہ اس نئے اندازِ فکر کے سامنے پُرکھوں کی شاعری کو بالکل بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی یہ کبھی ممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جدید رنگ میں کہنے والوں کو طعنوں اور دل شکنی کا شکار بھی ہونا پڑا اور اُنھیں جل بھُن کر 'جدیدیئے' بھی کہا گیا۔ مگر یہ سلسلہ رُکا نہیں اور قیوم کنول نے کچھ اس انداز میں اپنا جدید رنگ دکھایا۔

میرے سائے سے کترا کر گیا ہے
ترا احساس کب سے مر گیا ہے
زنجیر میرے نام کی کھینچی گئی جہاں
تعریف کی ٹرین وہیں پر ٹھہر گئی
حال اس کا چلو پوچھیں کہ آج اس کی طرف سے
کیوں اپنی طرف کوئی بھی پتھر نہیں آیا

قیوم کنول نے جدید رنگ میں زیادہ تر اپنی بحریں پیدا کیں اور اُن آسان یا مشکل بحروں میں جدید شاعری کو ایک امتیاز بخشا۔ یہ اور بات ہے کہ بہت کم لوگوں نے قیوم کنول کا مطالعہ کیا ہے بلکہ دانستہ دامن بچا کر نکل گئے۔ 1950 کے بعد گجرات کی اردو غزل اور اردو شاعری نے جہاں بہت سے تجربے کیے وہیں اس کے ساتھ اس طرح کا سوتیلا پن بھی جاری رہا۔ اس کے سبب دانشوروں کے سامنے ملک گیر پیمانے پر گجرات کی اردو شاعری کی صحیح اور واضح صورت سامنے نہ آسکی۔

چینو مودی ارشاد، گجراتی کا ایک بہت معتبر نام ہے۔ انھوں نے گجراتی زبان کی تقریباً ہر صنف پر کام کیا ہے، بہت سارے ایوارڈز آپ کے حصے میں آئے اور بہت سارے ایوارڈز اب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ چینو مودی کے مختلف کاموں پر کئی لوگوں نے پی ایچ ڈی کی ہے۔ رہی بات اردو غزل کی، تو بچپن میں چینو مودی کو اردو اور فارسی پڑھنے کا موقع ملا، اس لیے کہیں نہ کہیں ایک شاعر ہونے اور زبان کو قریب

سے جاننے کے ناطے آپ نے اردو میں بھی شاعری کی۔
چینو مودی کے تعلق سے ندا فاضلی نے لکھا کہ ''چینو مودی ارشاد کی غزل میں دونوں زبانوں کے ملاپ نے جو فضا سازی کی ہے وہ اُس اردو میں کم کم ہی نظر آتی ہے جس کی وراثت عوامی امانت سے محروم ہے۔ میں اردو دنیا میں ارشاد اور ان کی غزل کا استقبال کرتا ہوں۔'' جبکہ وارث علوی نے لکھا کہ ''چینو مودی کا اردو شعرا کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ عادل اور علوی کے ساتھ گہری دوستی رہی ہے۔ ظفر اقبال کے کئی شعر اُسے یاد ہیں۔ اردو غزل کی طرف چینو مودی کا آنا بالکل فطری بات ہے۔'' چینو مودی کے چند جدید شعر دیکھیں۔

بے لگام گھوڑوں کی ہنہناتی آوازیں
رت جگے مسافر کی نیند کو کچلتی ہیں

آپ کو وعدہ رہا ارشاد کا
میں ملوں گا نیک دل انسان میں

کب دھڑکنا چھوڑ دے گا کیا پتہ
اب گھڑی چابی سے وابستہ نہیں

چینو مودی کے ہمراہ اردو شاعری میں ایک اور نام حنیف ساحل کا سامنے آیا۔ گجراتی زبان پر مکمل دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی کامیاب شاعری کی۔ مگر حنیف ساحل کے یہاں کلاسیکل رنگ اور اپنے اندر ایک برق رفتار اپیل رکھنے والا اندازِ بیاں ملتا ہے۔ خوبصورت بحروں میں انھوں نے نہایت خوب صورت اور دلکش غزلیں کہی ہیں۔ اردو میں غزلوں کے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے شعر دیکھیں۔

قصہ گو سے خوش بیانی مانگ لے
تیری اپنی ہے کہانی مانگ لے

آج وہ تجھ پر مہرباں ہے بہت
قربتوں کی جاودانی مانگ لے

جدید شاعری کے ساتھ ساتھ گجرات میں کلاسیکل اور روایتی رنگ میں کہنے والوں کی ایک کھیپ بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ان میں کئی معتبر نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن میں خلیل دھنتیجوی، جمال قریشی، خواجہ سنبھلی، مختار جونپوری، کفیل احمد آبادی، اسماعیل خالدی صاحب، ایم کے ارمان، نظر سورتی، عمر انصاری، وسیم ملک، منظر نوساروی، ڈاکٹر سیّد علی ندیم، ڈاکٹر انجنا سندھیر، شبنم انصاری، عباس دانا، عقیل شاطر، مظہر رحمٰن، شکیل اعظمی، انیس منیری، وفا جونپوری کے علاوہ سامر کھتری اور ہرش برہم بھٹ کا ایک بڑا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ واضح رہے کہ گجرات میں غزل کہنے والے شعرا کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔

جہاں تک رحمت امروہوی کا تعلق ہے۔ رحمت صاحب بڑی نفاست سے شعر کہتے رہے۔ زیادہ تر انھوں نے غزلیں ہی کہیں۔ پرانی وضع قطع کے مالک تھے۔ بات چیت کا لب ولہجہ بھی نرالا پایا تھا۔ 'اضافہ' نامی شعری مجموعہ ان کا کافی مقبول ہوا۔ اپنے تجربوں کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ ان کے چند اشعار دیکھیں۔

جدا ہوئے تو پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا
جو مل گئے تو پھر ٹوٹ کر ملے بھی بہت

تھک گیا دُعا کر کے دستِ بے دعا دیکھوں
کوئی پھل گرے شاید، شاخ کو ہلا دیکھوں

شعلوں کے درمیاں مرا گھر مدّتوں رہا
میں حادثوں سے سینہ سپر مدّتوں رہا

گجرات سے دکھائی دینے والی ایک لمبی فہرست کے درمیان ہمیں ایک چمکتا ہوا نام خلیل دھنتیجوی کا دکھائی دیتا ہے۔ خلیل دھنتیجوی پوری طرح سے غزل کے شاعر ہیں۔ تعلیم صرف چوتھی جماعت تک آپ کو حاصل ہوسکی مگر اب تک چار طلبا آپ کے گجراتی ادب پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں نے ان کا لوہا منوایا ہے۔ گجراتی کے علاوہ خلیل دھنتیجوی اردو ادب میں بھی ایک معتبر نام ہے۔ نہایت مخصوص آواز اور انداز کے مالک ہیں۔ ان کا ایک ہی شعر آپ کے مزاج کا رنگ بدل کر رکھ دے گا۔ شعر دیکھیں۔

اپنے کھیتوں سے بچھڑنے کی سزا پاتا ہوں
اب میں راشن کی قطاروں میں نظر آتا ہوں

اردو دنیا کے علاوہ فلم انڈسٹری میں بھی آپ کا یہ شعر کافی مشہور رہا ہے۔ لہٰذا 1950 کے بعد ہم جس اردو غزل کی بات کر رہے ہیں، اس میں سے کیا خلیل دھنتیجوی کے اس شعر کو رد کیا جانا ممکن ہے؟ کیا ایک لمبی اور تھکا دینے والی شاعری کے بعد خلیل دھنتیجوی کا یہ شعر اردو دنیا کو ایک نیا احساس اور ایک نئے تجربے سے ہمکنار نہیں کراتا؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو یہ ماننا ہوگا کہ 1950 کے بعد گجرات میں بھی عمدہ شاعری ہوئی ہے۔

اسی سلسلے کا ایک اور یادگار نام ہے اثر احمد آبادی، پیشے سے مدرس رہے، بچّوں کے لیے اردو دنیا میں باقی رہنے والی نظمیں لکھیں۔ 'آئی سبزی والی' اور اثر احمد آبادی اگر یہ کہا جائے کہ ایک دوسرے کے 'پریائے' بن گئے تو غلط نہ ہوگا۔ اثر احمد آبادی خالص غزل کے شاعر تھے۔ آپ نے کافی تعداد میں قوالوں کے لیے بھی غزلیں کہیں مگر قوالوں کے لیے لکھنے سے کوئی بڑا نہیں ہو جاتا۔ اردو غزل کے نام پر اثر احمد آبادی نے جو بھی کلام کہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ نہایت سیدھا اور سدھا ہوا لہجہ اثر احمد آبادی کے حصّے میں آیا۔ ہاں مگر اس کا افسوس رہے گا کہ اثر احمد آبادی کے ساتھ بھی ناانصافی ہوئی اور وہ شخصیتوں کی طرح خاطر میں نہیں لایا گیا۔ ان کے چند اشعار دیکھیں۔

میری مستی پہ زمانے کے ہیں پہرے کتنے
میں ہنسوں گا تو اُتر جائیں گے چہرے کتنے

اے اثر طنز بھی تیروں کی صفت رکھتے ہیں
دل پہ لگتے ہی اُتر جاتے ہیں گہرے کتنے

قلم، کاغذ اور دوات کی دنیا ہی ایک تخلیق کار کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ اردو شاعر میں 'قلم' پر بے شمار خوبصورت شعر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مگر اثر احمد آبادی کا یہ شعر جو اثر دکھاتا ہے وہ بات دوسرے شعروں میں نظر نہیں آتی۔ اثر نے اپنے لیے 'قلم' کا نہایت ایماندارانہ تصور کیا ہے اور ایک تخلیق کار کی زندگی کی نمائندگی کی ہے۔ بڑی صاف گوئی سے وہ کہتے ہیں کہ

دار و مقتل کو سجانے کی ضرورت کیا ہے
میرے ہاتھوں سے قلم چھین لو مر جاؤں گا

اور اس کیفیت کے بعد ایک شاعر اور کتاب سے لگاؤ کی بنا پر وہ یوں گویا ہوتے ہیں کہ

مجھ کو دنیا سے اثر کون مٹا سکتا ہے
میں تو شاعر ہوں کتابوں میں بکھر جاؤں گا

اس سلسلے میں اگر جمال قریشی کا نام نہ لیا جائے تو مضمون ادھورا رہ جائے گا۔ غزل میں کلاسیکی لہجہ پایا تھا۔ جو کہا خوب کہا۔ بھارت میں جن لوگوں نے اہلِ زبان ہونے کا واویلا مچایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے علاوہ اور کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اردو میں ہمتِ سخن کر سکے، اس طرح کے لوگوں کے لیے بڑے فخر کے ساتھ جمال قریشی نے کہا کہ

ہے کام لکھنؤ سے نہ دلّی سے واسطہ
بے لاگ پڑھ رہا ہے میری شاعری کو وہ

جہاں تک گجرات کی شاعرات کی بات ہے تو اُن میں مریم غزالہ، کاشی پٹیل شبنم اور انجنا سندھیر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی خواتین نے شاعری کی مگر تادمِ تحریر ان کا کلام حاصل نہ ہو سکا۔ اس قبیل کی ایک بیباک اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعرہ کا نام ہے ڈاکٹر انجنا سندھیر، ڈاکٹر انجنا سندھیر کے ان اشعار کو پڑھتے ہی پروین شاکر کا لب ولہجہ یاد آ جاتا ہے۔ اشعار دیکھیں۔

وہ روٹھتا ہے کبھی، دل دُکھا بھی دیتا ہے
میں گر پڑوں تو مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
وہ میری راہ میں پتھر کی طرح رہتا ہے

وہ میری راہ سے پتھر ہٹا بھی دیتا ہے
اُسے پسند ہیں اشعار میری غزلوں کے
وہ میرے شعر مجھی کو سُنا بھی دیتا ہے

استاد شاعر فنا پرتاپ گڑھی کو کسی طور فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ان کا ایک شعر ہی کافی ہے۔

پتنگے روشنی کو ڈھونڈ لیں گے
دیا چاہے کسی خانے میں رکھیے

اسی قبیل سے ایک اور نام عقیل شاطر کا سامنے آتا ہے۔ زیادہ تر غزلیں کہی ہیں۔ کبھی کبھی نہایت پُر سکون انداز میں کہتے کہتے اُن کا لہجہ سخت بھی ہو جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربوں کا کچھ یوں اظہار کیا ہے۔

شاعری میں کیا ملا شاطر تمھیں
بس ذرا سا نام ہوکر رہ گیا

عقیل شاطر کے ہم عصروں میں کئی نام سامنے آتے ہیں مگر مظہر رحمٰن ایک ایسا نام ہے جس کی شاعر نہایت قریب سے ہوکر دل کو چھو جاتی ہے۔ مظہر رحمٰن نے ہمیشہ زندہ شاعری کی ہے۔ غزل کو لے کر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ شعر دیکھیں۔

جہاں مکان ہے آنگن میں اک دوکان بھی ہے
کہ اپنے گھر میں ہی بازار کر گیا ہے وہ
قدم قدم پہ ہے اب سامنا حوادث کا
یہ خود کا کس طرح کردار کر گیا ہے وہ

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ ایک ایسا مضمون ہے جو ایک لمبی اور تھکا دینے والی تحقیق کے باوجود بھی باقی رہ سکتا ہے۔ بہت سے ایسے نام ہیں جو ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکے۔ اس تعلق سے ایک نام اور بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے اور وہ نام ہے ہرش برہم بھٹ کا۔ ہرش برہم بھٹ گجرات

گجرات میں اردو شاعری کا بھی ایک زمانہ رہا۔ ایک بڑی تعداد شعرا کی یہاں پائی گئی۔ یہ شعر اس زمانے کی تصویر کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جب یہاں گلی گلی شاعر ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں کا دور دورہ تھا۔

سرکار کے سیکریٹری رہ کر بھی انتہائی مصروفیات کے باجود اپنے شاعرانہ مزاج کو جلا دیتے رہے۔

گجراتی زبان میں تو ہرش برہم بھٹ ایک معتبر نام ہے ہی مگر اردو میں بھی انھوں نے قابلِ قدر اور باقی رہنے والی شاعری کی ہے۔ خاص طور سے آپ غزل کے شاعر ہیں۔ اردو میں اب تک آپ کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اردو ساہتیہ اکادمی نے بھی آپ کو 'گورو پُرسکار' سے نوازا ہے۔ ماہ نامہ 'شاعر' اور دوسرے ماہنامے آپ کے فن پر نمبر اور گوشے شائع کر چکے ہیں اور جہاں تک گجراتی کا معاملہ ہے پوری دنیا میں گجراتی شاعری کو لے کر آپ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ تقریباً ہر دوسرے یا تیسرے مہینے ہرش برہم بھٹ کو کوئی نہ کوئی بڑا ایوارڈ ضرور ملتا ہے بالفاظِ دیگر ہرش برہم بھٹ کی شاعری اور شخصیت کو نوازا جاتا ہے۔ ایک اردو دوست کی حیثیت سے بھی اور اردو نواز کی حیثیت سے بھی آپ کو جانا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ان کے چند اشعار۔

درد سینے میں پل رہا ہے ابھی
کارواں غم کا چل رہا ہے ابھی
ہم کو بھیگی نظر سے مت دیکھو
دل ہمارا سنبھل رہا ہے ابھی

گجرات مزاحیہ شاعری بھی ہوئی ہے۔ کئی شعرا نے مزاحیہ کلام لکھے اور مقبول بھی ہوئے۔ یہ ایک مشکل فن ہے۔ بڑا دل گردہ چاہیے مزاحیہ شاعری کے لیے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ اپیل رکھنے والا نام کوئی ہے تو وہ ہے گرگٹ احمد آبادی کا۔ ہمیشہ ٹھہراؤ کے ساتھ اردو مزاج کو سمجھتے ہوئے انھوں نے شاعری کی اور ملک اور بیرون ملک میں گجرات کا نام روشن کیا۔ ان کے چند اشعار دیکھیں۔

زمانے بھر کو سکندر دکھائی دیتا ہوں
اور اپنی بیوی کو مچھر دکھائی دیتا ہوں
یہ جان لے کسی ہیرو سے کم نہیں میں بھی
یہ اور بات ہے جوکر دکھائی دیتا ہوں
ادھر سے دیکھ مجھے یا اُدھر سے دیکھ مجھے
ہر اک جگہ سے برابر دکھائی دیتا ہوں

گجرات میں اردو شاعری کا بھی ایک زمانہ رہا۔ ایک بڑی تعداد شعرا کی یہاں پائی گئی۔ یہ شعر اس زمانے کی تصویر کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جب یہاں گلی گلی شاعر ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں کا دور دورہ تھا۔ شعر دیکھیے۔

اے مرے دل آ تجھے میں لے چلوں 'رکھیال*' میں
ڈیڑھ سو شاعر ملیں گے تجھ کو ایک ہی چال میں

* احمد آباد میں واقع ایک علاقہ جہاں ایک زمانے میں بڑی تعداد میں اردو شعرا موجود تھے اور اکثر مشاعرہ و شعری نشستوں کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔

■

Ghulam Mohammed Ansari
13, Pujari's Chawl,Gomtipur Road
Ahmedabad-380021(Guj)
E-mail : gulamansari1948@gmail.com
Cell: 9327032252

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

urduduniyancpul@yahoo.co.in   editor@ncpul.in

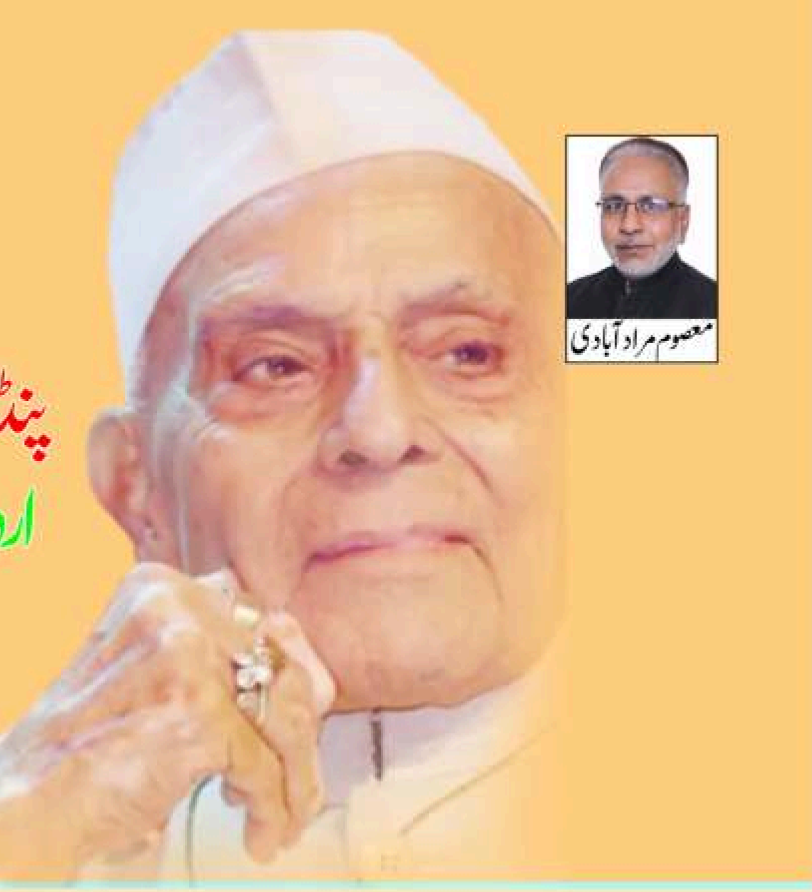

معصوم مراد آبادی

پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی
اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے
آخری سفیر

میں پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے دہلی کی شعری اور ادبی زندگی کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ایک طالب علم کے طور پر اس شہر کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ کبھی اپنی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کے دم سے دہلی کا ادبی اور شعری منظر نامہ اتنا بھرپور تھا کہ اسے پوری طرح لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان ادبی محفلوں کی آن، بان اور شان سمجھے جانے والے بیشتر ادیب اور شاعر اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں ایک ہستی ایسی ضرور تھی جس کی سر گرمیوں کو دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں یہ خوش فہمی تھی کہ یہ شخصیت دیر تک اور دور تک ہمارے درمیان رہے گی۔ یہ شخصیت تھی پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کی جنھیں میں اکثر 'گل گلزار' کہہ کر پکارتا تھا۔ افسوس کہ وہ بھی دوسروں کی طرح پچھلے دنوں ہم سب کو اداس کر کے چلے گئے۔

آج میں گلزار دہلوی کے بغیر دہلی کے شعری اور ادبی منظر نامے کا تصور کرتا ہوں تو مجھے ہر طرف بڑی ویرانی نظر آتی ہے۔ ہر محفل میں گرجتے برستے، چہکتے اور چہچہاتے گلزار دہلوی ایک ایسی باغ و بہار شخصیت تھے کہ ہر محفل ان کے ہی دم سے آباد تھی۔ انھیں شاعری کے ساتھ ساتھ تقریر کے فن پر بھی کمال حاصل تھا۔ وہ جب دلّی کی ٹکسالی زبان میں مرحوم دلّی کے قصے سناتے تو محفل خوب جمتی تھی۔ وہ دلّی کی سینکڑوں برس کی تہذیبی روایات اور اس کی شعری، ادبی اور سماجی زندگی کے واقعات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے تھے اور صحیح معنوں میں دلّی کے روڑے تھے۔ ان کی سب سے بڑی شناخت ان کا وہ پرتو تھا جس میں وہ اردو کی گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتے تھے۔ یہ مشترکہ تہذیب ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کے لفظوں میں:

''گلزار مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ یہ تہذیب ان کی رگ رگ میں پیوست اور ان کے لہو کی بوند بوند میں گھلی ملی ہوئی ہے۔ مشترکہ تہذیب کے مفہوم میں سیکولرازم، قومی اتحاد اور انسان دوستی یہ سبھی چیزیں شامل ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ جوہر ہے، جس کے سبب بیسویں صدی کی تمام تاریخی ہستیوں کا قرب انھیں حاصل رہا ہے۔ ان شخصیتوں میں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، شیخ عبداللہ، پروفیسر ہمایوں کبیر، خان عبدالغفار خاں، اندرا گاندھی، بابو جگجیون رام، اوما شنکر دکشت، بھیم سین سچر، موہن لال سکھاڈیا، پروفیسر نورالحسن اور پروفیسر سروپ سنگھ جیسی ہستیوں کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔''

گلزار دہلوی کی سب سے بڑی جیت یہ تھی کہ وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجود گھر نہیں بیٹھے اور آخری وقت تک سرگرم عمل رہے۔ عمر کے آخری حصے میں جبکہ ان کے قویٰ جواب دینے لگے تھے تو وہ اپنے ایک معاون کی مدد سے ہر اس محفل کی زینت بڑھاتے تھے، جہاں انھیں عزت واحترام سے بلایا اور سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دن کی تو بات ہے کہ انجمن ترقی اردو کی دہلی شاخ کے روح رواں اقبال محمود فاروقی نے 'یوم ذوق' کا اہتمام انجمن کے دفتر واقع کوچہ نیل کنٹھ (دریا گنج) میں کیا تھا۔ گلزار دہلوی اپنے تمام جھام کے ساتھ اس میں شریک ہوئے۔ پروگرام کی نظامت کا بار میرے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا گیا۔ گلزار صاحب جس شعری نشست میں شرکت کرتے تھے، اس میں شعر وشاعری سے زیادہ حصہ ان کی دلچسپ تقریر کا ہوا کرتا تھا جس میں وہ اردو زبان کی ترویج واشاعت سے متعلق اپنی خدمات اور 'کاملان دلّی' کے قصے بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں دہلی کی پوری ادبی، تہذیبی اور سماجی زندگی سمٹ آتی تھی۔ اکثر یہ تقریر اتنی طویل ہو جاتی کہ دیگر شرکا اپنی باری کا انتظار کرتے کرتے اونگھنے لگتے تھے۔ گلزار صاحب نے یوم ذوق کے نثری حصے کی صدارتی تقریر کو اتنا طولانی کر دیا کہ شعری نشست کا وقت ختم ہونے لگا۔ گلزار صاحب کو ٹوکنے کی جرات ہر کسی میں نہیں تھی۔ پھر بھی بطور ناظم میں نے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے ایک رقعہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مجھے ان کے غصے کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کا کمال یہ بھی تھا کہ ناراض بھی کچھ اس انداز میں ہوتے تھے کہ بات بگڑتی نہیں تھی۔ روک ٹوک کے باوجود انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ ان کا حافظہ غضب کا تھا کہ 94 برس کی عمر میں بھی 80 سال پرانے قصے کہانیاں ایسے سناتے تھے، گویا کل ہی کی بات ہو۔

اردو دنیا سوگوار

گلزار دہلوی کے انتقال سے اردو دنیا سوگوار ہے۔ وہ خالص دلّی والے تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ان ہی گلی کوچوں میں گزرا تھا، جنھیں خدائے سخن میر تقی میر نے اوراق مصور سے تشبیہ دی تھی۔ وہ مرحوم دہلی کی ایک توانا آواز تھے اور اس مٹتی ہوئی تہذیب کے امین تھے، جس نے اس شہر کو وقار بخشا تھا۔ وہ ہر شعری نشست کی آبرو تھے اور انھیں بزرگی کی وجہ سے سب سے آخر میں پڑھوایا جاتا تھا، لیکن انھوں نے اپنی پیرانہ سالی اور نقاہت کے باوجود اس روایت کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا حسن یہ تھا کہ وہ مذہبی طور پر خالص ہندو برہمن ہونے کے باوجود اپنے عادات واطوار اور بود وباش سے مسلمان نظر آتے تھے۔ حمدیہ اور نعتیہ نشستوں میں پورے خشوع وخضوع کے ساتھ سرخم کرکے شرکت کرتے تھے۔ یہ کوئی اداکاری نہیں تھی بلکہ اس ماحول کا فیض تھا جس میں انھوں نے تربیت پائی تھی۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یا طاقت اردو زبان اور اس کی ملی جلی تہذیب تھی، جس کی بقا کے لیے وہ آخری دم تک جدوجہد کرتے رہے۔ وہ اردو تعلیم کے سب سے بڑے وکیل تھے اور اس کے رسم الخط پر سب سے زیادہ اصرار کرتے تھے۔ ہر محفل میں وہ شرکا سے یہ ضرور کہتے تھے کہ اپنے بچوں کو آٹھویں کلاس تک اردو ضرور پڑھائیں۔ اردو زبان اور اس کی مٹتی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنے کی انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ بقول خود

درس اردو زبان دیتا ہوں ۔۔۔ اہل ایماں پہ جان دیتا ہوں
میں عجب ہوں امام اردو کا ۔۔۔ بتکدے میں اذان دیتا ہوں

گلزار دہلوی نے موت سے چند روز پہلے ہی نوئیڈا کے ایک اسپتال میں کورونا جیسی موذی وبا کو شکست دے کر زندگی کا پرچم دوبارہ بلند کیا تھا۔ 94 برس کی عمر میں اپنی بے مثال قوت ارادی سے کورونا کو شکست دینے والے گلزار دہلوی جب اسپتال سے باہر نکلے تو قومی اخبارات کے کئی نمائندے اور فوٹو گرافران کے منتظر تھے۔ ان کی حیات نو کی کہانی کئی بڑے انگریزی اخباروں نے جلی عنوانات کے ساتھ شائع کی۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ابھی اور جئیں گے، لیکن یہ کیا ہوا کہ وہ کورونا کو شکست دے کر زندگی سے ہی ہار گئے۔

گلاب کا ایک پھول پنڈت نہرو کی طرح ہمیشہ گلزار دہلوی کی شیروانی پر آویزاں رہتا تھا۔ سفید شیروانی ان کا محبوب لباس تھا اور میں نے کسی ادبی محفل میں انھیں اس کے بغیر نہیں دیکھا۔ اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت اور عربی کا ثقافتی ورثہ، کشمیر، پنجاب، دہلی اور یوپی کا سنگم اگر کسی کو ایک شخصیت میں دیکھنا مقصود ہو تو وہ گلزار دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور گلزار دہلوی اس کی حسرت کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتے تھے۔

قادر الکلام شاعر

گلزار دہلوی ایک قادرالکلام شاعر، ایک ذی علم ادیب اور محفل پر جادو کردینے والے بے مثال مقرر تھے۔ وہ اپنے والد ماجد علامہ زار دہلوی کے سچے جانشین ہی نہیں تھے بلکہ حضرت بیخود دہلوی، نواب سائل دہلوی اور علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور مولوی عبدالحق کے بھی صحیح جانشین تھے۔ وہ ادب میں داغ اور حالی کے ادبی خانوادے کے مایہ ناز سپوت تھے۔ انھوں نے 1946 میں انجمن تعمیر اردو اور ادارہ نظامیہ کی داغ بیل ڈالی اور اس کی سرگرمیوں کو جلا بخشی۔ دہلی کا اجڑتا ہوا اردو بازار برسوں ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور وہ مولوی سمیع اللہ قاسمی کے کتب خانہ عزیزیہ میں ادبی محفلوں کی جان رہے۔ وہ ہر سال رمضان کے مہینے میں ''روزۂ رواداری'' رکھتے تھے اور ہم جیسے خوشہ چینیوں کو اس میں بذریعہ پوسٹ کارڈ مدعو کرکے خوش ہوتے تھے۔ وہ اتحاد واخوت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، مولوی عبدالحق، علامہ نیاز فتح پوری، جوش ملیح آبادی جیسے عبقری شعرائے کرام گلزار دہلوی سے انسیت رکھتے تھے۔

گلزار دہلوی کا پورا نام پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی تھا۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو سے بے پناہ عقیدت کے سبب اپنے نام کے ساتھ نظامی وخسروی لکھتے تھے۔ خط وکتابت میں اپنے نام کے بعد یادگار اسلاف لکھنا بھی نہیں بھولتے تھے۔ وہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کی مینجنگ کمیٹی کے سرگرم ممبر تھے اور ہر سال عرس کے موقع پر وہاں بڑی عقیدت سے حاضری لگاتے تھے اور عرس کی تمام تقریبات میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے آباواجداد شاہجہاں کے دور میں دہلی آئے، جہاں وہ مغل شہنشاہ کے دربار میں شہزادوں کی تعلیم وتربیت کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ یہ لوگ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کے ماہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں ان کے علمی وقار کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ گلزار دہلوی کے خاندان کو یہ وصف حاصل تھا کہ ان کے خاندان میں ہر کوئی شاعر تھا۔ ان کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی اپنے زمانے کے بہترین شاعر تھے اور ان کا شمار مرزا داغ دہلوی کے جانشینوں میں ہوتا تھا۔ گلزار دہلوی کی والدہ محترمہ برج رانی زتشی بھی شاعرہ تھیں اور بیزار دہلوی تخلص تھا۔ وہ نواب سائل دہلوی کی شاگرد تھیں۔ گلزار دہلوی کے دو بڑے بھائی پنڈت دینا ناتھ زتشی اور رتن موہن ناتھ خار دہلوی بھی سائل دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔ اس طرح ان کے

> گلزار دهلوی ایک قادرالکلام شاعر، ایک ذی علم ادیب اور محفل پر جادو کردینے والے بے مثال مقرر تھے۔ وہ اپنے والد ماجد علامہ زار دهلوی کے سچے جانشین ہی نہیں تھے بلکہ حضرت بیخود دهلوی، نواب سائل دهلوی اور علامہ پنڈت برجموهن دتاتریہ کیفی اور مولوی عبدالحق کے بھی صحیح جانشین تھے۔ وہ ادب میں داغ اور حالی کے ادبی خانوادے کے مایہ ناز سپوت تھے۔

خاندان میں زار، بیزار اور خار کے بعد گلزار دہلوی نے شاعری کا پرچم لہرایا اور دہلی کے شعری اور ادبی منظر نامے پر چھاتے چلے گئے۔

پیدائش و پرداخت

گلزار دہلوی کی پیدائش 13 جولائی 1926 کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی لڑکیوں کے اندرپرستھ کالج میں اردو اور فارسی کے استاد تھے اور 'مولوی صاحب' کہلاتے تھے۔ ان کی شاگرد خواتین میں اردو کی بڑی نامی گرامی قلم کار اور دانشور گزری ہیں۔ گلزار دہلوی نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور پنڈت دتاتریہ کیفی کی سرپرستی میں چلنے والے انجمن ترقی اردو کے اردو کالج سے اردو میں ادیب فاضل اور فارسی میں منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ گلزار دہلوی کا بیان ہے کہ وہ مادرزاد شاعر پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے سات آٹھ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کردی تھی۔ ان کا تخلص رکھے جانے کی باقاعدہ تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر شریک ہوئے تھے۔ شروع میں انھوں نے اپنے والد علامہ زار دہلوی سے اصلاح لی۔ حضرت داغ دہلوی کے رشتے سے گلزار دہلوی اردو زبان اور کلچر کی گود میں پل کر جوان ہوئے۔ ان کے بچپن کے بزرگوں اور اساتذہ میں نواب مرزا سراج الدین خاں

سائل دہلوی، علامہ دتا تریہ کیفی، مولوی عبدالحق، استاد بیخود دہلوی، نوح ناروی، احسن مارہروی اور جوش ملیح آبادی جیسے شعراء شامل ہیں۔ ابتدائی کلام اپنے والد زار دہلوی اور نواب سائل کو دکھایا اور سات برس کی عمر میں نواب سائل سے ہی مولانا روم، حافظ شیرازی، اسلامی دینیات اور تلمیحات اقبال پڑھیں۔ 1938 میں باقاعدہ علامہ پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا۔

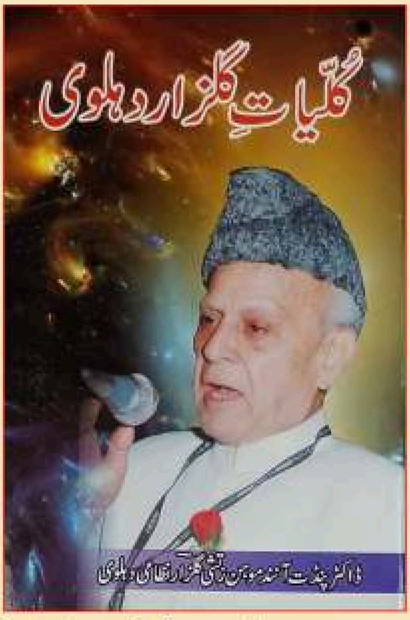

گلزار دہلوی کے بقول شروع میں انھوں نے کچھ دن اردو لیکچرر کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد دہلی کلاتھ ملز کے مالک سر شنکر لال کے مشیر کی حیثیت سے آرٹ، زبان اور کلچر سے متعلق امور دیکھتے رہے۔ 1970 میں جب سی ایس آئی آر نے اردو ماہنامہ 'سائنس کی دنیا' شروع کیا تو گلزار صاحب اس کے بانی ایڈیٹر بنائے گئے اور 1990 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے انور جمال قدوائی کی قیادت میں انھیں سائنسی صحافت کو مقبول بنانے کے سلسلہ میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی تو اس کے بعد ان کے نام کے ساتھ 'ڈاکٹر' کا اضافہ ہوا۔ گلزار دہلوی نے بحیثیت شاعر دنیا کے تقریباً پچاس ملکوں کا دورہ کیا۔ ان میں یوروپ، مشرق بعید، وسط ایشیا، روس، عرب اور امریکہ شامل ہیں۔ ان مشاعروں میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی اور انھیں انعام واعزاز سے نوازا گیا۔ گلزار دہلوی بیان کرتے تھے کہ جب ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت نہرو پہلی بار سعودی عرب گئے تو انھیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز کا بیان ہے کہ ''گلزار دہلوی کو بچپن سے تیراکی کا شوق تھا اور وہ گلی کشمیریان، بازار سیتارام سے سائیکل پر سوار ہو کر تیراکی کی مشق کے لیے جمنا آتے تھے، لیکن شیروانی اور چوڑی مہری کا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہونا اور چوڑی مہری کا پاجامہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ یہ ان کا غیر رسمی لباس یا اسپورٹس ڈریس ہے۔ گویا شیروانی کی پاسداری ان کے لیے کسی نہ کسی صورت یہاں بھی ضروری تھی۔ رسمی لباس میں چوڑی دار پاجامے کے ساتھ شیروانی کے بٹن گلے تک بند ہوتے تھے اور اس حالت میں ان کی آواز گلے سے اور زیادہ کھنچی ہو کر نکلتی تھی، جو جلسوں میں تقریریں کرنے، مشاعروں میں کلام سنانے اور ادبی جلسوں میں نظامت کرنے جیسے مواقع پر بڑی موثر ثابت ہوتی تھی۔''

انجمن تعمیر اردو

یوں تو گلزار دہلوی نے اپنی زندگی میں کئی تنظیمیں اور انجمنیں قایم کیں۔ مثال کے طور پر 1946 میں ادارہ نظامیہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، 1947 میں انجمن تعمیر اردو، 1971 میں نیشنل رائٹر ایسوسی ایشن، 1984 میں ڈاکٹر سیف الدین میموریل کونسل، 1989 میں آل پارٹی سینٹرل یوتھ اردو کونسل کے نام شامل ہیں، لیکن جو انجمن آخری وقت تک قایم ودائم رہی وہ دراصل انجمن تعمیر اردو ہی تھی جو انھوں نے 1947 کے ایسے پر آشوب دور میں قایم کی تھی جب دہلی کی ادبی، سماجی اور تہذیبی زندگی اجڑ چکی تھی۔ انجمن تعمیر اردو کے سرپرستوں میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم عبدالحمید اور میر مشتاق احمد جیسی شخصیات شامل تھیں۔ میر مشتاق احمد کو اس انجمن کا صدر بنایا گیا تھا۔ اس انجمن کی سرگرمیاں 1956 کے آس پاس اپنے شباب کو اس وقت پہنچیں جب تقسیم کے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ انجمن تعمیر اردو کی ایک خصوصی نشست 1958 کے اوائل میں اردو بازار میں کٹرہ نظام الملک میں اس مکان میں منعقد ہوئی جس میں مجاہد آزادی حافظ علی بہادر خاں (ایڈیٹر ہفتہ وار 'دور جدید') کا دفتر تھا اور خود ان کی قیام گاہ بھی تھی۔ اس کے بعد انجمن تعمیر اردو کی ہفتہ واری نشستوں کا سلسلہ ہر اتوار کو پابندی کے ساتھ اردو ناہال، اردو بازار میں اس جگہ ہونے لگا جو عرف عام میں میر مشتاق احمد کا کمرہ کہلاتا تھا اور جہاں بعد کو میر صاحب نے جنتا کوآپریٹیو بینک قایم کیا۔ یہ شعری اور تنقیدی نشستیں پابندی کے ساتھ سترہ اٹھارہ سال تک اس وقت تک چلتی رہیں جب تک ایمرجنسی کے زمانے میں وہاں بلڈوزر نہیں چل گیا۔ اس بلڈوزر نے نہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کے کلچر کا صفایا کر دیا بلکہ پورے اردو بازار کی ادبی اور تہذیبی فضا کو بھی تہہ و بالا کر دیا۔ اس خلفشار سے پہلے انجمن تعمیر اردو کی مخصوص نشستیں اردو بازار میں وہ رنگ جما گئیں، جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ گلزار دہلوی کی بدولت انجمن کی ان نشستوں میں ادب کی دنیا کی ہر محترم اور معتبر شخصیت نے ان محفلوں کا وقار بڑھایا۔ علامہ زار دہلوی، خار دہلوی، طالب دہلوی، حافظ علی بہادر خاں، گوپی ناتھ امن، انور صابری جیسی برگزیدہ شخصیتیں پابندی کے ساتھ ان نشستوں میں شرکت کرتیں اور ان نوجوان قلم کاروں کا حوصلہ بڑھاتیں جو تنقیدی نشستوں میں اپنی شعری اور نثری تخلیقات پیش کرتے تھے۔ یہ گلزار دہلوی کا ہی دم تھا کہ انجمن تعمیر اردو کی ان نشستوں میں جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، ساغر نظامی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر محی الدین قادری زور، قاضی عبدالودود، فیض احمد فیض، مولانا امتیاز علی عرشی، سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین، مسعود حسین رضوی ادیب، سلام مچھلی شہری، ماہر القادری، پروفیسر آل احمد سرور، سید احتشام حسین، عصمت چغتائی، بیگم صالحہ عابد حسین، علامہ انور صابری، بسمل سعیدی اور عمیق حنفی جیسی شخصیات شریک ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ پاکستان سے جو دانشور اور ادیب ہندوستان آتے تھے، گلزار دہلوی ان کی بھی انجمن کی انھی محفلوں میں پذیرائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز کا بیان ہے کہ'' 1975 کے بعد دہلی میں وارد ہونے والے ادیبوں کو چھوڑ کر وہ تمام نوجوان ادیب اور شاعر جو مختلف مسالک فکر سے تعلق رکھتے انجمن تعمیر اردو کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ ادبی تربیت، نکتہ سنجی، نکتہ شناسی، سخن سنجی اور سخن فہمی کا جو سامان ان نشستوں نے مہیا کیا، اس سے ہماری نسل کے کتنے ہی نوجوانوں نے فائدہ اٹھایا۔ آج بھی گلزار صاحب کی انجمن تعمیر اردو تو زندہ ہے لیکن اس کا شیرازہ بالکل اسی طرح بکھر چکا ہے، جس طرح شہر دہلی کے جغرافیہ اور اس کی تہذیب کا۔ اس کے بعد نوجوانوں کی ادبی تربیت کا ایسا کوئی دوسرا مرکز دلّی میں دکھائی نہیں دیتا۔''

انجمن تعمیر اردو سے گلزار دہلوی کو قلبی لگاؤ تھا۔ انھوں نے اسے ایک زندہ جاوید حیثیت عطا کی تھی۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ ان کے بعد بھی یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے۔ انھوں نے راقم الحروف کو کئی مرتبہ اس طرف متوجہ کیا، لیکن میری صحافتی مصروفیات اس میں حائل رہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے 15 مئی 2016 کو خاکسار کے نام لکھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مائی ڈیئر میاں معصوم مرادآبادی سلمہ

زندہ پائندہ وتابندہ باد، دعائے نظامی وخسروی۔ سلامت

عزیزمن، کبھی ہمارے گھر بھی ادبی دوستوں کو لے کر آؤ۔ ایسے اجنبی نہ بنو، 91 سال کے بزرگ اردو کو جس کی 82 سال کی اردو کی تبلیغ و جہاد اور ادبی خدمت، اور قومی یکجہتی میں خصوصاً مسلم دوستی اور ان کے حق میں آواز بلند کرنے والے خیر خواہ کو بھول جاؤ گے۔

70 سال سے انجمن تعمیر اردو چلا رہا ہوں۔ اب آؤ اور آگے 70 سال تم اس انجمن کو چلاؤ۔ 1946 سے 1972 تک جب کہ کوئی دوسری انجمن، اکاڈمی، انسٹی ٹیوٹ، بزم یا مرکز نہیں تھا، صرف مجھے ہی انجمن کی جانب سے لڑنا مرنا پڑا تھا۔ اب مجھے مستقبل کے لیے اردو کا مجاہد درکار ہے۔ کچھ دوستوں کو لے کر آجاؤ۔ اللہ توفیقات میں اضافہ کرے۔

چشم براہ، منتظر جواب۔ گلزار دہلوی عفی عنہ یادگار اسلاف۔

اس مکتوب سے قبل انھوں نے جولائی 2014 میں اپنے 71 ویں روزہ رواداری کی تقریب کا دعوت نامہ ارسال کرتے ہوئے لکھا تھا:

محب عزیز پیارے معصوم مرادآبادی سلمہ، ولطفہ وطول عمرہ واقبالہ، تابندہ باد

ہدیہ خلوص، دعائے نظامی وخسروی

اب تمھیں انجمن تعمیر اردو دلّی (رجسٹرڈ و قائم شدہ 1947) کا جوائنٹ سیکریٹری بننا ہے اور سیکریٹری رابطہ عامہ بھی۔ میری طرح تن من دھن، وقت اور مشوروں سے بھی انجمن کی اور میری مدد کرنی ہے۔ اگر ہو سکے تو جلد آ کر مل بھی جاؤ۔ شکریہ جزاک اللہ

گلزار دہلوی، یادگار اسلاف

روزہ رواداری

اردو کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم یکجہتی کا جذبہ محض نظریاتی طور پر گلزار دہلوی کے مزاج کا حصہ نہیں تھا بلکہ وہ عملی طور پر اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں وہ ہر سال ایک روزہ رکھ کر مشترکہ تہذیبی قدروں کو تقویت پہنچاتے تھے۔ یہ روزہ عام طور پر الوداع کا ہوتا تھا۔ اسے انھوں نے ''روزہ رواداری'' کا نام دیا تھا۔ ان کی روزہ کشائی کے لیے احباب باقاعدہ چندہ کرکے ایک شایان شان افطار پارٹی منعقد کرتے تھے۔ گلزار صاحب کا کہنا تھا کہ اس روزہ رواداری کی شروعات انھوں نے حضرت مولانا احمد سعید مرحوم کی ہدایت پر کی تھی، جسے انھوں نے بعد میں اپنی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا ایک حصہ بنالیا۔ گلزار صاحب کے اس 'روزہ رواداری' میں ہر برس بلا تفریق مذہب وملت اہم شخصیات نے شرکت کی اور ان کے اس جذبہ خلوص کی ہر سطح پر پذیرائی کی گئی۔ 13 جولائی 2014 کو نئی دہلی کے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ان کا 71 واں 'روزہ رواداری تھا۔ اس موقع پر راقم کو انھوں نے جو دعوت نامہ اپنے مکتوب کے ساتھ روانہ کیا تھا، اس کا متن ملاحظہ فرمائیں۔

یادگار اسلاف اور دلّی کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندے

علامہ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کا

اکہتر (71) واں روزہ رواداری۔ افطار وضع داری

13 جولائی 2014، اتوار، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، نئی دہلی

حسب ذیل پروگرام منعقد ہوگا۔

نعتیہ نشست وذکر سیرت: ساڑھے تین بجے

(اسی روز ڈاکٹر گلزار دہلوی کے 89 ویں یوم ولادت کی تقریب بھی ساتھ ہی منعقد کی جارہی ہے) آپ سے درخواست ہے کہ وقت مقررہ پر تشریف لاکر اس تاریخ ساز نورانی محفل کے گواہ بنیں۔ اس تقریب کے منتظرین میں سید شاہد مہدی، ڈاکٹر سید فاروق، متین امروہوی، مولوی عبدالسلام قاسمی، حسن ضیاء اور محمد عتیق صدیقی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

سائنس اور شاعری

عام طور پر شاعری اور سائنس کو ایک دوسرے کی ضد تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے رسیا سائنس سے دور رہتے ہیں اور جو سائنس کے دل دادہ ہیں، وہ شاعری سے دور کی راہ ورسم رکھتے ہیں۔ لیکن یہ گلزار دہلوی کا ہنر تھا کہ انھوں نے سائنس اور شاعری کے درمیان ایک پل تعمیر کرلیا تھا جس پر وہ بے تکان سفر کیا کرتے تھے۔ گلزار دہلوی نے اپنی زندگی کا طویل حصہ ماہنامہ 'سائنس کی دنیا' کی ادارت کرتے ہوئے گزارا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعر وشاعری کا سفر بھی طے کرتے رہے۔ وہ شاعر اور ادیب ہونے کے باوجود ایک سائنسی جریدے کے کامیاب مدیر ثابت ہوئے۔ مغربی مفکرین کا خیال ہے کہ قطب شمال اور قطب جنوب قیامت کے دن ہی سہی مگر آپس میں مل سکتے ہیں، لیکن سائنس اور شعروادب کبھی نہیں مل سکتے۔ لیکن گلزار دہلوی نے مغربی مفکرین کے اس خیال کو اپنے عمل سے غلط ثابت کردکھایا۔ ایک بار کچھ دوستوں نے گلزار صاحب سے پوچھا کہ'' سائنس حقائق کی تحقیق کرتا ہے اور ادب حقائق کو مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتا ہے، لہٰذا ایک شاعر وادیب کو 'سائنس کی دنیا' کی کمان سنبھالنے میں دشواری پیش نہیں آئی؟'' یہ سن کر گلزار دہلوی نے کہا کہ'' ارے بھئی، سائنس میں بھی تو خوردبین سے چھوٹے چھوٹے ذرات، خلیوں اور جراثیم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ سائنسی تحقیق آسانی سے کی جاسکے۔ اسی طرح ادب میں سماجی، معاشی، ثقافتی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین، سامعین اور ناظرین کو دین ودنیا کا آئینہ آسانی سے دکھایا جاسکے، اس لیے سائنس اور ادب ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں۔''

خواجہ احمد عباس نے سائنس اور شاعری کے حوالے سے اردو ہفتہ وار 'بلٹز' میں ان پر باقاعدہ کالم لکھا۔ اس کا عنوان تھا 'سائنس اور شاعری'۔ اس کالم میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اردو میں 'سائنس کی دنیا' سارے برصغیر میں اپنی نوعیت کا واحد اور بے مثل رسالہ ہے اور اس کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ایک شاعر اور دانشور کی زیر ادارت نکلتا ہے۔ یہ شاعر اپنی لگن اور اردو میں سائنس کی واقفیت کی وجہ سے اس کے بانی ہیں اور اس سے وابستہ ہیں۔ حکومت کے کتنے ہی اردو رسالے ملک میں نکلتے ہیں، جن میں بہ آسانی ایک مشہور ادیب وشاعر کو جگہ مل سکتی ہے۔ مگر اردو کو سائنس کے علوم سے مالا مال کرنے کا یہ جذبہ اور کوشش ان کے ہی حصے میں آئی، جس کا انھوں نے لاجواب حق ادا کرکے دکھایا۔ یہ شاعر ہیں علامہ پنڈت زار دہلوی (یادگار داغ) کے صاحب زادے پنڈت گلزار زتشی دہلوی، جو کہ ساٹھ برس کے ہونے پر بھی خوب رو، جامہ زیب صاحبزادے معلوم ہوتے ہیں۔ نوجوانی ان کے سرخ وسفید چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ حال ہی میں اودے پور کے ایک مشاعرے میں وہ نوجوان ترین شاعر معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ وہاں دس بارہ ان سے کم عمر شاعر اور بھی موجود تھے، مگر گلزار صاحب باتوں کے انداز سے، پڑھنے کے اسٹائل سے اور اپنے خیالات کے باغیانہ اسلوب سے نوجوان ہی لگتے تھے۔''

خواجہ احمد عباس نے اردو 'بلٹز' میں یہ کالم اب سے کوئی 34 برس پہلے لکھا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ گلزار دہلوی 94 برس کی عمر تک اسی طرح تروتازہ رہے اور انھوں نے اس عمر میں بھی کورونا جیسے موذی مرض کو ہرایا تھا مگر اس کے چند روز بعد ہی وہ ہم سے رخصت ہوگئے۔

■

Masoom Moradabadi
Z-103, Taj Enclave, Geeta Colony,
Delhi-110031

نند کشور وکرم کے ساتھ ایک سیلفی

خورشید اکرم

مجھے سیلفی سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کیا واہیات بات ہے کہ اپنی تصویر خود کھینچو۔ کوئی آپ کی طرف دیکھتے ہوئے Smile نہ کہے اور اس بھونڈے کام کے لیے آپ خود ہی خود کو ہدایت دیں۔ لیکن اس روز، ابتدائے اگست کی ایک گرم دوپہر کو، آصف علی روڈ کے ہلکان کر دینے والے ٹریفک سے گزرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ سیلفی لینا چاہیے۔ دراصل پہلے تو خیال آیا تھا کہ میں ڈرائیونگ سیٹ پر فراٹے سے اپنی چھوٹی سی Nano کار چلاتے ہوئے اپنے ان بزرگ— نند کشور وکرم— کی تصویر لے لوں۔ نواسی برس کا ایک آدمی بغیر چشمہ کے، دلی کی ایک بھیڑ بھری سڑک پر فراٹے سے اپنی کار چلاتے ہوئے اگر آپ کو نظر آئے تو کیا آپ کا جی نہیں چاہے گا کہ اس خوش بخت انسان کی تصویر کھینچ لی جائے جس پر قدرت اس قدر مہربان ہے کہ اس کے ہوش وحواس، اوسان، آنکھ کان، ہاتھ پاؤں سب ایک دوسرے کے ساتھ اتنے لمبے عرصے سے پوری ہم آہنگی کے ساتھ متحرک ہیں، سرگرم سفر ہیں۔ سو میں نے سوچا ان کی تصویر لے لوں۔ لیکن اس بظاہر معمولی (لیکن میرے لیے غیر معمولی) لمحے میں میری موجودگی کے نشان بھلا کیسے ثبت ہوں گے۔ تو بس اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ سیلفی لینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور فوکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چاہتا یہ تھا کہ وکرم صاحب کی ایک ایسی تصویر لوں جس میں گاڑی، اسٹیرنگ پران کے ہاتھ، نظریں ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی ہوئی اور ان کے پس منظر میں چلتی گاڑیاں سب نظر آئیں اور ہاں میں بھی رہوں تصویر میں، مگر اس کے حاشیے پر۔ مگر میرے ہاتھ اناڑی تھے۔ کبھی فوکس نہ بنتا، کبھی ہاتھ ہل جاتا، کبھی میرا چہرہ ضرورت سے زیادہ بڑا نکل آتا کبھی میں ایک اچھی بھلی تصویر میں زبردستی جھانکتا نظر آتا۔ سیلفی لینے کی مشق نہ ہونا— یہ بھی ایک بُری بات ہے۔ یہی سوچتے ہوئے میں جیسے تیسے تصویریں اتارتا رہا اور ان سے باتیں بھی کرتا رہا تاکہ وہ تصویر کے لیے Conscious نہ ہوں۔ گفتگو دراصل ادبی سماجیات پر چل رہی تھی۔ اس گرم دوپہری میں ہم ابھی کناٹ پلیس میں واقع کافی ہوم سے اٹھ کر آرہے تھے۔ میں وہاں ان کی 'صلائے عام' جیسی دعوت پر پہنچا تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے وکرم صاحب نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ہر مہینے کے پہلے سنیچر کو دوپہر 12 بجے کافی ہوم میں ملا جائے۔ یہ غالباً تیسرا مہینہ تھا۔ پہلا مہینہ جو انہوں نے طے کیا تھا وہ غالباً جون کا تھا۔ سخت گرمی اور وہ بھی دوپہری میں وہ بھی ایک ایسے کافی ہاؤس میں جہاں اے سی بھی نہیں۔ لیکن گرمی سردی کی پرواہ جب یہ بزرگوار نہیں کر رہے ہیں تو ہم ان سے پینتیس برس کم بوڑھے یا کہیے کہ زیادہ جوان، کس منہ سے سوال کریں۔ پہلی بار میں اڑیسہ لٹریچر فیسٹول کے افتتاحی پروگرام میں مدعو ہونے کے سبب نہ جا سکا تھا۔ دوسری بار میں ذرا دیر سے پہنچا اور وکرم صاحب کو اکیلا ہی اپنے 'ادیب' دوستوں کا بے تابانہ منتظر پایا۔ تھوڑی دیر بعد حسن ضیا آگئے۔ زبان وادب کی موجودہ صورت حال پر باتیں ہوئیں جو ویسی ہی معمولی سرسری سی تھیں، جیسی ہم جیسے معمولی لوگ کر سکتے ہیں۔ بس یہ کہ اس ملاقات کو ذرا بامعنی، بامقصد بنانے کے لیے اس میں ہم نے اپنی اپنی فکر وتشویش اور اپنے احساسات اپنے اپنے لفظوں کی قوت بھر ملا دیے۔ اس طرح ملاقات کم از کم 'نشستند و گفتند و برخواستند' والی نہ رہی۔ اس میں تھوڑی معنویت پیدا ہوگئی۔ یوں وکرم

ہندوستان اورپاکستان کے درمیان کے سیاسی سردوگرم سے بے نیاز ادھر کے جو لوگ اہل پاکستان کے لیے خیر سگالی کے جذبے سے کبھی خالی نہیں ہوئے اور ہمیشہ ایک سرگرم رشتہ ورابطہ بنائے رکھتے ہیں ان میں دو نام سب سے اہم ہیں۔ایک وکرم صاحب جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے اور دوسرے شمیم حنفی صاحب جن کا مسکراتا چہرہ 'چہارسو' کا سرورق بنا میرے سامنے تھا۔یہ بات بس ایک ہوا کے جھونکے کی طرح میرے ذہن سے گزر گئی۔

صاحب کی امید کی لو قائم رہی کہ ایسی ملاقاتیں ضروری ہیں، بامعنی ہیں، مفید ہیں۔ یہ اس کے بعد کے مہینے کے پہلے سنیچر کی ایک خاصی گرم دوپہر کی بات ہے۔ میں وقت سے کچھ تاخیر سے پہنچا۔ پورے کافی ہوم میں گھوم پھر کر دیکھا اور مسکرایا۔ میں اوّل آیا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونک لے گا۔ بس یوں سمجھیے کہ اس بھٹی میں کبھی اس کرسی پر جا بیٹھتا کبھی اس کرسی پر۔ عجیب صورت حال تھی۔ جب مجھے وہ کرسی ملتی جس پر پنکھے کی ہوا آ رہی ہو تو اس سے داخلی دروازہ نظر نہ آتا۔ اور جب ایسی کرسی پر جا بیٹھتا جہاں سے داخل ہونے والا نظر آتا ہے تو وہاں ہوا نہ ہوتی، حبس ہوتا۔ انتظار کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اسی ادل بدل میں نظریں دوڑاتے ہوئے دیکھا کہ وکرم صاحب ایک ذرا دور کی کرسی پر بیٹھنے جا رہے ہیں۔ سلام دعا ہوئی۔ ان کی آنکھ میں چمک — کوئی تو آیا ہوا ہے۔ میری بھی بے تابی اب کم ہوئی۔ چلو کم سے کم حاضری تو لگ گئی۔ انہوں نے مجھے 'چہارسو' کا شمیم حنفی نمبر عنایت کیا۔ 'چہارسو' والے گلزار جاوید صاحب وکرم صاحب کے قدر دان ہیں۔ پاکستان میں ان کے قدر دان بہت ہیں۔ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ ہندوستان سے زیادہ ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کے سیاسی سرد و گرم سے بے نیاز ادھر کے جو لوگ اہل پاکستان کے لیے خیر سگالی کے جذبے سے کبھی خالی نہیں ہوئے اور ہمیشہ ایک سرگرم رشتہ و رابطہ بنائے رکھتے ہیں ان میں دو نام سب سے اہم ہیں۔ ایک وکرم صاحب جو اس وقت سامنے بیٹھے تھے اور دوسرے شمیم حنفی صاحب جن کا مسکراتا چہرہ 'چہارسو' کا سرورق بنا میرے سامنے تھا۔ یہ بات بس ایک ہوا کے جھونکے کی طرح میرے ذہن سے گزر گئی۔

وکرم صاحب نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس نمبر کو ترتیب دینے میں ان کی مساعی کیا رہی ہیں۔ وہ نہ بھی بتاتے تب بھی مجھے وہ ساری باتیں معلوم تھیں۔ یہ مجھے شمیم حنفی صاحب نے خود ہی بتا دی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ رسائل میں اپنے اوپر گوشے چھپوانے اور نمبر نکلوانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ لیکن یہ نند کشور وکرم صاحب ہیں جنھوں نے خود کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر شمیم حنفی صاحب کی تحریریں گلزار جاوید صاحب کو بھجوائی تھیں اور کیسے ان کے پیہم اصرار کے لحاظ میں شمیم حنفی صاحب نے باقی کا مواد فراہم کرایا تھا۔ اب یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر شمیم صاحب یہ باتیں نہ بھی بتاتے تو بھی مجھے وکرم صاحب کے کہے پر رتی بھر شبہ نہ ہوتا۔ 'چہارسو' کا ہر شمارہ کسی نہ کسی ایک ہندوستانی اور پاکستانی ادیب پر مرکوز ہوتا ہے اور ہندوستان کے ادیبوں کے انتخاب میں بیشتر نہ صرف یہ کہ وکرم صاحب کا مشورہ شامل رہتا ہے بلکہ مواد کی فراہمی میں ان کی ڈھیر ساری محنت بھی شامل رہتی ہے۔ مجھے خود انھوں نے نیر مسعود صاحب پر مواد جمع کرنے کے لیے کئی بار کہا۔ افسوس کہ وہ میں نہ خود کر سکا، نہ کسی سے کروا سکا۔ شفیع جاوید صاحب پر گوشے کے لیے انھوں نے مجھ سے مواد جمع کرنے کو کہا۔ یہ کام میں نے کیا (افسوس کہ گلزار جاوید صاحب نے اس میں ویسی دلچسپی نہ دکھائی جیسی کہ وکرم صاحب نے)۔ انھوں نے 'چہارسو' کے لیے کی گئی اپنی بعض اور مساعی کا ذکر بھی کیا لیکن بڑی سادگی سے، یوں جیسے کہ 'بھئی مجھ سے جو بن پڑتا ہے وہ کر دیتا ہوں'۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کام کرنے کے عادی ہیں۔ ابھی پچھلے ہی دنوں تو مجھ سے تقریباً ایک گھنٹہ تک فون پر 'سویرا' کے افسانہ نمبر کے لیے افسانہ نگاروں کی فہرست پر مشورہ کر چکے تھے۔ میں نے انھیں بتایا تھا کہ جینت پرمار نے بھی اس سلسلے میں مجھ سے بات کی ہے لیکن وہ تو کاغذ قلم لے کر بیٹھے تھے۔ اپنی سناتے رہے اور میری سنتے رہے، جو ان کے مطلب کی تھی نوٹ کرتے رہے پھر انھوں نے سلیم الرحمٰن صاحب کو مطلع کر دیا۔ مطلب وہی کہ: 'بھئی مجھ سے جو بن پڑتا ہے وہ کر دیتا ہوں'۔ باقی اگلا جانے۔ اس دن چونکہ ہم ہی دونوں تھے، کوئی تیسرا نہیں آیا تھا۔ اس لیے کبھی میں ان سے 'اور کیا ہو رہا ہے' پوچھتا اور کبھی وہ مجھ سے۔ میرے پاس بتانے کو کیا ہوتا ہے۔ افسانے لکھے نہیں جا رہے۔ نظمیں کبھی کبھی یوں ہو جاتی ہیں جیسے کھیت کے کناروں پر اگنے والا ساگ پات۔ کسی کتاب کا ڈول ڈالتا ہوں، خواہ وہ ترتیب دینے کا ہی کام ہو، اس میں بھی سال ڈیڑھ سال نکل جاتا ہے۔ مضمون وضمون کچھ لکھ لیا تو ٹھیک ورنہ وہ بھی نہیں۔ وکرم صاحب کے پاس البتہ کیے ہوئے جیسے بہت سارے کام ہیں، تیاری اور تکمیل کے مرحلے میں کئی کام ہیں اور مستقبل کے منصوبے کے تحت کئی کام ہیں۔

''ابھی میں نے 'اردو کے سو نامور شاعر' کو ہندی میں کر لیا ہے''۔ یہ سو شاعروں کے مصور تذکرے پر مشتمل کوئی آٹھ سو صفحے کی کتاب ہے۔ اردو میں کتاب پہلے چھپ چکی تھی اب ہندی میں بھی چھپ گئی۔ اتنا کام انہوں نے ہندی میں کیسے کر لیا۔ ویسے تو وہ اپنے بہت سارے کام اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی کر لیتے ہیں۔ اب تک جانے کتنے افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے وہ ہندی میں منتقل کر چکے ہیں۔ مجھے جب بھی وہ بتاتے ہیں، میں صرف ان کی انتھک محنت پر عش عش کر کے رہ جاتا ہوں۔ مگر شاعری کا کام کیسے کیا؟ انھوں نے بتایا کہ محنت لگتی ہے صاحب! گوگل کی ٹیکنالوجی بھی کچھ ان کے کام آئی ہے۔ کیسے؟ میں نے ان سے پوچھا نہیں۔ گوگل ہمارے بچوں کے زمانے میں پیدا ہوا، اور ہمیں چھوڑ کر وکرم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اس بات کو مجھے اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مگر خفت تو ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ نئی ٹیکنالوجی تک قاعدے سے پہلے ہمیں پہنچنا چاہیے تھا اور وکرم صاحب کو اس کے برعکس چاہیے تھا کہ اپنی بزرگی کی دہائی دے کر اسے اپنے دروازے سے لوٹا دیتے لیکن ہم تو جیسے بس کے انتظار میں بیٹھے رہے اور وکرم صاحب اپنا پرانا اسکوٹر اٹھا کر ٹیکنالوجی کے دروازے تک پہنچ گئے۔ بہت

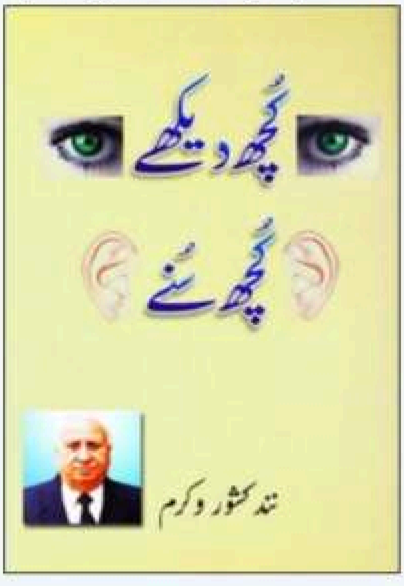

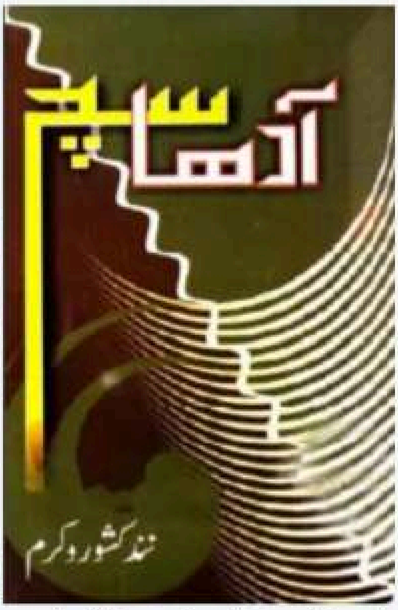

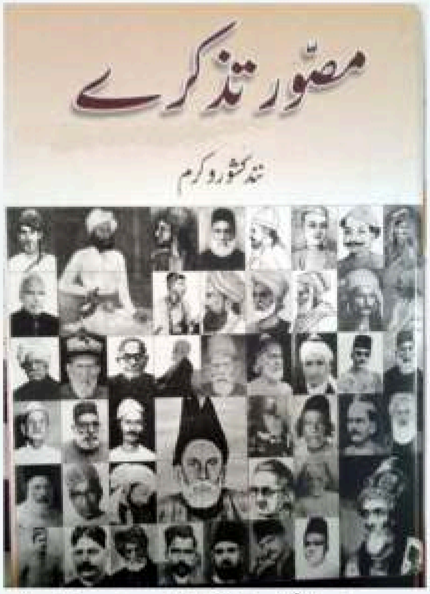

پہلے جب کہ ان پیج کا سافٹ ویئر اتنی آسانی سے دستیاب نہیں تھا، اپنے کاتبوں کے حیلوں بہانوں سے تنگ آکر انہوں نے اردو سافٹ ویئر بھی حاصل کرلیا تھا اور خود ہی کمپوزنگ بھی کرنے لگے تھے۔ تب تک خدا جھوٹ نہ بلوائے، مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انگریزی کی Qwerty کی بورڈ سے اردو میں کمپوزنگ کیسے ہورہی ہے۔ یہ بھلا کیا اور کیسے جان پاتا کہ اس میں تو ایک ہی نہیں کئی طرح کے 'کی بورڈ' مستعمل ہیں۔ اس کتاب کی بات ختم ہوئی تو پھر اپنی کتاب 'بھولے بسرے مجاہدین' کے بارے میں بتایا کہ وہ اب تقریباً مکمل ہے۔ یہ ان نیشنلسٹ مسلمان مجاہدین آزادی کی مبنی برحقائق تاریخ ہے جنہوں نے غیر منقسم ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کی، جان گنوائی اور اب گمنام ہیں کیونکہ وہ اس خطے سے تھے جو اب پاکستان میں ہے اور چونکہ پاکستان کی تاریخ صرف ان سے بنتی ہے جنہوں نے پاکستان بنوانے کی جدوجہد کی اور اسی طرح ہندوستان کی تاریخ ان سے بنتی ہے جو اس خطے کے باسی ہیں جواب کا ہندوستان ہے، اس لیے ان کی خدمات کو یاد کرنا کسی کی ذمے داری نہیں ہے، سوائے نند کشور وکرم جیسے کسی سرپھرے کے۔ مجھے یاد ہے کہ کوئی پندرہ برس پہلے جب ایوب مرزا کا ایک سوانحی ناول، جو مجاہد آزادی دادا امیر حیدر کی زندگی پر مبنی تھا، ان کی میز پر میں نے دیکھا تھا تو وہ بہت دیر تک پورے جوش وجذبے کے ساتھ دادا کے بارے میں بات کرتے رہے تھے۔ کیا پتہ بھولے بسرے مجاہدین لکھنے کا منصوبہ انھوں نے اس کے بعد ہی بنایا ہو۔ مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ برسوں سے وہ اس کتاب پر کام کر رہے تھے۔ (کتاب 2017 کے اواخر میں چھپ گئی)۔ پھر 'مصور یادگار غالب' کی تیاریوں کے بارے میں بات کرنے لگے جو عالمی اردو ادب کے اگلے شمارہ کی صورت شائع ہوگا۔" اس میں دیوان غالب کا نقش چغتائی ایڈیشن پورا کا پورا شامل ہوگا اور ایک نسخہ، دیوان بخط غالب بھی مکمل صورت میں ہوگا۔ اور غالب پر پندرہ بیس منتخب مضامین بھی ہوں گے۔" غالب پر اس نوع کے بڑے کام کرنے کے لیے دہلی ہی میں کم از کم دو بڑے ادارے موجود ہیں۔ لیکن وکرم صاحب بغیر کسی اعانت کے تنہا ہی یہ کام کر رہے ہیں۔ تقریباً 450 صفحات پر مشتمل یہ شمارہ بھی دسمبر 2017 میں شائع ہوگیا۔ اتنے کام پر لوگ کل وقتی محقق بن کر غالب کے نام کا کوئی تحقیقی ایوارڈ لے لیتے ہیں۔ وکرم صاحب نے یہ مفت میں کرکے اردو کی اگلی نسلوں کے حوالے کردیا۔ اب بھلا کوئی کون سا غالب ایوارڈ لے کر ان کے پاس جائے، ویسے انھیں غالب ایوارڈ مل چکا۔ قطر (دوحہ) کا انعام بھی مل چکا، کئی اور چھوٹے بڑے انعام مل چکے۔ کئی رسالوں نے ان پر خاص نمبر بھی چھاپ دیے۔ وہ اس بات کو میٹر آف فیکٹ یعنی معمول کی بات کی طرح بہت زیادہ پرجوش ہوئے بغیر آپ کو بتا بھی دیں گے اور پھر اپنے زیر تکمیل پروجیکٹ اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بات کرنے لگیں گے۔

خیر! ایسے ہی باتیں کرتے کرتے کافی، لسی پیتے پیتے ڈیڑھ دو گھنٹے بیت گئے۔ کوئی اور نہیں آیا۔ "لوگوں کی دلچسپی نہیں ہے گھر سے نکلنے میں" وہ کہنے لگے "فلاں پروفیسر صاحب کو (جو ان سے عمر میں کم از کم بیس برس چھوٹے ہوں گے) ٹیلی فون کیا تو کہنے لگے، دیکھتا ہوں، اگر گرمی زیادہ نہ ہوئی تو......" بتایئے، گرمی سردی کیا ہے۔ آنا ہے تو آنا ہے۔ پھر ذرا دیر بعد جیسے کچھ فیصلہ کرکے بولے: "ایک بار اور، اگلے مہینے آوں گا۔ اگر کوئی نہیں آیا تو پھر یہ سلسلہ بند۔" انجام معلوم۔

کافی ہوم سے اٹھ کر مجھے دریا گنج جانا تھا۔ "چلیے میں آپ کو گولچہ پر چھوڑ دوں گا"۔ "وہ آپ کے راستے میں تو نہیں ہے۔" میں نے کہا "او! کیا ہرج ہے، میں ادھر سے ہوکر نئے پل سے چلا جاوں گا۔" یوں پہلی بار مجھے ان کے ساتھ ان کی کار میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ یوں پہلی بار میں نے ایک سیلفی لی اور پہلی بار میں نے اسے 'پرا کسی سیلفی' کا نام دے کر اپنے فیس بک پوسٹ پر ڈالی۔

گولچہ سنیما کے سامنے مجھے اتار کر ان کی کار کسی منی ٹرک کی طرح قدرے شور مچاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں کچھ دور انھیں، ان کی کار کو دیکھتا رہا۔ افسوس کہ میری نظر محدود ہے۔ ذرا دیر میں وہ اور ان کی کار میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔ تو کیا؟ میں جانتا ہوں، وہ چل رہے ہیں، بقائمی ہوش وحواس چلے جارہے ہیں۔ ان کی کار فراٹے بھرتی چلی جارہی ہے!

....

وکرم صاحب میرے بزرگ تھے اور یہ بات میں محض تکلف میں یا صرف آداب خورد و کلاں کی رعایت میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ مجھ سے عمر میں کم از کم 35 برس بڑے تھے۔ وہ سچ مچ میرے بزرگ تھے یوں کہ میں 1987 میں رسالہ 'آجکل' میں سب ایڈیٹر مقرر ہوا۔ تقریباً 23 برس پہلے اسی 'آجکل' میں بطور سب ایڈیٹر ان کی تقرری ہوئی تھی۔ لیکن جب میں نے آجکل کی پرانی فائل میں ان کا نام پہلی بار دیکھا تھا تب تک میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا، دیکھنا تو در کنار۔ پھر یہ ہوا کہ ان کو جاننے کا عمل شروع ہوا۔ میری ملازمت کا وہ غالباً دوسرا ہی مہینہ تھا۔ سابق ایڈیٹر مہدی عباس حسینی صاحب کے کئی تبصرے موصول ہوئے۔ ایک تبصرہ 'عالمی اردو ادب' (مولفہ: نند کشور وکرم) کے پہلے شمارے پر تھا۔ یہ 1985 کا انتخاب تھا جو 1986 میں چھپا تھا۔ یہ اپنی طرز کا ایک الگ قسم کا مجلہ تھا جس میں سال بھر کے بہترین افسانوں، غزلوں، نظموں کا انتخاب تھا۔ ساتھ ہی سال بھر میں شائع ہونے والی اردو کتابوں کی فہرست، وفیات، کچھ منتخب ادیبوں کے سوانحی کوائف اور سال بھر کے کچھ اور اہم حقائق درج کیے ہوئے تھے، جسے مہدی عباس حسینی صاحب نے ریفرنس کی کتاب کہا تھا لیکن مجھے تو اس میں سال بھر کا کم وبیش بہترین ادب، ہندوستان و پاکستان دونوں کا، یکجا مل گیا تھا۔ مجھے بعد میں وکرم صاحب نے بتایا کہ پہلا انتخاب 1982 کا تھا جو 'اردو 83' کے نام سے چھپا تھا، جس کے سرنامے پر 'اردو کا واحد حوالہ جاتی مجلہ' لکھا تھا۔ لیکن اس نام کا ڈکلیریشن نہیں ملا تو انھوں نے اسے 'عالمی اردو ادب' کے نام سے 85 سے نکالنا شروع کیا۔ میں بھول نہیں سکتا کہ انتظار حسین کا

افسانہ 'زناری' پہلی بار میں نے وکرم صاحب کے مجلّہ 'اردو 83' میں ہی پڑھا تھا۔ اس افسانے کو پڑھ کر ہی میں پہلی بار انتظار حسین کا اس طرح قائل ہوا کہ آج تک ہوں۔ ('زرد کتا' اور 'شہر افسوس' بعد میں پڑھے۔) آج بھی جب میں انتظار حسین کے بارے میں سوچتا ہوں تو سب سے پہلے مجھے زناری ہی کا خیال آتا ہے اور کہانی یاد آتی ہے تو عالمی اردو ادب یاد آتا ہے اور عالمی اردو ادب کے ساتھ نند کشور وکرم صاحب نگاہ میں آجاتے ہیں۔ تبصرہ چھپ کر آیا تو نند کشور وکرم صاحب دفتر آئے۔ میں نے انھیں دیکھا۔ بھرے بھرے بدن، گوری رنگت اور اوسط قد وقامت والے نند کشور وکرم صاحب۔ ان دنوں وہ پی آئی بی میں متعین تھے۔ اور انھیں میری تقرری کی اطلاع تھی۔ اس لیے وہ سینئر ہونے کے باوجود مجھ سے کچھ اپنائیت سے ملے۔ یہاں تک کہ میں یہ سمجھا کہ موجودہ مدیر راج نرائن راز کے بعد غالباً وہی آجکل کے ایڈیٹر ہوں گے۔ ان کی عمر کم لگ رہی تھی یا کم از کم اتنی زیادہ نہیں لگ رہی تھی کہ میں اندازہ لگاتا کہ وہ راز صاحب سے پہلے ہی ریٹائر ہوجائیں گے۔ وہ ستمبر 1987 میں ریٹائر ہوئے اور پھر پوری طرح سے اردو ادب کے ہوگئے۔ عالمی اردو ادب جو سال میں ایک بار نکلتا تھا اس کے لیے وہ سال بھر لگے رہتے۔ ان دنوں آج کی طرح انٹرنیٹ کی سہولت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک بہت بڑی آسانی تھی کہ پاکستان سے نکلنے والے متعدد رسائل— فنون، سیپ، صریر، ادب لطیف، اوراق، افکار، تخلیق وغیرہ پابندی سے ہندوستان آتے تھے۔ تقریباً سارے رسالے ان کے پاس آتے تھے اور وہ ہر رسالے کو پڑھ کر اپنی پسند کے اعتبار سے اچھی تحریریں اپنے سالانہ انتخاب کے لیے نکالتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے تمام رسائل تو خیر ان کے پاس آتے ہی تھے۔ یوں عالمی اردو ادب سچ مچ عالمی ہوگیا۔ ان کے پاس بہت سی کتابیں بھی آتی تھیں۔ صرف ہندوستان سے ہی نہیں پاکستان سے بھی۔ عالمی اردو ادب کو حوالہ جاتی مجلّہ بنانے میں جٹ گئے تو یوں کہ اکیلے ہی اردو دنیا سے متعلق ساری معلومات اکٹھا کرنے لگے۔ خود لکھتے، خود پروف پڑھتے، خود چھپواتے اور سب کو بھجواتے۔ وکرم صاحب بے لوث کام کرنے والے تھے۔ اپنی گانٹھ سے لگا کے کرنے والوں میں سے تھے۔ سالانہ عالمی اردو ادب کے بعد انھوں نے ہر سال عالمی اردو ادب کا ایک موضوعاتی شمارہ بھی الگ سے نکالنے کا منصوبہ بنالیا۔ گویا اب سال کے دو شمارے ہوگئے۔ پانچ چھ سو صفحے کے۔ پہلا شمارہ انھوں نے حبیب جالب پر نکالا۔ پھر احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، دیویندر اسر، گوپی چند نارنگ اور کئی دیگر شخصیات پر شمارے نکال کر جیسے ان کی سیری نہیں ہوئی تو انہوں نے ایک شمارہ ہندوستانی سنیما پر نکالا اور ایک شمارہ اردو میں مذہبی لٹریچر پر نکالا۔ اس میں انھوں نے اسلام کے علاوہ جو برصغیر کے مذاہب ہیں— ہندومت، سکھ مت، بودھ مت، عیسائیت، جین مت— ان کا جو مذہبی لٹریچر اردو میں لکھا گیا یا ان کے صحائف/ مقدس کتابوں کے اردو میں جو ترجمے ہوئے ان سب کے بارے میں اجمالی طور پر معلومات یکجا کردیں۔ اردو میں اجے مالوی نے دو نہایت عمدہ کتابیں تالیف کی ہیں، ایک 'ویدک ادب اور اردو' اور دوم' ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز'۔ یہ دونوں کتابیں صرف ہندومت کے اردو میں مطبوعہ لٹریچر سے متعلق ہیں۔ وکرم صاحب نے دیگر مذاہب کے لٹریچر کو بھی جوڑ لیا۔ میرا خیال ہے کہ جب اردو زبان کی وسعت دامانی اور وسیع المشربی پر کوئی حرف سوال آئے تو یہ تین کتابیں ہی مخالف کے لیے ایک مسکت جواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قومی یکجہتی کا یہ جو اتنا بڑا کام اور اس قدر خاموشی سے، بزرگوار نند کشور وکرم نے کیا، اس کے لیے ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ وہ بہت بے لوث ہوکر اردو زبان وادب کی خدمت اور ہندوستان پاکستان کے لوگوں کے دلوں کو جوڑنے کے لیے غیر سیاسی طور پر جو کام کرتے رہے تھے، وہ ان کا غیر معمولی کارنامہ ہے جس کی پذیرائی کا قرض ابھی اہل اردو پر واجب ہے۔

...اردو ادب سے ان کی محبت جیتے جی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں ہوئی۔ تا آنکہ فرشتہ اجل کا معانقہ کے لیے آ نہیں گیا۔ 27 اگست 2019 کو انھوں نے زندگی کو خیر باد کہا۔ یہ خبر میرے لیے اس قدر افسوس ناک تھی کہ دل نے ایک آہ بھری اور نطق نے زیر لب کہا: آہ بزرگوار نند کشور وکرم۔ لگتا ہے ہم ہی مرگئے اور یہ افسوس کرنے والا کوئی اور ہے۔

17 ستمبر 1929 کو راولپنڈی (موجودہ پاکستان) میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ بیس دن اور جینے کی مہلت مل گئی ہوتی تو 90 سال پورے ہوجاتے۔

نند کشور وکرم صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ پہلا افسانہ بعنوان 'ادیب' دسمبر 1947 میں افسانہ' ماہنامہ 'نرالا' نئی دہلی میں شائع ہوا۔ صحافتی زندگی کی ابتدا 1948 میں ہوئی جب وہ کانپور میں میلا رام وفا کی ادارت میں شائع ہونے والے روزنامہ 'قومی اخبار' اور 'امرت' سے وابستہ رہے۔ 1949 میں کانپور ہی سے دیویندر اسر کے اشتراک سے ماہنامہ ارتقا کا اجرا کیا جو بوجوہ بند ہوگیا۔ 54-1953 میں نئی کہانی کی ادارت کی۔ 1964 تا 1979 رسالہ 'آجکل' نئی دہلی میں بحیثیت سب ایڈیٹر/ اسسٹنٹ ایڈیٹر وابستہ رہے۔ 1985 سے تا دم مرگ اُردو کا واحد حوالہ جاتی مجلّہ 'عالمی اُردو ادب' شائع کرتے رہے۔ 1987 میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے خود کو علمی وادبی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ اردو میں درجنوں کتابوں کی ترتیب و تالیف کی۔ افسانے اور ناول لکھے۔ مضامین لکھے۔ اردو سے ہندی، ہندی سے اردو، پنجابی سے اردو، انگریزی سے اردو میں درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے۔ ان کی تمام ادبی خدمات کا جائزہ لینا تو بڑی بات فرداً فرداً تذکرہ بھی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔

اردو ادب سے ان کی محبت جیتے جی ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں ہوئی۔ تا آنکہ فرشتہ اجل کا معانقہ کے لیے آ نہیں گیا۔ 27 اگست 2019 کو انہوں نے زندگی کو خیر باد کہا۔ یہ خبر میرے لیے اس قدر افسوس ناک تھی کہ دل نے ایک آہ بھری اورنطق نے زیر لب کہا: آہ بزرگوار نند کشور وکرم۔ لگتا ہے ہم ہی مرگئے اور یہ افسوس کرنے والا کوئی اور ہے۔

نند کشور وکرم صاحب بے لوث ہوکر اور خاموشی سے کام کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پذیرائی ذرا تاخیر سے ہوئی۔ لیکن جب ہوئی تو خاصی ہوئی، غالب انعام، دوحہ قطر انعام، تخلیقی نثر کا انعام...بے شمار اعزازات وانعامات سے نوازے گئے۔ ہندوستان و پاکستان کے کئی رسالوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ان پر خصوصی شمارے/ گوشے شائع کیے۔

ان کی وفات کی خبر سے ہند و پاک کی ادبی دنیا سوگ میں ڈوب گئی۔ نند کشور وکرم جیسے مخلصین ادب اپنے پیچھے جو خلا چھوڑ جاتے ہیں اسے پر نہیں کیا جا سکتا۔ رہے نام اللہ کا۔

Khurshid Akram
115, Type-4, Sector-3
Sadiq Nagar
New Delhi-110049

اشتیاق سعید

کس نے کہا وجود مرا خاک ہوگیا
کبیر اجمل

''یقین نہیں آتا کہ کبیر اجمل ہمارے درمیان نہیں رہے'' 29 جون کو غالباً دوپہر 12 بجے فیس بک پر محترم یعقوب یاور کی یہ پوسٹ دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا اور انا یاس ہی لب بدبدائے۔''یہ کیا مذاق ہے'' اسی کے ساتھ میں نے فوراً یعقوب یاور صاحب کو فون لگایا۔ چند لمحے ٹوں ٹوں سی آواز سُنائی دیتی رہی پھر آؤٹ آف کوریج ایریا کا اعلان گونجا۔ میں نے فوراً فون ڈسکنیکٹ کیا اور کبیر اجمل کے بے حد عزیز دوست اور ہم سایہ خالد جمال صاحب سے رابطہ کرنا چاہا، ان کا فون مصروف تھا۔ پھر پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے تین مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی، رابطہ نہ ہوا۔ اسی دوران 'نئی صدی' کے مدیر فرخ شاہد کا فون آگیا۔ میں نے جھٹ کال ریسیو کی۔ ابھی سلام کر ہی رہا تھا کہ اُن کی بھرّائی ہوئی آواز گونجی۔

''اشتیاق، کبیر اجمل کا انتقال ہوگیا''۔

میں نے بھی کھرکھراتی آواز میں استفسار کیا۔

''کیسے... کیا ہوا تھا؟''۔

''تمھیں تو پتہ ہے ہی کہ وہ گزشتہ پانچ چھ برس سے ڈائبٹک (Diabetic) تھے۔ اِدھر سال بھر سے بیمار رہنے لگے تھے۔ لوکل ڈاکٹروں سے علاج و معالجہ ہوتا تھا۔ پندرہ بیس دنوں کے لیے ٹھیک بھی ہوجاتے تھے۔ پھر طبیعت اُلجھنے لگتی اور نقاہت اس قدر محسوس ہوتی کہ کچھ کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔ اسی سبب لوگوں سے ملنے جلنے سے بھی احتراز کرنے لگے تھے۔ یہ کیفیت جب حد پار کرگئی تو لاک ڈاؤن سے قبل یعنی مارچ کے دوسرے ہفتے میں برائے علاج بنگلور گئے تھے۔ وہاں مکمل جسمانی جانچ کی گئی تو ریڑھ کے کینسر کا انکشاف ہوا۔ اِدھر مہینے بھر سے بنارس کے شیو پوروا، اولڈ لوکو کالونی میں واقع ٹاٹا میموریل ہاسپٹل میں زیرِ علاج تھے۔ حالت انتہائی تشویشناک تھی۔ 28 اور 29 جون کی درمیانی شب تقریباً ایک بجے انھوں نے آخری سانس لیا''۔

فرخ شاہد مزید کیا کچھ کہتے رہے مجھے خیال نہیں۔ کیونکہ میرا ذہن اُن کے اس شعر کی بھول بھلیاں میں اُلجھ چکا تھا۔

میں زندہ شخص تجھے مر کے یہ سزا دوں گا
گلابی آنکھوں میں نمناکیاں سجا دوں گا

بے شک! کبیر اجمل کے تعلقاتی، ملاقاتی، دوست و احباب اور عزیز و اقارب میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جن کی آنکھیں ان کے سانحۂ ارتحال پر نم نہ ہوئی ہوں، دل ماتم کناں نہ ہوا ہو۔ کیونکہ اُن کا دل مضطرب انتہائی حساس، دردمند، خلوص و وفا، محبت واپنائیت سے لبریز تھا، لہجہ بھی از حد نرم و ملائم تھا۔ جب بھی گفتگو کرتے آواز اس قدر نیچی اور دھیمی ہوتی کہ سُننے والے کو ہمہ تن گوش ہونا پڑتا۔ علاوہ ازیں گفتگو کرتے ہوئے ان کی نگاہیں سامنے والے کے چہرے پر مرکوز ہوتیں اور آنکھوں سے خلوص و محبت کے شرارے چھوٹتے رہتے، لفظوں کی ادائی سے گل افشانیوں کا گمان نیز لہجے میں عطر و پھلیل کا رچاؤ معلوم ہوتا۔ چہرے نے شاید ہی غصہ، ناراضی، خفگی یا ناگواری کے تاثرات محسوس کیا ہو۔ اب ایسا بھی نہیں کہ وہ غصہ، ناراضی، خفگی اور ناگواری جیسی حِس سے ماورا تھے۔ یہ سارے تاثرات ہی تو انسانی فطرت کے اہم جُز ہیں جو آدمی کو انسانی شناخت عطا کرتے ہیں اور فرشتوں سے جُدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر چند ان تاثرات کا برملا اظہار انسانی کمزوری کا حصّہ ہے۔ جبکہ انھیں اپنے وجود میں جذب کر لینے والا انسان ہی انسانیت کی معراج کو پہنچتا ہے۔ کبیر اجمل میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ جس کسی پر خفا ہوتے یا غصہ آجاتا تو فوراً چپی سادھ لیتے اور پھر اُس کی جانب انتہائی محبت اور اپنائیت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہتے۔''اچھا تو ابھی جاؤ، ہم تم سے بعد میں بات کریں گے''۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ پھر وہ بعد کبھی نہیں آتا رہا ہوگا، وہ سارا معاملہ اس طرح فراموش کردیتے رہے ہوں گے جیسے کمپیوٹر کی اسکرین پر درج اپنا ہی کوئی شعر پسند نہ آنے کی صورت میں ڈیلیٹ کردیا کرتے تھے۔ نکتہ چینی، تنقید یا تنقیص بھی ان کے مزاج کا حصّہ کبھی نہیں رہا۔ انھوں نے اس کی ترجمانی اپنے ایک شعر کے توسط سے کچھ یوں کی ہے۔

اجمل تُو کسی پر کبھی تنقید نہ کرنا
انسان سبھی کچھ ہے فرشتہ نہیں ہوتا

کبیر اجمل سے میری پہلی ملاقات 25 فروری 2009 کو جموں میں ساہتیہ اکادمی کے 'یوا لیکھک سمیلن' میں ہوئی تھی۔ واقعہ یوں ہے کہ جموں میں ہمارے قیام و طعام کا انتظام ''ہوٹل ہیریٹیج'' میں کیا گیا تھا۔ میں جب ہوٹل پہنچا تو استقبالیہ پر ساہتیہ اکادمی کی سیکریٹری رینو جی موجود تھیں۔ انھوں نے میرا خیر مقدم کیا اور کمرہ نمبر پانچ کی چابی دیتے ہوئے کہا۔ آپ کے ساتھ کبیر اجمل صاحب کمرہ ساجھا کررہے ہیں اور وہ صبح ہی آچکے ہیں۔ غالباً تفریح کے لیے اطراف ہی میں کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آپ جلدی سے فریش ہوجایئے پھر میں آپ کو ناشتہ بھجواتی ہوں۔

کمرہ گراؤنڈ فلور پر ہی واقع تھا۔ کافی کشادہ، دلکش اور پُرتعیش۔ میں نے اپنا بیگ الماری میں رکھا اور نرم و ملائم بستر پر دراز ہوکر سوچنے لگا کہ یہ کبیر اجمل صاحب ہیں کون؟ نام تو نہ کہیں سُنا نہ پڑھا... کہاں سے آئے ہیں... مزاجاً کیسے ہوں گے... ضعیف العمر تو نہیں۔ چار روز انھیں کے ساتھ اسی کمرے میں گزارنا ہے۔ اگر میری طبیعت اور مزاج کے موافق نہ ہوئے تو کیونکر نباہ ہوسکے گا؟۔

ابھی میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک ہشاش بشاش اور خوش لباس جوان شخص کو کھڑا پایا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سے چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ ساتھ ہی ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا بھی تھا۔ ہم دونوں چند لمحات ایک دوسرے کو کچھ اس انداز سے نہارتے رہے گویا آپس میں پہچان کی کوئی رمق تلاش رہے ہوں۔ مگر اُس شخص کے لبوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اپنائیت

کے سوا کوئی اور تاثر نہ تھا۔ پھر میں نے انتہائی عقیدت اور خاکساری سے استفسار کیا۔

’’آپ کبیر اجمل صاحب ہیں؟‘‘۔

’’جی ! اور یہ شکیل اجمل خلفِ اکبر‘‘ لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

میں نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔’’میں اشتیاق سعید، ممبئی سے‘‘

انھوں نے میرا ہاتھ تپاک سے تھام لیا اور دریافت کیا۔’’آپ بمبئی سے ہیں تو ساجد رشید کو ضرور جانتے ہوں گے؟‘‘۔

’’بھئی وہ میرے مربّی ہیں۔انھیں کی عنایتوں کے طفیل میں یہاں آیا ہوں‘‘۔

’’میرے سر پر بھی انھیں کا دستِ شفقت ہے‘‘۔ کہتے ہوئے وہ کھِل کر مسکرائے۔

پھر ہم کمرے میں آگئے۔وہ بیڈ کی پُشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے جبکہ میں قریب رکھے صوفے پر دراز ہوگیا۔اُن کا بیٹا شکیل اجمل بیڈ کے دوسری طرف رکھی کُرسی پر براجمان ہوا اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ اس دوران کبیر اجمل میری جانب متوجہ ہوئے۔

’’پھر تو آپ الیاس شوقی کو بھی جانتے ہوں گے؟‘‘

’’جی بالکل! شوقی صاحب سے تو میری آئے دن ملاقات ہوتی ہے۔ کیونکہ میں بھی کُرلا میں ہی رہتا ہوں،اُن کی اور میری رہائش کے درمیان محض پانچ سات منٹوں کا فاصلہ ہے‘‘۔

میرے اس جملے پر اُن کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور لبوں نے جنبش کی۔

’’الیاس شوقی میرے ماموں ہوتے ہیں، انھیں کے توسط سے میرا ساجد رشید سے تعارف ہوا ہے‘‘۔

’’اوہ، پھر تو آپ کا تعلق بنارس سے ہوگا؟‘‘۔

’’جی !...اور آپ کا؟‘‘۔

’’بھئی کچھ حد تک تو میرا بھی تعلق بنارس ہی سے ہے،لیکن میں شہر سے چالیس کلو میٹر دور دیہات کا رہنے والا ہوں‘‘۔

اس کے بعد تو ہم میں اتنی گاڑھی چھننے لگی کہ وہ جب بھی باہر جاتے مجھے ضرور ساتھ لیتے۔حتیٰ کہ لنچ اور ڈنر کے لیے بھی ہم ساتھ ہی ہوٹل کے ریسٹورنٹ جاتے۔

دوسرے روز مجھے افسانہ پڑھنا تھا۔میرے علاوہ ہندی، پنجابی، ڈوگری اور انگریزی کے افسانہ نگار ڈائس پر موجود تھے۔ مجھے آخر میں پڑھوایا گیا پھر صدارتی خطبے کے بعد پروگرام کا اختتام ہوا،اسی کے ساتھ تمام لوگ ڈنر کے لیے ہال سے ملحق کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔کئیوں نے مبارکبادیاں پیش کیں،مبارک سلامت کے درمیان جوں ہی ڈائس سے نیچے آیا کبیر اجمل نے مجھے آلیا اور اس گرم جوشی سے مجھے اپنے سینے سے بھینچا گویا وہ اپنے سینے میں مچل رہے انجانے طوفانوں کو میرے سینے میں منتقل کردینا چاہ رہے ہوں۔’’اشتیاق تم نے دل جیت لیا‘‘ کہتے ہوئے الگ ہوئے اور میرا ہاتھ تھام کر کھانے کے کمرے کی جانب بڑھنے لگے۔ پھر کھانے کی میز پر اُنھوں نے قدرے مدھم لہجے میں پوچھا۔’’آپ کا کوئی مجموعہ آیا ہے؟‘‘

’’جی! گزشتہ سال ہی آیا ہے’’نل جوتا‘‘ کے نام سے‘‘۔

’’اچھا ٹائیٹل ہے، بالکل ہٹ کر، مجھے ضرور دینا‘‘۔

’’میں تو رات ہی آپ کی خدمت میں بصد خلوص پیش کرنا چاہا تھا،لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ پتہ نہیں آپ پسند کریں نہ کریں،یوں بھی لوگ سفر میں کتابوں کا بوجھ کم پسند کرتے ہیں، بہت سے شعرا اور ناقدین تحفتہً دی گئیں کتابوں کو ہوٹل کے کمروں میں ہی چھوڑ جاتے ہیں‘‘۔

میری بات پر کبیر اجمل اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے تھے،پھر انتہائی تحمّل لہجے میں گویا ہوئے۔’’غالباً یہی نظریہ میرا اپنا بھی ہے، بہر حال! مجھے اپنی کتاب دیجیے گا اور میں بھی اپنا شعری مجموعہ’منتشر لمحوں کا نور‘ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا‘‘۔

اسی سال اکتوبر کی آخری تاریخوں میں میرا بنارس جانا ہوا۔میں نے کبیر اجمل کو فون سے اطلاع دی اور کہا۔’’بھیلو پور تھانے کے پاس کھڑا ہوں۔آپ کے یہاں کیسے آنا ہے؟ سُن کر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا’’وہیں کھڑے رہیے،پانچ منٹ میں شکیل اجمل وہاں پہنچ رہے ہیں‘‘۔

واقعی شکیل اسکوٹر سے پانچ منٹ میں حاضر ہوگئے،اور مجھے اپنے ساتھ گلی در گلی ہوتے گھر لے آئے۔

عرض کردوں کہ بنارس محض مندروں اور گھاٹوں کے لیے ہی مشہور نہیں ہے بلکہ بنارسی ساڑیوں، بنارسی سوئیوں، بنارسی پانوں، ٹھگوں، فنونِ لطیفہ اور سکری سکری گلیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔بے شک ! یہاں کی گلیاں سکری ضرور ہیں لیکن ان گلیوں کے مکینوں کے دل و ذہن کافی کشادہ ہیں۔اسی سبب ان گلیوں میں ہمہ وقت دلکشی کا راج ہوتا ہے، رونقیں ڈولتی پھرتی ہیں اور زندگی رقص کُناں معلوم ہوتی ہے۔

کبیر اجمل نے مجھے معروف شاعر خالد جمال سے ملوایا۔دونوں کے مکان بالکل آمنے سامنے ہیں،اس لحاظ سے دونوں ہی ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں۔خالد جمال پیشے کے اعتبار سے کتان کے ڈیلر ہیں،ان کا کاروبار کافی پھیلا ہوا ہے۔علاوہ ازیں حرفوں کے تانے بانے پر لفظوں کی کتان سے غزلوں کے خوبصورت دوشالے بھی بُنتے ہیں۔’’شریکِ حرف‘‘ ان کا اوّلین مجموعہ کلام ہے۔بڑے ہی سادہ لوح، منکسر المزاج، انتہائی نفیس اور نستعلیق قسم کے آدمی ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے بھی کبیر اجمل کی طرح شاعری کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا البتہ کچھ ضرور بنا لیا ہے۔ جسے ضرورت کے تحت بچھاتے ہیں اور اوڑھ بھی لیتے ہیں۔

کبیر اجمل ہی کے ہمراہ میں پہلی بار بنارس ہندو یونیورسٹی گیا اور وہاں یعقوب یاور صاحب سے ملاقات کی جو اُن دنوں شعبۂ اُردو کے صدر تھے۔ یعقوب یاور کی ترجمہ کردہ انگریزی مصنف ہیری شارپے کی خودنوشت ’پاپیلاں‘ سال بھر قبل پڑھ چکا تھا، چنانچہ یعقوب یاور میرے لیے انجان نہیں تھے، برائے گفتگو میں نے یاور صاحب سے’پاپیلاں‘ کا ذکر کیا۔ترجمہ کی خوبی نیز زبان و بیان کی سلاست اور سادگی کے ساتھ ساتھ دوسرے کئی اہم نکات پر تادیر روشنی ڈالتا رہا۔میری باتوں سے انھیں خوشی حاصل ہوئی یا نہیں، مجھے اس کا قطعی علم نہیں، کیونکہ اُن کا چہرہ بالکل ساکت تھا۔ البتہ کبیر اجمل بہت خوش ہوئے تھے۔ بہر حال ! وہاں سے لوٹتے ہوئے میں نے اصلاحی اور روایتی افسانہ نگار سعید فریدی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔کبیر اجمل نے کہا۔

’’فریدی صاحب سے ملنا کوئی مسئلہ نہیں ہے، کیونکہ وہ ہمارے بغل کے محلّہ ’’ماتی باغ‘‘ میں رہتے ہیں‘‘۔

وہ مجھے سعید فریدی کے مکان پر لے گئے۔افسوس کہ اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔پھر بغل کی گلی میں داخل ہوتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

’’شاد عباسی صاحب کو جانتے ہیں؟‘‘۔

’’وہی شاد عباسی جنھوں نے’مدن پورہ کی انصاری برادری‘ پر بڑا ہی چیلنجنگ اور جامع کام کیا ہے۔جس کی غالباً دو جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں‘‘۔

’’بالکل ! یہ ان کا بہت ہی اہم کام ہے، جسے انھوں نے انتہائی عرق ریزی سے انجام دیا ہے‘‘۔ کہتے کہتے کبیر اجمل ایک مکان کے برآمدے میں داخل ہوگئے۔وہاں موجود شخص نے انھیں دیکھتے ہی پرتپاک خیر مقدم کیا۔کبیر اجمل نے اُس شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

’’ آپ ڈاکٹر سلمان راغب ہیں، شاد عباسی صاحب کے بڑے صاحبزادے‘‘۔ پھر میرا تعارف پیش کیا۔سلمان مجھے نہ صرف نام سے جانتے تھے بلکہ میرے دو ایک افسانے بھی پڑھ رکھے تھے،چنانچہ ہمارے درمیان سے اجنبیت کا پردہ ہٹ چکا تھا۔چائے پانی کے دوران معلوم ہوا کہ شاد عباسی صاحب کسی رشتہ داری میں گئے ہیں اور شام تک لوٹنے کی توقع ہے۔بہر حال! سلمان نے مجھے ’’مدن پورہ کی انصاری برادری‘‘ کی

دونوں جلدیں مرحمت فرمائیں جس کے لیے میں آج تک اُن کا بے حد ممنون ہوں کیونکہ متذکرہ کتاب بنارس اور انصاری برادری کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے ایک اہم اور دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ افسوس۔۔۔صد افسوس ! گزشتہ سال سلمان راغب بھی دُنیا چھوڑ گئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین

کبیر اجمل اور مجھ میں جو ایک بات مشترک ہے وہ ہے شب بیداری۔ میں بھی رات گئے تک جاگنے کا عادی ہوں اور وہ بھی! اس لیے میں جب بھی اُن کے یہاں ٹھہرتا، ہم رات گئے تک خوب باتیں کرتے اور چائے نوش کرتے رہتے جسے وہ پہلے ہی سے تھرمس میں بھروالیا کرتے تھے۔ میں نے تو سگریٹ کو کبھی مُنہ نہیں لگایا لیکن کبیر اجمل اس کثرت سے سگریٹ نوشی کرتے تھے گویا وہ ہر فکر کو دھویں میں اُڑا دینا چاہتے ہوں۔

ایک مرتبہ میں رات 9 بجے کے آس پاس اُن کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں ایک انگریز کو بیٹھا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ وہ نہایت شستہ اور فصیح اُردو میں گفتگو کر رہا تھا۔ میری پیشانی پر حیرانی کی سلوٹیں دیکھ کر کبیر اجمل مسکراتے ہوئے اُس انگریز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''آپ جناب کرسٹوفر لی ہیں۔ آپ کا تعلق جرمنی سے ہے۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ آپ اُردو میں مشرقی علوم پر تحقیق کر رہے ہیں۔ گزشتہ دس برس سے متواتر ہندوستان آتے ہیں اور بنارس کو ہی اپنا مسکن بناتے ہیں''۔

مجھے ان سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ انھیں شعر و ادب سے بھی خاصا شغف تھا۔ انھیں ڈھیروں اشعار ازبر تھے علاوہ ازیں ادب کی ہر صنف پر گہری نظر تھی۔ ہم تادیر ادب کی فنی باریکیوں نیز تنقیدی رویّوں پر گفتگو کرتے رہے اور رات کو چائے کی پیالیوں میں گھولتے رہے۔ رہ رہ کے کبیر اجمل اور کرسٹوفر لی دونوں حضرات رات کو دھویں میں تحلیل کرنے کا بھی جتن کرتے رہے۔ رات قریب دو بجے کبیر اجمل نے مجھ سے کہا۔

''آپ چاہیں تو فجر تک گفتگو کا سلسلہ دراز رہے گا، کیونکہ کرسٹوفر بھی ہماری طرح شب بیداری کے عادی ہیں''۔

اسی کے ساتھ ہماری باتوں کا رُخ شب بیداری کی جانب مُڑ گیا۔ باتوں ہی باتوں میں کبیر اجمل نے کہا۔ ''بھئی مجھے تو انسومنیا (Insomnia) کا عارضہ ہے۔ اس لیے رات گئے تک جاگتا ہوں۔ اشتیاق صاحب میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ آپ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ پھر آپ کی شب بیداری کی وجہ؟''۔

''بھئی، محض میں اس لیے جاگتا رہتا ہوں۔ بقول انور شعور

یہ سوچ سوچ کر رات بھر نیند نہیں آتی
شہر میں کوئی تو ہو، جسے بیدار کہا جائے

اس پر کرسٹوفر قہقہہ زار ہوگئے جبکہ کبیر اجمل کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کچھ گہری ہوگئی۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد کبیر اجمل نے کہا اس نوعیت کا ایک شعر میں نے بھی کہا ہے، ملاحظہ فرمائیں''۔

''ارشاد''۔ کرسٹوفر کے حلق سے بے ساختہ آواز نکلی۔

''عرض کیا ہے۔

شہر میں اور بھی ہیں جن کا لہو ہے بیدار
میں ہی آوارہ فقط رات کی گرہیں کھولوں

اسی قبیل کا ایک شعر اور یاد آگیا ہے۔

زندہ مرے ہی دم سے تھیں رعنائیاں تمام
میں سو گیا تو شہر ہی ویران ہو گیا

کبیر اجمل فائن آرٹ کے طالب علم رہے ہیں۔ جہاں انھوں نے حروف کی مدد سے اپنے خیال کو شعری پیکر عطا کیا ہے وہیں برش اور رنگوں کے تعاون سے اپنے خیال کی تشکیل پینٹنگس کی صورت میں بھی کی ہیں۔ پہلے پہل اپنی اس فنی صلاحیت کو مشغلے کے طور پر برتتے رہے، پھر شدہ شدہ اسے ذریعۂ معاش بنالیا، اور کمپیوٹر پر طرح طرح کے رنگوں کی مدد سے ڈیزائن بنانے لگے۔ ان کی بنائی ڈیزائنیں بنارسی ساڑیوں کے گرہستہ اور گدّی داروں کو خوب بھاتیں لہٰذا وہ بنارسی ساڑیوں کو پیک کیے جانے والے دفتی یا گتّے کے ڈبوں کو پُر کشش اور جاذبِ نظر بنانے کے لیے اُن پر ان ڈیزائنوں کو پرنٹ کرواتے۔

کبیر اجمل کا شمار بنارس کے چند بہترین پیشہ ور آرٹسٹوں میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے انھوں نے اپنے پیشے کی عکاسی ایک شعر میں کچھ یوں کی ہے۔

کہوں کیا تم سے تنہائی میں بیٹھا کیا بناتا ہوں
لکیریں کھینچ کر جینے کا منصوبہ بناتا ہوں

یقیناً کبیر اجمل نے صفحۂ قرطاس پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کھینچ کر ہی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ پہلے پہل اسکرین پرنٹنگ کا کام شروع کیا۔ وزیٹنگ کارڈ سے لے کر ویڈنگ کارڈ تک کی ڈیزائن بناتے اور انھیں چھاپتے رہے۔ پھر گاہے گاہے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنے اشاعتی ادارے کا نام ''اسکرین پلے'' تجویز کیا۔ اسکرین پلے فلم رائٹنگ کی ایک اصطلاح ہے۔ جسے اُردو میں منظر نامہ اور ہندی میں پٹ کتھا کہا جاتا ہے۔ اسکرین پلے ہی کے توسط سے کہانی کو تکنیکی طور پر وسعت دے کر ایک مخصوص خاکہ ترتیب دیا جاتا ہے جس میں کرداروں کے زمان و مکان، حرکات وسکنات نیز مکالموں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

بہر کیف! کبیر اجمل بھی 'اسکرین پلے' کے ذریعے اپنی طرز زندگی اور معیشت کو وسعت دینے میں مجتہد تھے۔ بظاہر وہ کمپیوٹر اسکرین پر نت نئے رنگوں کے امتزاج سے طرح طرح کے جہان آباد کرتے رہے۔ بدلے میں مادّی قوت انھیں پروان چڑھاتی رہی، کاروبار بڑھتا گیا، دولت کی ریل پیل ہوتی رہی۔ رنگوں کی اس ہیرا پھیری میں شاید وہ یہ فراموش کر بیٹھے تھے کہ کبھی انھوں نے حروف والفاظ کی بھی دُنیا آراستہ کی تھی جہاں لمحے منتشر ہوکر نور بکھیرا کرتے تھے۔ جہاں فکر وشعور کا لامتناہی سلسلہ ہوا کرتا تھا۔ جہاں تمنائیں ادراک کا بار ڈھوتے ڈھوتے تھک کر حسیت کے دوشالے میں ڈبک جایا کرتی تھیں۔ جہاں لمحے ماضی کے شبستانوں میں رات کی گرہیں کھولا کرتے تھے۔ حیف! جب حواس بجا ہوئے تو احساس جگا کہ رنگوں کی بازیگری نے انھیں کلر بلائنڈ کردیا ہے، زندگی کی تمام رنگینیاں نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہیں۔ مزید برآں وقت کا سرمایہ بھی آہستہ آہستہ حالات کی مٹھی سے آگہی کی ریت کی مانند پھسلتا جارہا ہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ زندگی کو وسعت دے کر سمندر کی خواہش کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ سمندر تو خود پیاسا ہے، وہ دوسروں کی تشنگی کو کیونکر سیراب کرسکتا ہے۔

کبیر اجمل نے خواہشات کے جگمگاتے دائرے میں زندگی کا زاویہ تلاش کرنے میں عمر گنوادی۔ شاید انھیں یہ علم نہ رہا ہوگا کہ زاویے دائرے میں نہیں مثلث میں ہوا کرتے ہیں۔ اگر علم ہوتا تو یقیناً خواہشات کے اس دائرے میں ضرور قناعت کا مثلث بنانے کی کوشش کرتے۔ یا پھر اپنی ذات کے جنگل میں ادراک کی کوئی ہُما ہی تلاش کرلیتے تو ممکن ہے مزاج میں قناعت کی شہنشاہی در آتی۔ برخلاف اس کے وہ خود کو بے نیاز رفتہ وآئندہ تصوّر کرتے ہوئے خطۂ بے نور کا باشندہ گردانتے رہے۔ بہر حال! زندگی نے کب کس کے ساتھ وفا کیا ہے جو کبیر اجمل کے ساتھ کرتی، تاہم کبیر اجمل اُن لوگوں میں سے تو نہیں تھے جن کا وجود مر کے خاک ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی رچی ہوئی شعری کائنات میں ''منتشر لمحوں کا نور'' بن کر تا قیامت جگمگاتے رہیں گے۔ شاید اسی لیے انھوں نے کہا بھی ہے۔

کس نے کہا وجود مرا خاک ہوگیا
میرا لہو تو آپ کی پوشاک ہوگیا

■

Ishtiyaque Saeed
B-01, New Mira Paradise
Geeta Nagar, Phase-II, Mira Road
Thane-401107
Cell. : 09930211461
E-mail : ishtiyaquesaeed@rediffmail.com

غمی دائم کی نشتریت

(نصرت ظہیر پر تعزیتی نوٹ)

آبگینہ عارف

یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ زندہ لوگوں پہ تبصرے اور تذکرے ان کے جانے کے بعد ہی لکھے جاتے ہیں جب کہ اس کی ضرورت زندگی ہی میں ہوتی ہے۔ بات نصرت ظہیر صاحب کی ہے اس لیے مجھے یہ لکھنا پڑا کیونکہ نصرت ظہیر بھی یہی چاہتے تھے کہ ایک ادیب اور اس کی کاوشوں کو اس وقت سراہا جائے جب وہ زندہ ہو۔ اور یہی ہوا بھی۔ 2013 میں طنز و مزاح کے مستند رسالے شگوفہ (حیدرآباد) نے نصرت ظہیر نمبر شائع کر کے نصرت صاحب کو ان کی زندگی میں نہ صرف روحانی خوشی عطا کی بلکہ ان کو زندہ جاوید کر دیا۔

یہ ان کی گفتگو کا ہی خاصہ تھا کہ وہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی شعور کی آگہی کے سبب سچ ہی کہتے تھے چاہے سننے والے کو پسند آئے یا نہیں۔ مزاح کی چاشنی میں لپٹا ہوا کڑوا سچ ان کی تحریر کو جاذب نظر بنا دیتا تھا۔ ہر خاص و عام ان کی تحریر کا قائل تھا۔ قاری جب ایک بار اخبار میں ان کے کالم کو پڑھنا شروع کر دے تو مجال ہے کہ کہیں سے بھی کچھ چھوٹ جائے۔ نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں انسانی سماج میں ہونے والی نا انصافیوں، ناہمواریوں اور تلخیوں کو اس طرح پیش کرتے کہ تبسم زیر لب ہوتا اور دل میں کچھ چبھن باقی رہ جاتی۔

آج جب میں ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو یاد آتا ہے کہ نصرت صاحب کی آمد قومی اردو کونسل میں اس وقت ہوئی جبکہ سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کو ایک ایسے قابل شخص کی ضرورت تھی جو مخمور سعیدی صاحب کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد سے شعبۂ ادارت کی ذمے داریاں سنبھالے۔ یہی وہ کڑی ہے جس کو میں جوڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ نصرت صاحب کی زندگی کا وہ وقت تھا جب وہ ساری دنیا دیکھ اور جی کر گوشہ عافیت چاہتے تھے۔ یہ اردو صحافی اور طنز و مزاح نگار مرحوم نصرت ظہیر کی زندگی کی آخری ملازمت تھی۔ قومی اردو کونسل برائے فروغ زبان کے صدر دفتر، دہلی میں شعبۂ ادارت سے ان کی وابستگی اور رخصتی دونوں ہی قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد انھوں نے بس گھر کا رخ کیا۔ سال 2010 مارچ کے مہینے میں جناب مخمور سعیدی کی اچانک رحلت سے نہ صرف پوری اردو دنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا بلکہ کونسل کے شعبۂ ادارت کی ذمے داری سنبھالنے اور کونسل سے شائع ہونے والے ماہانہ رسالہ 'اردو دنیا' اور 'فکر و تحقیق' کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ ایسے وقت میں ایک تجربہ کار اور باصلاحیت شخص کی اشد ضرورت تھی جو اپنے تجربے کی زرخیز زمین سے کونسل کے رسالوں کی آبیاری کر سکے۔ نصرت ظہیر ہی وہ نام تھا جس نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہت ایمانداری اور محنت سے اس عہدے کی ذمے داریوں کو نبھایا۔ وہ ایک Varstile اور ذہین شخص تھے۔

ان کی قومی اردو کونسل میں آمد اور کونسل کے صدر دفتر کی جسولہ اردو بھون میں منتقلی سب کچھ ایک ساتھ ہوا اور سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ مجھے بس اتنا یاد رہا کہ جب میں نے ماہانہ رسالہ اردو دنیا میں مخمور سعیدی صاحب کے لیے 'خالی کرسی' عنوان کے تحت مضمون لکھا جس میں میں نے اپنے دلی جذبات کی تصویر کشی کی تو اس وقت انھوں نے بھی مخمور بھائی کے نام سے ایک تاثراتی مضمون قلمبند کیا۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ گوشۂ مخمور سعیدی میں ان جیسا ماہر ادیب طنز و مزاح نگار مشمولات میں میرے بعد اپنا نام آخر میں لکھ رہا ہے۔ ان کے اس ایک عمل کو پرکھنے کی صلاحیت مجھ میں اس وقت نہیں تھی لیکن آج کی تاریخ میں ان کا یہ رویہ مجھے یہ سوچنے پہ مجبور کر گیا کہ ادبی نفسا نفسی کے اس عالم میں کون کس

نصرت ظہیر کے سیاسی طنزیے

آزادی کے بعد کے نثری طنز و مزاح نگاروں میں ظ انصاری، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مشفق خواجہ اور تخلص بھوپالی، کرنل محمد خان، مشتاق احمد یوسفی، وجاہت علی سندیلوی، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین اور خواجہ عبدالغفور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں ہر ایک کی اپنی الگ حیثیت اور جداگانہ مقام ہے۔ موجودہ دور میں اردو نظم و نثر کے طنز و مزاح نگاروں میں ساغر خیامی، انور سدید، خالد اختر، نریندر لوتھر، رحمن اکولوی، شکیل اعجاز، پرویز ید اللہ مہدی، عظیم اختر، اسد رضا اور نصرت ظہیر وغیرہ کے یہاں اس فن کے روشن امکانات ہیں۔

موجودہ دور میں نصرت ظہیر اپنے ہمعصروں سے اس لیے مختلف ہیں کہ ان کے یہاں سیاسی طنز سب سے زیادہ ہے۔ ویسے ان کے کالم میں سماجی اور اخلاقی قدروں پر بھی طنز ملتا ہے لیکن وہ سیاسی طنزیہ کالم نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور رہے ہیں کیونکہ ان کے سیاسی کالم قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے طنز و مزاح نگار ہیں جو ہمارے سماج میں ہونے والے واقعات و حادثات کے تمام پہلوؤں کو ایک خاص Aesthetic Distance سے دیکھتے ہیں اور ان میں چھپے منفی پہلوؤں کو طنز و مزاح کے پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور سماجی، سیاسی و معاشی ناہمواریوں، کمزوریوں، برائیوں اور شاطرانہ چالوں سے باخبر بھی۔

اپنے مقبول کالم 'غمی دائم' کے ایک مضمون 'جوتوں کا عالمی بھائی چارہ' (19 اپریل 2009) میں چاروں طرف ملک و بیرون ملک میں بڑے بڑے لیڈروں پر جوتے، چپل اور کھڑاؤں چلا کر عوام اپنی ناراضگی اور لیڈروں کے تئیں بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں وہیں نصرت ظہیر نے جوتوں، چپلوں اور کھڑاؤں کے درمیان عالمی بھائی چارہ قائم ہو جانے کی بات کہہ کر نہ صرف مزاح پیدا کیا ہے بلکہ عوام کو بھی ان جوتوں اور چپلوں سے سبق سیکھنے کی ترغیب دے ڈالی ہے جس میں غیر متحد سماج پر بہت بڑا طنز بھی ہے۔ نصرت ظہیر نے جوتے چپل کی واردات کو امریکی افسانہ جوفنتاسی سے بھرپور ہے سے جوڑ کر اس پورے مسئلے کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن اس سنجیدگی میں طنز و مزاح کی بے شمار لہریں موجود ہیں۔

— ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شگفتہ لمحے: خان رضوان، نصرت ظہیر اور حقانی القاسمی

اپنے طور وطرز کے واحد شخص: نصرت ظہیر

نصرت ظہیر میں وہ سائکوفنسی کبھی نظر نہیں آئی جو آج کے بیشتر ادیبوں کے ذہنی وجود کا حصہ بن چکی ہے۔ ان کے یہاں محبت اور نفرت کے دوہرے مفاہیم یا معیار نہیں ہیں۔ ان کا وجود منافقت کی کثافت سے آلودہ نہیں ہے۔ وہ محبت میں آگ کا دریا بھی پار کر سکتے ہیں اور نفرت میں آر پار کی جنگ بھی لڑ سکتے ہیں۔ ان کی کئی ادبی معرکہ آرائیاں بہت مشہور ہوئی ہیں مگر انھوں نے اس پالکس کو کبھی پرسنل نہیں بنایا۔

نصرت ظہیر اپنے طور وطرز کے واحد شخص ہیں۔ دل میں کسی کے لیے نہ کینہ رکھتے ہیں اور نہ سازشوں کا سفینہ بنانے کا ہنر انہیں آتا ہے۔ ان کے لیے محبت اور انسانیت ایک دائمی قدر کی حیثیت رکھتی ہے اور اختلاف کی عارضی اور عبوری اہمیت ہے۔ اختلاف ان کے نزدیک تعلق کو پرکھنے یا ناپنے کا پیمانہ نہیں ہے۔ ان کی محبت مشورے پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ عملی اقدامات کی منزل تک لے جاتی ہے۔ کسی بیمار کو وہ شفاخانہ کا پتہ نہیں بتاتے بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے مکمل علاج کے لیے اس میں داخل کرا دیا جائے۔ وہ اپنی محبت کا ثبوت زبان نہیں عمل سے دیتے ہیں اور محبت میں مفاد کو مدنظر نہیں رکھتے۔ اپنی ذات سے فیض پہنچانے میں وہ بخل سے کام نہیں لیتے۔ اس باب میں ان کا وطیرہ اوروں سے الگ ہے۔

نصرت ظہیر کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور دور سے بھی مگر دونوں میں کوئی دوری نظر نہیں آئی جبکہ اکثر شخصیات میں یہ دوری نمایاں نظر آتی ہے ان کی شخصیت نیم دروں نیم بروں ہے اور نہ ہی دولخت۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے میری جتنی والہانہ شیفتگی ہے اتنی ہی ان کی شخصیت سے بھی ہے۔

میں بہت کم لوگوں سے ذہنی قربت محسوس کرتا ہوں کہ دوغلی ذہنیت سے مجھے شدید نفرت ہے مگر نصرت ظہیر سے ذہنی قربت کی وجہ یہی ہے کہ دوسرے ادیبوں کی طرح ان کے یہاں دوغلا پن نہیں ہے۔ وہ منہ در منہ بات کہنے کی جرات رکھتے ہیں۔ وہ اس غیبت کدہ کا حصہ نہیں بنے جو ادیبوں کے مکان کو گھر میں تبدیل کر چکا ہے۔

میں ان کی تحریروں کے ماضی، حال اور مستقبل سے بھی ایک خاص لگاؤ رکھتا ہوں۔ ان کی تحریریں ذہن کو شاداب اور شگفتہ رکھتی ہیں اور عصری آگہی کے دروازے بھی کھولتی ہیں۔

—— حقانی القاسمی

کے نام کو خود سے پہلے لکھتا ہے لیکن انھوں نے غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا۔ اپریل 2010 کے اردو دنیا شمارے کے بعد سے میں نے ان کے ساتھ شعبہ ادارت میں کام کرنا شروع کیا۔ میں اس وقت رابطہ عامہ کی ذمے داریاں ادا کر رہی تھی۔ یہی وہ دن تھے جب محسوس ہوا کہ میں ایک ایسے تجربہ کار، دانا اور دوراندیش، کالم نگار کے ساتھ ہوں جو ادبی ریاکاریوں اور فریب سے دور آزاد صحافت کا علم بردار ہے۔ نصرت صاحب کے مزاج کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا کیونکہ وہ عام لوگوں سے سراسر مختلف تھے۔ بہت آسان نہیں تھا ان سے اپنی کوئی بھی بات منوانا۔ وہ ہندوستانی لباس میں انگریزی سوچ اور کھوج رکھنے والے ایک ایسے Intellactual تھے جو موجودہ ہندوستانی سماج میں ہو رہی ادبی سیاسی، سماجی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف تھے۔ انھوں نے قلم کو ہی تلوار سمجھا اور ایک باشعور اور ذمے دار شہری کے فرائض انجام دیتے ہوئے، خود کو قلم کا مجاہد بنا لیا۔ بہت خوب انداز تھا اپنی ہر ایک تکلیف کو کہنے کا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ انداز و پیرائے تشریح و تلمیح کا۔ غضب کی حاضر جوابی۔ نت نئی تراکیب، دلچسپ عنوانات کے تحت ترسیل کو اتنا آسان بنا دیا۔ اپنے مختصر سے کالم میں وہ کیا کچھ نہیں کہہ دیتے تھے۔ معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، سیاسی پیچ وخم روز مرہ کی زندگی میں پیش آنے والی پریشانیوں سے جوجھتا ایک عام آدمی ان کی ہر گفتگو میں اہم کردار بھی تھا، نشانہ بھی ان ہی جیسا کوئی دوسرا آدمی جو کمزور طبقے کا استحصال کرتا ہے۔

نصرت ظہیر صاحب نے قومی اردو کونسل کے رسالہ 'اردو دنیا' میں نہ صرف پوری دلچسپی سے کام کیا بلکہ ان کی نگرانی میں ہی 'بچوں کی دنیا' رسالہ جو اس وقت اردو زبان و ادب میں سب سے زیادہ مشہور اور آسانی سے دستیاب ہونے والا رسالہ ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ نصرت ظہیر جیسا ماہر طنز و مزاح نگار، بچوں کے رسالے میں بھی اتنی دلچسپی لے سکتا ہے۔ بچوں کے مزاج، بچوں کی نشوونما اور بچوں کی نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اسی لیے کچھ ہی دنوں میں بچوں کے رسالے میں 'کارٹون' رنگین تصاویر، پہیلیاں وغیرہ سے مزین رسالہ بچوں کی پہلی پسند بن گیا۔

دفتری امور میں نصرت صاحب، کاغذی کارروائیوں سے گھبراتے تھے۔ وہ بہت ہی سادہ اور صاف دل انسان تھے۔ لیکن اپنی صاف گوئی اور سچائی کی بدولت کبھی کبھی معاملات بگڑ بھی جاتے۔ ایک بات جو ان کی خوبی تھی کہ اگر ان سے کوئی غلطی ہوتی جو واقعی میں انھیں محسوس ہوتی تو صلح کے لیے پہل کرتے لیکن اگر بات اصولوں پر آٹھہرتی تو پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔

کونسل کے آخری دنوں میں 'وہ' وہ نہیں رہے۔ اب وہ غم جو دل کے نہاں خانے میں تھا جسے وہ ساری زندگی ایک ادیب، ایک شاعر، ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے کچھ تو اپنے سینے میں پیوست کرتے رہے، تو کبھی اسے لہو میں ڈبو کر ہنستے زخموں کو لکھتے رہے۔ کبھی کسی سے اپنا دکھ کہا نہیں۔ سماج میں ناہمواریوں، فرسودہ رسم و رواج کو لکھنا ایسا ہے جیسے کسی زخم کو کریدنا، پھر پاٹ دینا، پھر نمک پاشی تو، تو کبھی اپنے ہی لہو کا نمک چھڑک لینا، کوئی جان ہی نہیں پاتا کہ 'نصرت ظہیر' جیسا باکمال مزاح نگار کیسے ہنس ہنس کے سماج کی ہر دکھتی نبض پہ ہاتھ رکھتا، خود بھی غم زدہ ہوتا اور اپنی قلمی بصیرتوں سے سماج کو باور کرانے کی کوشش اور جستجو کرتا، ایک جنگجو کی طرح رخصت ہوا، ان کا ہر ایک 'کالم' ایک درد بھری نصیحت ہے اور بہتوں کے لیے سامان عبرت بھی۔

■

Abgeena Arif
C/5 3rd Floor
Jasola Gaon, New Delhi-25
Cell: 9810972959

شہناز رحمن

ساحل پر لیٹی ہوئی عورت

سریندر پرکاش کے دوسرے افسانوں کے مقابلے 'ساحل پر لیٹی ہوئی عورت' راست بیانیہ سے قریب تر اور آسان فہم افسانہ ہے۔اس افسانہ میں شعوری یا نیم شعوری طور پر ایسے اشارے کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ قاری متن کی تہہ تک پہنچ سکے۔افسانہ کے ابتدائی جملے کی لفظیات اس بات کی غماز ہیں کہ غیر مرئی اشیا سے فضا سازی کرنے کے بجائے حقیقی پیکر استعمال کیے گئے ہوں گے لیکن پورا افسانہ پڑھنے کے بعد اس حقیقی پیکر میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں کہ معنی کی تہہ تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مختصر بیانیہ میں مصنف نے تخلیق کائنات سے لے کر زوال انسانی تک کے رموز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ کی ابتدا جس طرح راست انداز بیان اور تحیر انگیز اسرار کی نقاب کشائی سے ہوئی ہے اس سے قاری کا متوجہ ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔غیر ارادی طور پر شکاری کا اس نو تشکیل بستی میں داخل ہونا اور پھر وہیں مستقل قیام کر لینا معاشرتی تشکیل کی ابتدائی تاریخ سے عبارت معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس افسانہ کے پلاٹ میں منطقی ربط دریافت کیا جائے تو ٹھوس نہ سہی مگر ایک معنوی ربط ضرور سامنے آئے گا۔شکاری مرگول کے اندھے ہونے کے پیچھے جو وجوہ پیش کی گئی ہیں وہ اسباب وعلل پر مبنی ہیں۔قدرت کی عطا کردہ نعمتوں میں سے قوت مردی ایک ایسی نعمت ہے جس کے فقدان کے نتیجے میں مرد تا عمر احساس کمتری میں مبتلا رہ سکتا ہے۔لہٰذا اس کے حصول کے لیے شکاری مرگول ہر نوع کی شرط کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر راضی ہے۔افسانے کے نکتہ شناس راوی نے اس نعمت تک پہنچنے کے جو ذرائع بیان کیے ہیں وہ واضح ہوتے ہوئے بھی اخذ معنی کے کئی اور امکانات لیے ہوئے ہیں۔جو ان معنوں میں اساطیری کہے جا سکتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے ہی انسان نے تقریباً تمام تر عوامل دوسری مخلوق سے سیکھے۔کوے کو دیکھ کر ہابیل نے قابیل کی لاش ٹھکانے لگانے کی ترکیب نکالی تھی اسی طرح ساحل پر موجود الف ننگی سیاہ فام، پرکشش عورت کو دیکھنے اور اچانک مرے ہوئے خرگوش کے انگڑائی لینے اور رسی کا حلقہ کھول دینے پر مرگول شکاری ایک عجیب احساس و ادراک سے آشنا ہوتا ہے۔وہ خوش ہو کر دیوانہ وار اس عورت کے پیچھے

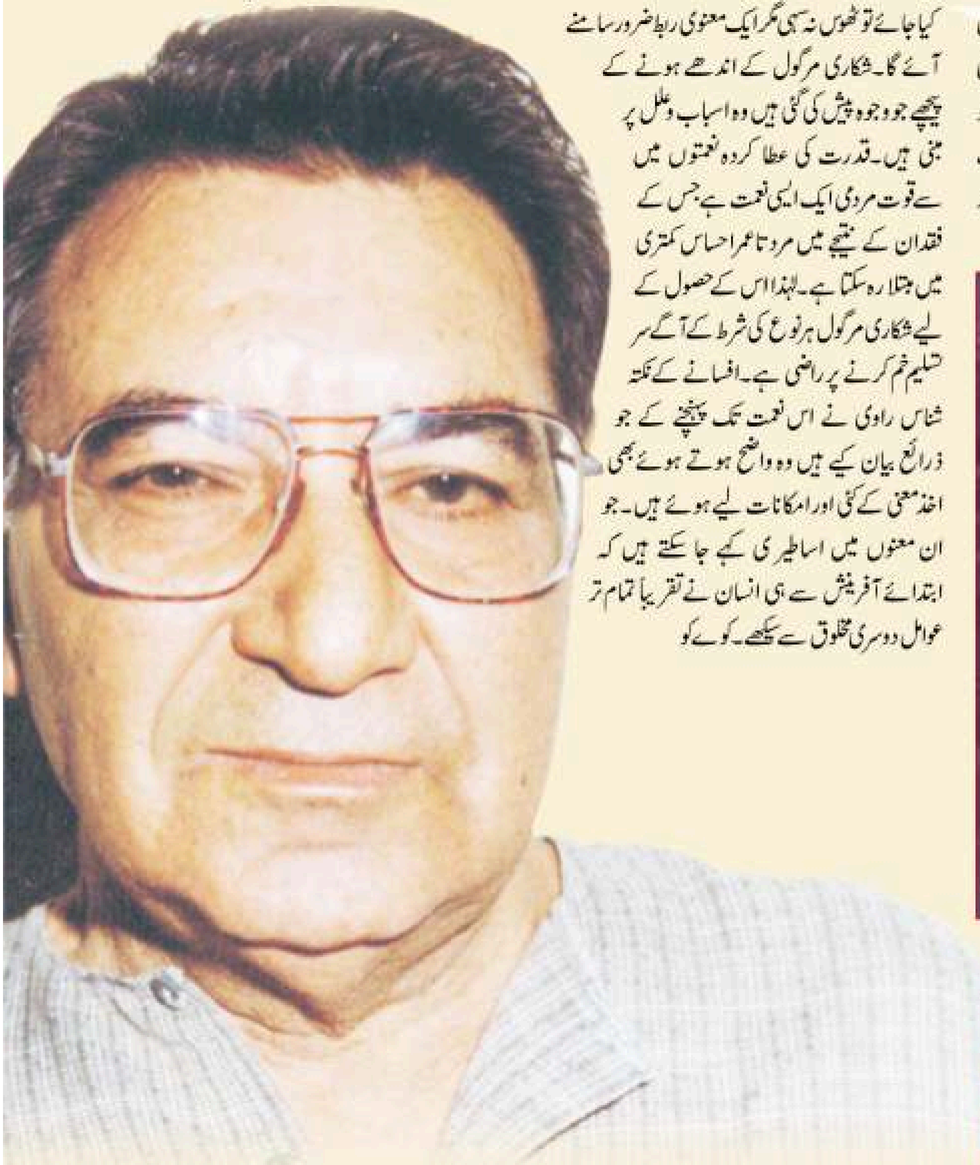

بھاگنے لگتا ہے۔افسانے کا آغاز روایتی طرز بیان سے ہوا ہے اور وسط تک پہنچتے پہنچتے اس میں حکایتی رنگ شامل ہو جاتا ہے۔داستانوی بیانیہ کی طرح اس میں بھی کبھی اذیت ناک، کبھی مترنم اور کبھی غضب ناک آوازوں میں گفتگو ہوتی ہے جو افسانوی فضا کی پراسراریت میں اضافہ کرتی ہے اور قاری بھی شکاری مرگول کے ساتھ تجسس اور دہشت کی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے۔یہاں پر شکاری مرگول مظلومیت اور بیچارگی کا استعارہ معلوم ہوتا ہے۔اس عورت کے سامنے اس کا گڑگڑانا انسان کی ازلی بے چارگی کا اعلامیہ ہے۔

شکاری اس سے التجا کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے عورت تو کہاں ہے۔ہم تجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو ہماری زندگی کے لیے لازم ہو گئی ہے۔'' جسمانی کشش سے زیادہ مترنم آواز کی کشش رکھنے والی پر اسرار عورت کی للکارنے والی باتیں شکاری کے اندر غم وغصہ کا طوفان برپا کر دیتی ہیں۔وہ غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر کھوہ پر دے مارتا ہے اور دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''میں مرد ہوں اور یہ میرا شیوہ نہیں۔تم نے اگر اپنے آپ کو میرے حوالے نہ کیا تو مجبوراً مجھے اپنی بندوق سے کام لینا ہوگا۔'' جس کے نتیجے میں غضبناک ہوکر وہ شرط عائد کرتی ہے کہ ''اب تم پر لازم ہے کہ ہر روز اسی وقت مجھ پر آ کر پتھر کی ضرب لگاؤ اور اگر تم نے اپنے معمول میں ناغہ کیا تو میرا قہر تم پر نازل ہوگا۔اور تم زندہ نہ بچو گے۔'' عورت کی شرط پوری کرنے کے وعدے کے بعد شکاری کو مکمل مردانگی حاصل ہو جاتی ہے۔اس منظر کی ڈرامائیت اسلوبیاتی تجربے میں منقلب ہوکر قصے میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کرتی ہے۔

قوت مردی حاصل ہونے کے بعد وہ زندگی کی مسرتوں اور لذتوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔مختلف عورتوں سے رشتے قائم کرتا ہے۔اتفاقاً ایک روز خراب موسم اور ایک خوبصورت عورت سے لطف اندوزی کی وجہ سے وہ شکار کے لیے نہیں نکلتا اور وعدے کے مطابق کھوہ کے دہانے پر پتھر مارنے سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔اس وعدہ خلافی اور لاپرواہی کی وجہ سے پراسرار عورت شکاری کو سزا دینے کی دھمکی دیتی ہے۔ہزار منت وسماجت کے باوجود وہ کہتی ہے کہ ''تم نے جو پتھر مجھ پر نہ مارا اس پتھر کا کیا ہوا، میرے جسم کا وہ حصہ جس پر چوٹ نہ پڑی اس کا کیا ہوگا، وہ لمحہ جو اس پتھر کے مقدر کے ساتھ وابستہ تھا واپس نہیں آسکتا۔بہر حال سزا تو تمھیں بھگتنا پڑے گی۔'' زندگی کی بخشش کے عوض وہ اس سے زندگی کے برابر عزیز چیز کی قربانی طلب کرتی ہے۔اور اسے قوت مردی اور بینائی میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیتی ہے۔شکاری مرگول بینائی قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔اس کے بعد پھر وہ معمول کے مطابق ہر روز کھوہ کے دہانے پر پتھر مارتا لیکن ایک روز اسے حسب معمول رونے، سسکنے، کراہنے یا ہلکے قہقہے کی آواز نہیں آتی اس لیے شکاری تھک ہار کر قصبہ کی طرف واپسی کا رخ کرتا ہے۔خوف اور حیرانی کے عالم میں چلتے ہوئے اچانک اس کا پیر کسی چیز سے ٹکراتا ہے اور وہ گر جاتا ہے۔ٹٹول کر دیکھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جسمانی ہیئت کے اعتبار سے عورت کی لاش ہے۔اس خیال سے کہ کہیں یہ لاش اس پراسرار عورت کی نہ ہو اس کے منھ سے دل دوز چیخ نکلتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یکا یک وہ قوت مردی سے محروم ہو گیا۔یہاں تک تو شکاری مرگول کو قوت مردی کے حاصل ہونے، اندھے ہونے اور پھر اس قوت سے محروم ہونے کی داستان تھی۔

اس کے بعد افسانے کا دوسرا منظر شروع ہوتا ہے۔

اس واقعہ کے دوسرے روز پورے نگر میں ایک خبر پھیل جاتی ہے کہ ایک اجنبی گھڑسوار اس شہر میں داخل ہوا اور رات بھر قیام کرنے کے بعد صبح میں وہ بیدار نہ ہوا۔اس کی لاش پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔اس خبر سے مرگول بے چین ہو جاتا ہے اور پھر وہ جنگل کی طرف جاتا ہے، پہاڑی کی کھوہ پر کھڑے ہوکر اس عورت کو ملتجیانہ انداز میں پکارتا ہے مگر کوئی جواب نہ ملنے پر وہ دیوانہ وار پتھر مارنے لگتا ہے۔اسی شام سارے شہر میں یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ پڑوسی ملک میں ایک عجیب وغریب بیماری پھیل گئی ہے جو شخص رات کو سو جائے صبح زندہ نہیں بچتا۔اندھا شکاری گرچہ قوت بینائی اور قوت مردی دونوں سے محروم ہے مگر اس کے باوجود وہ مرنا نہیں چاہتا۔شہر کے دوسرے تمام افراد راتوں کو جاگنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ مستقل بیداری موت کا باعث بننے لگی تو لوگوں نے غور وفکر کرنا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''موت کا کوئی علاج نہیں۔وہ نیند میں بھی آسکتی ہے اور بیداری کی حالت میں بھی، لہٰذا سیانوں نے یہ قرار دیا کہ جو عالم بیداری میں مرجائے اسے شہید کا درجہ دیا جائے اور جو نیند کے غلبہ سے سر جھکا دے اسے کاہلی کی موت سمجھا جائے اور اب کون تھا، جو کاہلی کی موت مرنا پسند کرتا۔''

(ساحل پر لیٹی ہوئی عورت، مشمولہ بازگوئی، سریندر پرکاش، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1988، ص 136)

شہر والوں کا موت کے خوف سے جاگنا اور پھر بیداری کا ہی موت کی وجہ بننا اس بے بسی کا استعارہ ہے جو موجودہ دور کے عوام کو درپیش ہے۔معاصر زندگی میں

> **شکاری مرگول بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے شہر کی حالت دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر اس نے محسوس کرلیا کہ شہر بالکل ویران ہے ,فضا میں گدھ اور چیلیں اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں.وہ دھیرے دھیرے بمشکل پہاڑی کی کھوہ تک پہنچتا ہے .اور اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ سمندر کی تیز لہریں اچھال کر اسے سمندر کی گہرائی میں لے جائیں. عین اسی وقت پہاڑی کی کھوہ سے کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی ہے ,سنتے ہی وہ مضطرب ہواٹھتا ہے مگر اس کے اندر اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ کھوہ کے دھانے پر جائے اور پتھر مارے.**

عین اسی افسانوی واقعہ کی طرح عوام نامعلوم وناکردہ گناہ کی سزا سے متصادم نظر آرہے ہیں۔لہٰذا افسانہ نگار نے افسانوی متن کو اکہرے پن سے بچانے کے لیے مبہم انداز میں اپنے عہد کی نادیدہ اور غلیظ سیاست کی نقاب کشائی کی ہے۔

شہر والوں سے الگ تھلگ شکاری مرگول اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی نئی ترکیب نکالتا ہے۔جب جاگنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی نظر آنے لگتی ہے تو وہ موت کے خوف سے دہل جاتا ہے اور بندوق سے گولی مار کر اپنا پیر زخمی کر لیتا ہے۔اس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے یکسر غائب ہو جاتی ہے۔اس طرح اس پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ بیدار رہنے کے لیے زخم کی سخت ضرورت ہے۔زندگی کا یہ راز بتانے وہ عجلت میں شہر کی طرف بھاگتا ہے لیکن وہاں پہنچ کر اسے کوئی جواب نہیں ملتا۔شکاری مرگول بینائی سے محروم ہونے کی وجہ سے شہر کی حالت دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر اس نے محسوس کرلیا کہ شہر بالکل ویران ہے، فضا میں گدھ اور چیلیں اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔وہ دھیرے دھیرے بمشکل پہاڑی کی کھوہ تک پہنچتا ہے۔اور اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ سمندر کی تیز لہریں اچھال کر اسے سمندر کی گہرائی میں لے جائیں۔عین اسی وقت پہاڑی کی کھوہ سے کسی عورت کی چیخ سنائی دیتی ہے، سنتے ہی وہ مضطرب ہو اٹھتا ہے مگر اس کے اندر اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ کھوہ کے دہانے پر جائے اور پتھر مارے۔

افسانہ کا خلاصہ کرتے ہوئے بظاہر ترتیب وتنظیم کی کارفرمائی نظر آرہی ہے لیکن اس متن کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں پیرایہ بیان تو آسان ہے لیکن اسے حقیقت کی سطح سے پرے جا کر سمجھنے کی

ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مصنف کے دوسرے افسانوں میں بے ربطی میں ربط اور فکری سطح پر منظم کیفیت ملتی ہے لیکن ان افسانوں کے برعکس پیش نظر افسانے کی منطقی وحدت کو شکستہ کرنے کے بعد ہی اس کی معنویت کو اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مصنف نے حقیقت اور فنتاسی کو مدغم کر کے ایک نئی شکل وضع کی ہے جو علامتی قالب میں ڈھل گئی ہے۔ افسانے کی ابتدا میں شکاری مرگول کا ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے اس نئی آبادی میں پہنچنا اور پھر ہرن کا اس سرحد میں داخل ہونا جہاں انسانوں کا داخلہ قانوناً منع ہے، اس کے بعد سیاہ فام ننگی عورت کو دیکھنا اور مرے ہوئے خرگوش کا آنکھیں کھولنا ایک اتفاقیہ حادثہ ہونے کے علاوہ اسطوری پہلو کا بھی حامل ہے جس کی طرف ابتدا میں اشارہ کر دیا گیا ہے لیکن اس میں مزید معنوی امکانات موجود ہیں جس کی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ اپنے شوق، پیشے اور رہن سہن سے مطمئن رہنے والا شکاری اپنی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بتان ساحری میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ قوت مردمی سے محروم ہونے کو اگر اصل معنوں میں لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک شکاری جس میں ہمت و حوصلہ اور اپنے کام کو بحسن و خوبی انجام دینے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے لیکن صرف ایک کمی کی وجہ سے اس کی زندگی بے کیف ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ ابتدا سے لے آخر تک شکاری کی زندگی سے وابستہ واقعہ پر غور کیا جائے تو یہ رمز کھلتا ہے کہ انسان جو فطرتاً معصوم پیدا ہوتا ہے لیکن اس دنیا کی چکا چوند الف ننگی سیاہ فام پرکشش عورت کی صورت میں جب اس کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے تو وہ فکر و فہم کو بالائے طاق رکھ کر اس کے پیچھے اس طرح بھاگنے لگتا ہے کہ انجام کی اسے کوئی خبر ہی نہیں رہ جاتی۔ حصول آسائش اور لذت میں وہ اس قدر بیگانہ ہو جاتا ہے کہ کھوکھلے اور پرفریب عوامل پر اس کی نظر ہی نہیں جاتی۔ سراب دنیا سے مستقل عدم تحفظ کا شکار رہنے لگتا ہے اور شکاری مرگول کی طرح پہاڑی کی کھوہ پر بلا سبب صرف پتھر مارنے کی فکر باقی رہ جاتی ہے اور اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ پتھر مارنے کے بعد آنے والی سسکیوں اور قہقہوں کی وجوہ کیا ہیں۔ اگر ان وقوعوں کی متنی توجیہ کرنے کے بجائے سیاسی رموز و اسرار کا استعارہ سمجھا جائے تو نئے معنی برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ شکاری مرگول سیاسی مفاد پرستوں کی آباد کی ہوئی بستی کا وہ معصوم فرد ہے جو قانونی اور ملکی آئین کا پابند ہے۔ سرحد کے اس پار داخل ہو جانے والا ہرن گرچہ اس کی منزل و جستجو ہے لیکن چونکہ اسے حاصل کرنے میں قانونی خلاف ورزی ہوگی اس لیے وہ ان حدود میں داخل نہیں ہوتا۔ مگر جب بدعنوانیوں پر ملمع سازی کر کے اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ خود کو روک نہیں پاتا اور اس کے حصول میں جی جان لگا دیتا ہے۔ اس کو اس بات کی قطعی پروا نہیں ہوتی کہ ایک مصنوعی اور عارضی چیز کے لیے اسے ہتھیار بنا کر استعمال کیا جا رہا ہے۔

افسانہ نگار نے حکمرانوں اور برسر اقتدار طبقہ کے انسانیت سوز اقدامات کو علامتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عورت کے سامنے اپنی بینائی کا سودا کرنا اس بات کا اشاریہ ہو سکتا ہے کہ انسان سیاسی رہنماؤں کی سازش کا شکار ہو کر اس بری طرح خود غرض ہو جاتا ہے کہ اپنے عزیز و رشتہ دار کی جان تک قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسے ہوش اس وقت آتا ہے جب اس کی روحانی متاع بالکل زار زار ہو جاتی ہے اور اس کی نادانیوں کے نتیجے میں نسل انسانی تباہی و بربادی کے دہانے پر جا پہنچتی ہے۔ اس وقت تک وہ اپنی خود غرضی سے باہر نہیں نکل پاتا جب تک اسے اپنی زندگی خطرے میں گرفتار نظر نہ آنے لگے۔ شکاری مرگول عیش و طرب میں اس قدر ملوث ہو جاتا ہے کہ اسے گھر والوں کی حالت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہونے کے بعد جب وہ عوام کے پاس ان کی بقاء کا راز لے کر پہنچتا ہے تو اس کے پاس احساس زیاں اور شدید محرومی کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ شکاری مرگول شہر والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ''اگر آپ سب زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو بیدار رہنا ہوگا۔ اور بیدار رہنے کے لیے زخم کی ضرورت ہے۔'' اس تنبیہ کے پس پشت وہ ازلی حقیقت پوشیدہ ہے کہ زندگی محسوس کرنے کے لیے صرف سکون اور آسودگی ہی نہیں بلکہ تشنگی بھی ضروری ہے۔ جو شخص مستقبل کے انجام سے بے نیاز ہو کر صرف حال کی نیرنگیوں میں کھو جاتا ہے اسے تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور ایک دفعہ ٹھوکر لگنے کے بعد جب کوئی شخص سنبھلتا ہے تو شکاری مرگول کی طرح ہی دور اندیش ہو جاتا ہے۔ لیکن آخری وقت کی یہ دور اندیشی اس کے کسی کام کی نہیں رہ جاتی۔

عیش و عشرت کے حصول کے لیے جس طرح شکاری مرگول نے اپنی زندگی جیسی پیاری چیز کا سودا کر دیا۔ اس نوع کے بے شمار افراد اس دنیا میں سانس لے رہے ہیں جو عقل و خرد سے بغاوت کر کے صرف جبلتوں کی تابعداری میں پوری زندگی صرف کر دیتے ہیں اور آخر وقت میں ان کے پاس آسائش کی تمام اشیا موجود ہوتی ہیں مگر اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ ان نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکیں، جس طرح شکاری مرگول جب شہر کی ویرانی سے گھبرا کر سمندر کے کنارے مرنے کی خواہش لے کر جاتا ہے تو اسے کھوہ سے عورت کی چیخ سنائی دیتی ہے جو اس کی قوت مردمی کی بقا کا اشاریہ ہے مگر اس کے اندر اتنی سکت نہیں کہ پتھر اٹھا کر کھوہ کے دہانے پر مار سکے۔ افسانے کے وقوعوں سے طنز کا عنصر ابھرتا ہے اور یہی افسانے کی معنوی توسیع کا ضامن ہے۔

افسانے میں پیش کیے گئے مناظر سے انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقائی دور کا خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ جب اس کرہ ارض کے تمام تر خطوں کی شکلیں یکساں اور حجم محدود تھے۔ لوگوں کے مشاہدات و تجربات کا دائرہ اس قدر وسیع نہ تھا کہ موت سے بچنے کے لیے بیداری کے علاوہ کوئی ترکیب یا حسب ضرورت کوئی حل نکالنے پر قادر ہوتے۔ شہر کی حسین ترین متمول عورت کی ملازمہ کا شکاری مرگول کے پاس رات گزارنے کے لیے آنا اس بات کا اشاریہ ہے کہ جنسی اور جبلی خواہشات کی تکمیل کے لیے نت نئے وسیلے نکالنا انسانی ترقی کی دین نہیں بلکہ ازل سے ہی انسان اپنی خواہشات کے لیے ذہنی و جذباتی طور پر متحرک رہا ہے۔ ہر زمانے، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں جبلی خواہشات کے معتدل اظہار پر پابندیاں لگائی جاتی رہیں لیکن انسان ان سے بغاوت کرتا رہا ہے۔

افسانے کا ابتدائی جملہ تمام تر وقوعوں کے سیاق میں انتہائی معنی خیز اور متعدد معنوی جہات کا حامل ہو جاتا ہے۔ شکاری مرگول حقیقی معنوں میں اندھا تھا لیکن افسانے کے واقعات سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی بصری ہی نہیں بلکہ سمعی اور لمسی حسیات بھی بے حسی کے زد میں آچکی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ چیزوں کی اصل تک پہنچنے سے قاصر رہا اور زندگی بھر محض سراب کے تعاقب میں رہا۔ خواہ وہ جذبہ ہو یا اس کی دیوانگی، دونوں کے پیچھے بھاگنا اس کے لیے محرومی کا باعث رہا۔ افسانہ انسانی فطرت کے اس نقطۂ عروج کو بھی سامنے لاتا ہے جہاں منزل کی چاہت انسان کو اندھا بنا دیتی ہے اور آخر میں وہ کف افسوس ملتا رہ جاتا ہے۔ شکاری مرگول کی طرح وہ موت کا اس قدر متمنی ہو جاتا ہے جس قدر وہ زندگی سے محبت کرتا آیا ہے۔

■

Shahnaz Rahman
Moyeen Hostel
SN Hall
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9458537513

نورفاطمہ

بلراج مین را کا افسانہ 'وہ'

بلراج مین را کا شمار دورِ جدید کے اہم اور منفرد افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ مینرا ادبی صحافت کی تاریخ میں بھی ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ رسالہ 'شعور' کی ادارت نے ان کو ادبی صحافت کی تاریخ میں اہم مقام عطا کیا۔ بلراج مینرا کا شمار ایسے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے کوتاہ قلمی کے باوجود اپنی شناخت نہ صرف علاحدہ قائم کی بلکہ اپنے قلم کے جادو سے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ مینرا کا پہلا افسانہ 'بھاگوتی' 'ساقی' کراچی 1953 میں شائع ہوا۔ جس نے ہندو پاک میں ان کی ادبی حیثیت کو مسلّم کر دیا۔ ان کی تمام کہانیاں غور و فکر کا تقاضا تو کرتی ہی ہیں ساتھ ہی قاری کے لیے سوالیہ نشان بھی قائم کرتی ہیں۔ بلراج مین را کی کہانیوں کی جو خصوصیت قاری کی توجہ اپنی طرف سب سے زیادہ مبذول کراتی ہے وہ اشاریت اور کفایت لفظی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے افسانوں کی صرف ظاہری سطح معنی خیز نہیں معلوم ہوتی بلکہ ان کے افسانوں کے بین السطور میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جس کی وضاحت سے افسانہ نگار دانستہ طور پر گریز کرتا نظر آتا ہے۔ مین را نے تقریباً 37 افسانے لکھے۔ بلراج مینرا نے اپنے مجموعے میں شامل کچھ افسانوں میں متن در متن کی تکنیک کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کہانیاں اس طرح بھی سفر کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں پر طائرانہ نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص موضوع یا کسی بندھے ٹکے اصول کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے ہیں۔ لیکن ایک نکتہ جو بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ ان کی کہانیوں کا مسلسل سفر ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار ساکت و جامد نہیں ہیں بلکہ کسی تلاش میں گم اور سرگرداں اور ذہنی سفر میں مبتلا ہیں۔ اس ضمن میں ان کے افسانے 'واردات'، 'بس اسٹاپ'، 'شہر کی رات'، 'ماضی کی سڑک' اور 'رفتار' قابل ذکر ہیں۔ مینرا نے کمپوزیشن سیریز کی کہانیاں بھی لکھی ہیں جس کے عنوان نے ہی سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اردو فکشن میں پہلی بار ایسا ہوا کہ کسی افسانہ نگار نے کمپوزیشن کا لفظ استعمال کیا ہو۔ یہ اپنے آپ میں انوکھا اور چونکا دینے والا انداز تھا۔ کمپوزیشن میں مختلف اجزا کی تنظیم کی جاتی ہے مصوری، بت تراشی، موسیقی، فلم اور شاعری میں تو مختلف اجزا کو مرتب کرنے کے تجربے تو کافی کیے گئے ہیں لیکن فکشن میں مین را سے پہلے کسی نے کمپوزیشن کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کے پیچھے مین را کا مقصد شاید ادب کے قارئین تک یہ پیغام پہنچانا ہو کہ جدید افسانہ آرٹ کی وہ تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے جو مصوری، موسیقی اور فلموں وغیرہ سے عبارت ہے۔

زیرِ نظر افسانہ 'وہ' کا شمار بلراج مین را کے نمائندہ افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار 'وہ' ایک نوع کی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں گرفتار ہے۔ افسانے کا تجزیہ کرنے سے پہلے اس کی مختصر سی تلخیص پیش کرنی مناسب ہے۔ افسانے کا آغاز دسمبر کی سرد رات میں مرکزی کردار 'وہ' کی بے وقت آنکھ کھلنے سے ہوتا ہے۔ وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے سگریٹ اٹھا کر لبوں سے لگاتا ہے۔ کافی تلاش کرنے کے بعد بھی اسے خالی ماچس کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ رات کے دو بجے وہ ماچس کی تلاش میں کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیتا ہے ''سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا ہے۔ سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے'' وہ سوچتا ہے 'ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی'' وہ وقت سے بے خبر چادر کندھوں پر ڈال کر اندھیری رات میں باہر نکل آتا ہے اور ایک حلوائی کی دکان کے پاس پہنچتا ہے۔ شاید اس کی بھٹی سے وہ اپنی سگریٹ جلانے میں کامیاب ہو جائے۔ اتنے میں آواز آتی ہے ''کون ہے؟ کیا کر رہے ہو'' ''میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں'' ''پاگل ہو گیا، بھٹی اس وقت ٹھنڈی پڑی ہے'' ''ماچس ہے آپ کے پاس'' ''ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی'' وہ آگے قدم بڑھاتا ہے اور نہ جانے کتنے لیمپ پوسٹوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بے خبر چلتا رہتا ہے۔ اس کو سامنے سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو وہ اس سے بھی پوچھتا ہے کہ آپ کے پاس ماچس ہے؟ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔ اپنے گھر جا رہا ہوں تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ وہ پھر لیمپ پوسٹوں سے بے خبر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا چلتا ہے۔ وہ ایک

مرمت شدہ پل پر پہنچتا ہے۔ اس کے سامنے خطرے کا نشان ہے جہاں سرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی لالٹین لٹک رہی ہے۔ وہ لالٹین سے اپنی سگریٹ سلگانا چاہتا ہے مگر ایک سپاہی پوچھتا ہے یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم کون ہو، کہاں رہتے ہو؟ تسلی بخش جواب نہ ملنے پر وہ اسے تھانے لے جاتا ہے۔ تھانے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر میز پر بیٹھے ہوئے چند سپاہیوں پر پڑتی ہے۔ سب سگریٹ پی رہے ہیں، ان کے سامنے سگریٹ اور ماچس کے پیکٹس پڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان سے ماچس مانگتا ہے مگر وہاں بھی اس کو سگریٹ جلانے میں کامیابی نہیں ملتی اور ذرا سی تفتیش کے بعد اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کبھی ختم نہ ہونے والی سڑک پر وہ دھیرے دھیرے چلنا شروع کرتا ہے۔ وہ سوچتا جا رہا ہے سگریٹ پینا ایک علت ہے! میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے؟ ماچس کہاں ملے گی؟ نہ ملی تو؟ یہی سوچتے سوچتے وہ وقت، لیمپ پوسٹوں اور اپنے بدن کی تھکان سے بے خبر چلتا رہتا ہے۔ صبح ہو جاتی ہے۔ وہ دم بھر کو رکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کوئی سامنے سے چلا آ رہا ہے۔ اس کے لبوں میں بھی سگریٹ کانپ رہا تھا۔ اس کی حیرانی مزید بڑھ جاتی ہے جب وہ اس سے ماچس طلب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ماچس کے لیے تو میں... مگر وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ جاتا ہے جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اس مختصر سی تلخیص کے بعد بظاہر تو یہ افسانہ سیدھا سادہ لگتا ہے جہاں ایک کے بعد دیگر واقعات رونما ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اس سادہ سے بیانیہ میں احساس، جذبے اور تاثرات کا ایک سلسلہ شامل ہے۔ ظاہری طور پر تو وہ چل رہا ہے اور جگہ جگہ رک کر ماچس کی تلاش کر رہا ہے مگر اس کا ذہن لگاتار دباؤ میں ہے۔ حسی اور جذباتی طور پر وہ خود کو اپنی سگریٹ نوشی کی علت اور گھٹن میں مبتلا محسوس کرتا ہے۔ افسانے کے بیشتر حصے حقیقت پسندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ افسانے میں ماڈل ٹاؤن، راستہ، حلوائی کی دکان، سپاہی، پولیس اسٹیشن اور راستے میں لگے لیمپ پوسٹ تمام چیزیں جانی پہچانی ہیں۔ مگر افسانے کا آخری حصہ قاری کو عجیب سے واہمہ میں مبتلا کرتا ہے جہاں ''وہ'' کی ملاقات خود ''وہ'' سے ہوتی ہے۔ یہاں قاری کے ذہن میں کئی سوالیہ نشان ابھرتے ہیں۔ آیا اس کی ملاقات کسی دوسرے شخص سے ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خود کلامی کے انداز میں اپنے ہمزاد سے بات کر رہا ہو؟ اور وہ ذات اور غیر ذات میں کوئی فرق ہی محسوس نہ کر پا رہا ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماچس ایسی کون سی شے ہے جس کی وجہ سے مرکزی کردار کی آدھی رات کو بے وقت آنکھ کھل جاتی ہے اور ماچس نہ ملنے پر وہ اس طرح بے چینی اور اضطراب کے عالم میں مبتلا ہو جاتا ہے حتیٰ کے گھر کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ ماچس کی تلاش میں رات کی سیاہی اور سردی کی پرواہ کیے بغیر دیوانہ وار نکل پڑتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار دورِ جدید کا باشعور اور حساس انسان ہے، اسے کسی کھوئی ہوئی شے کی تلاش ہے جو اس کی زندگی میں یا سماج میں سرے سے مفقود ہے۔ اب ماچس کی علامت واضح ہوتی نظر آتی ہے۔ یہاں ماچس روشنی کی علامت ہو سکتی ہے، آگ کی تلاش ہو سکتی ہے، زندگی کی امید کی تلاش، اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی تلاش یا پھر زندگی کی معنویت اور اپنے وجود کی تلاش کے معنی ہم اس کے اندر سے برآمد کر سکتے ہیں۔ جس سنجیدگی اور بے چینی سے وہ ماچس کی تلاش کر رہا ہے اس میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں اور کسی بڑے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پورا افسانہ کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے فقروں میں لکھا گیا ہے۔ مینرا نے کہیں بھی وضاحتی انداز اختیار نہیں کیا ہے۔ ہر جگہ اشاراتی انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ آنکھ کا بے وقت کھلنا اور اس کا یہ کہنا ''ایک بار آنکھ کھل جائے تو، پھر آنکھ نہیں لگتی!'' یہاں آنکھ کھلنے کا مطلب باطن کی آنکھ کھلنے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اور بھی متعدد معنی خیز اشارے اس افسانے میں جا بجا ملتے ہیں۔ ''سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔ سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے!'' یہاں سلگتا سگریٹ زندہ رہنے کی علامت بن گیا ہے۔ اچانک اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس آگ سے وہ محروم ہے جو آگ محض ماچس میں نہیں اس کے دل میں بھی روشن ہے۔ یہ آگ محض ایک گرم معروض ہی نہیں بلکہ روشنی اور زندگی کی حرارت کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس باعث اس کی سوچ میں کچھ اس طرح کا اضطراب اور کشمکش کی کیفیت شامل ہو جاتی ہے۔

''ماچس کہاں ملے گی؟

ماچس نہ ملی تو کہیں...

تو کہیں...

میرا دھڑکتا دل خاموش نہ ہو جائے!''

ان جملوں میں مرکزی کردار کے ذہنی کرب، اضطراب اور زندگی کی معنویت کی تلاش صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس آگ کی تلاش میں نامعلوم سفر پر نکل پڑتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے سیاہی کا ذکر معنی خیز انداز میں کیا ہے۔

''دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی کی حکومت اور خاموشی کا پہرہ، رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور تا حدِ نظر کوئی دکھلائی نہیں دے رہا تھا، لیمپ پوسٹوں کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی''

ظاہر ہے کہ اگر اپنے وجود کے باہر سیاہی، تاریکی اور منجمد خاموشی کا احساس شدید نہ ہو تو ماچس کی شکل میں روشنی اور گرمی کی تلاش کے معنی متعین نہیں ہو سکتے۔ یہاں افسانہ نگار کا اشارہ سیاسی بھی ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ اشارے واضح نہیں مبہم انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی تمام خارجی کوائف راوی کی داخلی کیفیت کے غماز ہیں۔ یہاں تک کہ راستے میں لگے لیمپ پوسٹ بھی رات کی تاریکی کو کم کرنے کے بجائے اور گہرا کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر سیاسی پہلو کی بات اس لیے کہی گئی ہے کہ ہمارے سیاسی نظام کی وجہ سے انسان کے مسائل روز بہ روز الجھتے جا رہے ہیں اور پورا معاشرہ ان گنت بدعنوانی اور سماجی مسائل کا شکار بنا رہتا ہے۔ یہ سیاہی اور خاموشی کی کیفیت دراصل اسی کیفیت کی غمازی کر رہی ہے۔ آگے چل کر اسے حلوائی کی دکان نظر آتی ہے اور وہ بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ مگر بھٹی ٹھنڈی پڑی ہوتی ہے۔ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ:

''ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا تب بھٹی گرم ہوگی۔''

وہ مزید آگے چلتا ہے تو اس کی ملاقات ایک اور آدمی سے ہوتی ہے، جو ماچس مانگنے پر جواب دیتا ہے کہ:

''نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں''

تھکا ماندہ وقت سے بے خبر وہ ایک مرمت طلب پل پر پہنچتا ہے جہاں سرخ کپڑے میں لپٹی ہوئی لالٹین سے وہ اپنی سگریٹ جلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اتنے میں ایک سپاہی بہت سے سوال کرتا ہے

''کیا کر رہے تھے؟

کچھ نہیں!

میں کہتا ہوں، کیا کر رہے تھے؟

آپ کے پاس ماچس ہے؟

میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو، ماچس ہے۔ کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے، آپ کے پاس ماچس ہو تو...

تم کون ہو، کہاں رہتے ہو؟

میں...

ماڈل ٹاؤن!

اور تمھیں ماچس چاہیے... ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو... ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

ماڈل ٹاؤن!

اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دور دور تا حدِ نظر سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔''

مذکورہ بالا مکالموں سے دونوں کرداروں کی نفسیات کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو سپاہی کے سوال پوچھنے کے انداز میں جھنجھلاہٹ اور بے وقت کسی کی موجودگی سے اکتاہٹ، تو دوسری طرف مرکزی کردار کی مستقل مزاجی اور ماچس کی طلب میں شدت کا مظاہرہ صاف نظر آتا ہے۔ مزید اس بات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ ماچس جو اس کی زندگی سے غائب ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے گھر سے میلوں دور نکل آیا ہے جس کا اسے پورا اندازہ بھی نہیں۔ رات کی سیاہی میں خطرے کی جگہ پہنچنے کے جرم میں سپاہی اسے تھانے لے جاتا ہے۔ تھانے میں کچھ سپاہی ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے سگریٹ اور ماچس کے کئی پیکٹس پڑے ہوئے تھے

''صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ کہتا ہے، ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے!

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کر لوں۔ مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے!

کہاں رہتے ہو؟

میں اجنبی ہوں! کیا میں ماچس...

ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تین ماہ سے! ماچس...

ماچس... ماچس کا بچہ... اجنبی... جاؤ اپنے گھر... ورنہ بند کر دوں گا... ماچس؟

تھانے میں اور تھانے سے باہر پولس کی غیر ضروری مداخلت اور روز مرہ کے معاملات میں شک و شبہہ کا گمان کرنا دراصل عام سماجی زندگی میں قانون کے نام لیوا رکھوالوں کے ذریعہ مداخلت اور استحصال علامتی طور پر ایک عام آدمی کی بے ضرر ضروریات کی راہ میں روڑے اٹکانے کے مترادف بن جاتا ہے۔ بلراج مینرا کے تقریباً تمام افسانوں میں جبر اور استحصال کے خلاف ردِعمل اور مزاحمت کا رویہ ملتا ہے جو زیر بحث افسانے میں بھی نمایاں ہے۔ پورے افسانے میں واقعات کا تانا بانا جس طرح بُنا گیا ہے اس سے نہ صرف قاری کی دلچسپی بلکہ تجسس میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آیا وہ اپنی سگریٹ جلانے میں کامیاب ہوگا؟ اس کو کہیں ماچس ملے گی یا نہیں؟ اس سے قطع نظر اگر ہم پولیس اسٹیشن میں ہوئے مکالموں کو دیکھیں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کردار مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی معصومیت اور موقف پر قائم رہتا ہے۔ اسے کسی سوال کے جواب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کو صرف ماچس چاہیے۔ بار بار ہر سوال کے جواب میں ماچس کی رٹ لگانا اور رات بھر ماچس کی تلاش میں تگ و دو کرتے رہنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ماچس کی تلاش یا یوں کہیں کہ اپنے وجود کے حوالے کی تلاش اس کی زندگی کا اہم مقصد بن گئی ہے۔ دوسری طرف جن لوگوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے وہ سب بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جس شدت کی ساتھ اس کو ماچس کی تلاش ہے، بار بار پوچھنے پر کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ الٹا اس کو پاگل سمجھ کر گھر جانے کی صلاح دی جاتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یہاں بھی سماج کے استبدادی اداروں پر طنز ملتا ہے، جس کی بہترین مثال پولیس اسٹیشن ہے۔ عام آدمی کی طرف پولیس والوں کا منفی رویہ اور ان کو حقارت سے دیکھنے اور دھتکارنے کا عمل اس استبداد کو مزید بے نقاب کرتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار کہیں بھی سگریٹ جلانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ حلوائی کی دکان پر بھٹی کا ٹھنڈا ہونا، راستے میں اجنبی سے ماچس مانگنے پر اس کا یہ کہنا کہ ''میں اس علت سے بچا ہوا ہوں'' لالٹین سے سگریٹ جلانے کی کوشش میں تھانے پہنچا دیے جانا، حتیٰ کہ ماچس سامنے ہونے کے باوجود سگریٹ سلگانے میں کامیابی نہ ملنا، یہ تمام چیزیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اپنے وجود کو سمجھنے، زندگی میں کسی مقصد کو حاصل کرنے اور اپنے طور پر کسی عام آدمی کو بھی بے ضرر زندگی گزارنے تک کی آزادی مشکل سے مل پاتی ہے۔ لوگ اپنے نصب العین سے بے خبر بے حسی کی زندگی جی رہے ہیں۔ جس کا احساس راوی کو شدت سے ہے۔ تمام کاوشوں کے باوجود اس کو یہ آگ کہیں نظر نہیں آتی۔ یہاں تک کہ تھکان کی وجہ سے اس کا بدن پوری طرح ٹوٹنے لگتا ہے۔ وہ بے ساختہ سوچتا ہے۔

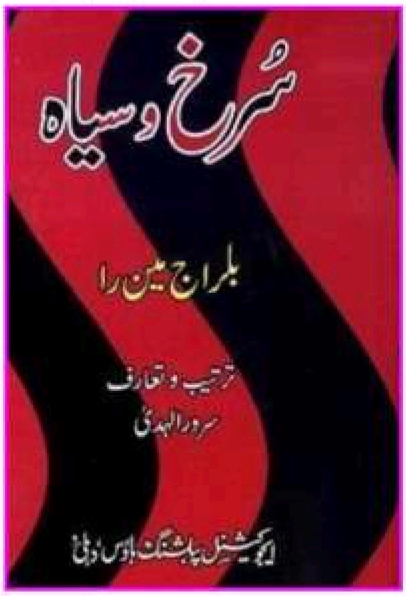

''سگریٹ پینا ایک علت ہے!

میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے؟''

اس خیال کو وہ اپنے ذہن سے جھٹکتے ہوئے وقت، بدن کی تھکن اور گرد و پیش کی ہر چیز سے بے خبر گرتا پڑتا ماچس کی تلاش میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ وہ لمحہ بھر کو رکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ سامنے سے کوئی آ رہا ہے اس کی حالت بھی بالکل اسی کی طرح ہے۔ وہ شخص بھی اس سے وہی سوال کرتا ہے جو رات بھر ماچس کی تلاش میں مختلف لوگوں سے کرتا رہا ہے۔ افسانے کے آخری چند جملے دیکھیے:

''آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

ماچس کے لیے تو میں...''

وہ اس کی بات سنے بغیر ہی آگے بڑھ جاتا ہے جدھر سے وہ خود آیا تھا۔ ظاہر ہے یہاں افسانہ نگار نے اپنی طرف سے کوئی وضاحت نہیں کی بلکہ چند جملوں میں اپنی بات ختم کر دی۔ یہ شش و پنج کی کیفیت، ساری رات محض ماچس کے لیے تلاش و جستجو کی اذیت اور ہر جگہ سے انکار یا شک و شبے کی اذیت ہی دراصل بلراج مینرا کے اس افسانے ماچس (جو بعض جگہ 'وہ' کے عنوان سے بھی چھپا ہے) کا مرکزی خیال ہے۔ تفصیلات سے گریز اور اشاروں کنایوں میں بات کہنے کا انداز بلراج مینرا کے فن کی بنیادی انفرادیت ہے جو ان کے افسانوں کی معنویت میں اضافہ بھی کرتا ہے اور معنی و مفہوم کے مزید امکانات کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ متعدد تنقید نگاروں نے الگ الگ انداز میں بھی اس افسانے کی تفہیم کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

■

Dr. Noor Fatima
Asst Prof. Dept of Urdu
MANUU, Lucknow Campus
504/122, Tagore Marg
Near Shadab Market
Lucknow - 226020 (UP)

حبیب تنویر

لوک تھیٹر کی بازیافت

محمد شاہ نواز قمر

ہندستان کے تہذیبی افق پر حبیب تنویر(1 ستمبر 1923 - 8 جون 2009) ایک ایسے روشن ستارے کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی تابانی کا تمام تر دارومدار اس جدت وروایت کے حسین امتزاج میں پوشیدہ ہے جو اپنے فن کا خمیر عوامی روایت سے اٹھاتے ہیں اور اسے عصر حاضر کے مسائل وامکانات سے وابستہ کر کے ایک نئی جہت عطا کردیتے ہیں۔حبیب تنویر کی یہی وہ خصوصیت ہے جو انھیں جدید ہندستانی ڈرامے کے معماروں میں شامل کرتی ہے۔ اردو قارئین اور ڈرامے کے شائقین بالعموم حبیب تنویرکو ان کے شہرۂ آفاق ڈرامے 'آگرہ بازار' (1954) کے خالق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ نظیرا کبرآبادی کی زندگی اوران کی نظموں کی مدد سے تیارشدہ 'آگرہ بازار' میں اس عہد کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی زندگی کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے لیکن 'آگرہ بازار' کی غیر معمولی کامیابی کا راز اس کی پیش کش میں پوشیدہ ہے۔ پرشکوہ اسٹیج، پیش کش کا نرالا انداز اور مختلف پس منظر رکھنے والے تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ اداکاروں کا جم غفیر اردو دنیا ہی نہیں ہندستانی تھیٹر کے شائقین کے لیے بھی ایک نیا تجربہ تھا جو 'آگرہ بازار' کو اردو ڈرامے کی روایت میں ایک امتیازی شان عطا کرتا ہے اور حبیب تنویر اردو ڈرامے کی تاریخ کا ایک اہم باب بن جاتے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ حبیب تنویر کے ڈرامائی سفر میں 'آگرہ بازار' کی حیثیت منزل کی نہیں ابتدائے سفر کی ہے جو انھیں 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' کی طرف لے جاتی ہے۔

اگر چہ حبیب تنویر چھتیس گڑھ کے رائے پور ضلع کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے لیکن رقص وموسیقی اور گیت وسنگیت وہاں کی تہذیبی فضا میں اس طرح گھلے ملے تھے کہ بچپن میں ہی وہ ان کے سحر میں گرفتار ہوگئے۔ ''بچپن میں پہلی بار جو تھیٹر دیکھا اور نیچے سے اوپر اٹھتے ہوئے پردے کا چمتکار، تو میں مبہوت ہوگیا۔ ہیروئن کے رول میں بھائی جان اور ہیرو جانباز کے رول میں ہمارے پڑوسی لطف اللہ تھے۔ جب ہیرو زنجیروں میں بندھا جیل میں ڈال دیا گیا اور ہیروئن رو رو کر بین کرتی رہی تو درشکوں میں بیٹھا میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور میری ہچکیاں بندھ گئیں''

(حبیب تنویر، پردہ کھلتا ہے، دہلی: کتاب گھر، 2013، ص 17)

ابھی وہ دوسری جماعت کے طالب علم ہی تھے کہ انھوں نے اسٹیج کا عملی تجربہ کیا اور 'گوہر افلاس، عرف پولش والا' میں ایک جوتے پالش کرنے والے لڑکے کا مرکزی کردار ادا کیا۔ ان کے بہترین پرفارمنس کی وجہ سے انھیں 'ٹھاکر لال سنگھ سلور کپ' سے بھی نوازا گیا۔اسکول اور کالج کے زمانے میں ہی انھوں نے کئی ملکی اور غیر ملکی ڈراموں میں حصہ لیا اور اپنی بہترین کارکردگی اور دلکش آواز کے ذریعے ناظرین کو مبہوت کیا اور داد وتحسین وصول کی۔ اداکاری اور فلم بینی کے شوق نے ہی بالآخر انھیں رسمی تعلیم سے بھی دور کر دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھے جب انھوں نے مختلف پوزوں میں اپنی تصویریں کھنچوائیں اور ممبئی بھیج دیں اور پھر خود بھی ممبئی پہنچ گئے۔ فیکٹری میں کام کیا، فلموں میں اداکاری کی، ریڈیو کے لیے تبصرے لکھے، کئی ہندی انگریزی اخبارات کی ادارت سنبھالی اور 'اپٹا' کے قیام (1943) کے ساتھ ہی اس سے عملی طور پر وابستہ ہوگئے۔ یہیں پر انھوں نے ڈرامے کی مختلف ہیئتوں، لوک فارموں، علاقائی گیتوں سے شناسائی حاصل کی اور ادب وآرٹ کو ایک بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔عوامی فلاح وبہبود کا شدید جذبہ ان کے دل میں یہیں پر جاگزیں ہوا اور اسی کی تبلیغ وتشہیر میں انھوں نے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔

آزادی کے بعد جب اپٹا کا زوال ہوا، تو وہ دہلی آگئے۔ اسی دوران 'یوم نظیر' کے سلسلے میں اپنے دوست اطہر پرویز کی فرمائش پر انھوں نے 'آگرہ بازار' (1954) لکھا۔ آگرہ بازار کی غیر معمولی مقبولیت نے انھیں اردو ڈراما نگاری کی تاریخ میں امر کردیا۔ لیکن 'ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب' کے مصداق وہ 'دشت امکاں' میں سالوں سال بھٹکتے رہے۔ تھیٹر کی مزید تعلیم کے لیے لندن (1955) گئے۔ وہاں انھوں نے رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس (RADA) میں تھیٹر کی رسمی تعلیم حاصل کی، پھر برسٹل اولڈ وک تھیٹر اسکول کے مشہور ومعروف تھیٹر پروڈیوسر ڈنکن راس (Duncan Ross) سے پیش کش، اسکرپٹ نگاری، پروڈکشن اور مکھوٹا سازی کا فن سیکھا۔ پورے یورپ کا دورہ کیا، مختلف علاقوں کا تھیٹر دیکھا، برتولت بریخت (1898-1956) سے ملنے جرمنی گئے لیکن تب تک ان کی وفات ہوچکی تھی۔ وہاں ان کے قائم کردہ تھیٹر گروپ Berliner Ensemble میں ان کے ڈراموں کو دیکھا اور ان کے فن کو باریکی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کے لیے جس فارم کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اس کی جھلکیاں انھیں بریخت کے یہاں دکھائی دیں۔ واپسی پر جب انھوں نے اپنے علاقے میں رائج چھتیس گڑھی لوک ناٹک 'ناچا' کا تنقیدی جائزہ لیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ 'ناچا' سیکولر ڈراما کی ایک چھتیس گڑھی شکل ہے جس میں ناچ اور گانے کی مدد سے کسی کہانی کو کھلے منچ پر پیش کیا جاتا ہے۔ ناچا کلاکاروں کی حیرت انگیز اداکاری اور رقص وموسیقی کی صلاحیت وقابلیت سے وہ اتنے مبہوت ہوئے کہ انھیں اپنے ساتھ دہلی آکر کام کرنے کی پیش کش کردی۔ مدن لال، ٹھاکر رام، بابوداس اور بلوارام ان چھتیس گڑھی کلاکاروں میں ہیں جنھوں نے حبیب تنویر کی پیشکش پر لبیک کہتے ہوئے جدید ہندستانی تھیٹر میں ایک نئے رجحان کی بنیاد ڈال دی۔ مرکزی ہندستانی تھیٹر میں لوک اداکاروں کے ذریعے لوک فارموں کی پیشکش ایک بالکل نئی چیز تھی

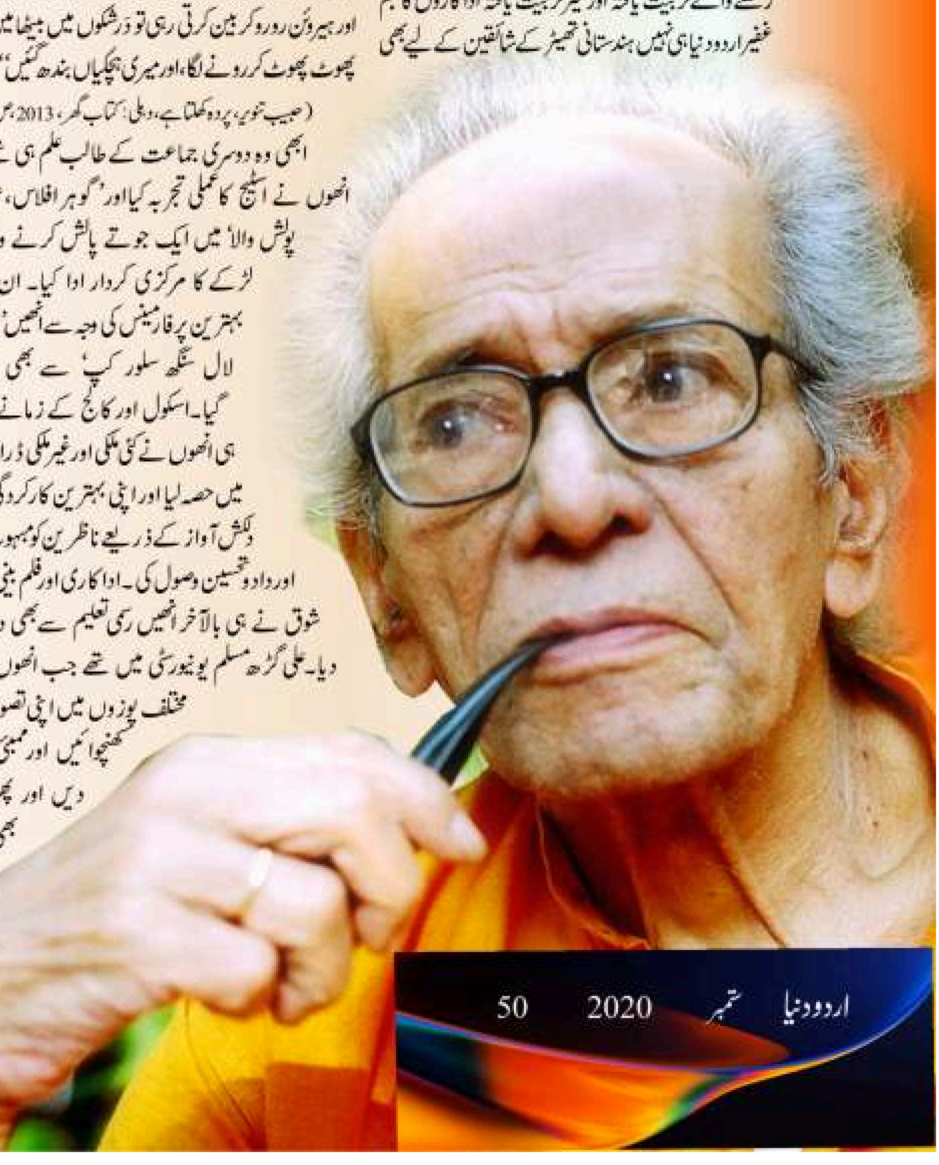

جس کا سہرا پوری طرح حبیب تنویر کے سر جاتا ہے۔

لیکن ان فن کاروں کو مین اسٹریم تھیٹر میں پیش کرنا حبیب کے لیے آسان نہیں تھا۔ ان کے سامنے مختلف دقتیں آئیں۔ سب سے پہلے جب انھوں نے ان کلاکاروں کو بیگم قدسیہ زیدی کے 'ہندستانی تھیٹر' کے منچ پر اتارا تو بیگم قدسیہ کو ان دیہاتی فن کاروں کی شکل وشباہت بالکل پسند نہیں آئی۔ ان کے مطابق تھیٹر جوان، خوبصورت اور مہذب فن کاروں کا تقاضا کرتا ہے اور چھتیس گڑھ کے یہ کلاکار ان معیارات پر پورے نہیں اترتے۔ جب کہ حبیب کی رائے بیگم قدسیہ سے بالکل مختلف تھی اور نتیجتاً انھیں 'ہندستانی تھیٹر' کو خیر باد کہنا پڑا۔

حبیب تنویر اور مونیکا مشر (جن کے ساتھ بعد میں حبیب تنویر کی شادی ہوئی) نے مل کر ایک ناٹک منڈلی قائم کی اور اس کا نام 'نیا تھیٹر' (1959) رکھا۔ حبیب تنویر پر اب کوئی پابندی نہیں تھی اور اب وہ ڈرامائی پیشکش میں آزاد تھے۔ نیا تھیٹر کے بینر تلے انھوں نے شہری اور دیہی فنکاروں کے ساتھ مل کر تجربہ کرنا شروع کیا اور مختلف ڈرامے جیسے 'سات پیسے'، 'جالی دار پردے'، 'شطرنج کے مہرے'، 'مرزا شہرت بیگ'، 'رستم وسہراب' اسٹیج کیے لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔

1973 کے بعد حبیب تنویر نے رنگ منچ سے متعلق اپنی سوچ وفکر پر از نو غور کرنا شروع کیا۔ چھتیس گڑھ کے وہ فن کار جنھیں اپنے ساتھ وہ بڑی امیدوں سے لائے تھے، ان کی امیدوں پر پورے نہیں اتر رہے تھے۔ جبکہ وہ ان کی صلاحیتوں کے معترف اور خوبیوں سے بخوبی واقف تھے۔ اپنے فن میں کامل ہونے کے باوجود وہ حبیب کی ہدایتوں پر پوری طرح عمل نہیں کر پا رہے تھے۔ حبیب تنویر اس دوران مختلف ریاستوں کے لوک کلاکاروں سے مل چکے تھے، ان کے ساتھ کئی ورکشاپ بھی کر چکے تھے، مگر کوئی کمی تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے اور اس کا غصہ وہ اکثر اپنے آرٹسٹوں پر نکالتے۔ کئی برسوں کے تجربے اور متواتر ناکامی کے بعد بالآخر انھیں یہ بات سمجھ میں آئی کہ جن لوک کلاکاروں کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں انھوں نے نہ تو کبھی کوئی رسمی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ ہی ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اول تو یہ کہ حبیب تنویر اب تک جو ڈرامے پیش کر رہے تھے وہ اردو کے تھے اور ناچا کلاکاروں کی مادری زبان چھتیس گڑھی تھی اور وہ اردو اچھی طرح نہیں بول سکتے تھے۔ دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی بھی طرح کی بندش کے عادی نہ تھے یعنی وہ کھلے میدان میں ڈراما کرنے والے آزاد کلاکار تھے جہاں حرکت وعمل پر کوئی پابندی نہ تھی۔ حبیب تنویر ان ناخواندہ فنکاروں پر اپنی مغربی تعلیم اور اردو زبان تھوپ رہے تھے۔

مادری زبان کا استعمال اور حرکت وعمل کی آزادی کے ساتھ امپرووائزیشن کی تکنیک نے جیسے ان کلاکاروں کے فن میں جان ڈال دی۔ ان کی اداکاری میں وہ قوت اور لچک لوٹ آئی جس کی ان سے امید کی جاتی تھی۔ اسی دوران حبیب تنویر نے رائے پور میں ایک ناچا ورکشاپ کا انعقاد کیا۔ چھتیس گڑھ کی مختلف ناچا منڈلیوں نے اس ورکشاپ میں شرکت کی۔ اس ورکشاپ کا مقصد ایک ایسا ڈراما تیار کرنا تھا جو ہیئت وموضوع دونوں اعتبار سے 'ناچا' سے ماخوذ ہو۔ اسی ورکشاپ کا حاصل ان کا مشہور ڈراما ''گاؤں کا ناؤ سسرال مور ناؤ داماد'' تھا، جسے تین مختلف لوک کہانیوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے ایک کولاژ کی صورت میں انھوں نے پیش کیا تھا۔ حبیب کا یہ تجربہ کافی کامیاب رہا اور چھتیس گڑھ میں ہی نہیں دہلی کے ناظرین میں بھی اسے کافی مقبولیت ملی۔ اس کی کامیابی کے ساتھ ہی حبیب کے لیے رنگ منچ کا نیا دروازہ کھل گیا۔ ''مجھے محسوس ہوا کہ دہلی نے مجھے قبول کر لیا تھا۔ ... یہ میری زندگی کا اہم موڑ اور چھتیس گڑھی زبان کو جدید ڈرامے کی زبان کی حیثیت سے متعارف کرانے کی جانب پہلی کامیابی تھی۔'' حبیب اب تک شہری فنکاروں کے شانہ بشانہ دیہی کلاکاروں کا استعمال کرتے رہے تھے لیکن اس ڈرامے کی غیر معمولی کامیابی کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ چھتیس گڑھی کلاکاروں پر مرکوز کر دی اور اب ان کی پوری کاسٹ انھی لوک کلاکاروں پر مبنی تھی۔

رنگ منچ کی دنیا میں حبیب تنویر کا سب سے اہم کارنامہ 'چرن داس چور' (1974) ہے۔ یہ وہ ڈراما ہے جو نہ صرف ان کی اور ان کی ناٹک منڈلی کی عالمی شہرت کا سبب بنا بلکہ 1982 کے 'ایڈنبرا انٹرنیشنل ڈراما فیسٹیول' میں 'فرنج فرسٹ ایوارڈ' (Fringe Firsts Award) کا خطاب جیت کر ہندستانی تھیٹر کو بھی عالمی سطح پر ایک اونچا مقام دلایا۔ 'چرن داس چور' موجودہ عہد میں لکھے گئے ڈراموں میں کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے اور اسے تمام ڈرامائی عناصر کا مثالی نمونہ سمجھا جاتا ہے اور یہ ڈراما حبیب تنویر کے ایک مکمل تھیٹر فارم کی بھی بنیادی خصوصیات سے بھرپور ہے۔ (انجم کاتیال: حبیب تنویر ٹوواردس این انکلوزیو تھیٹر، ص 63)

یہ ڈراما بھی 'گاؤں کا ناؤ سسرال مور ناؤ داماد' کی طرح ایک ورکشاپ کا ہی نتیجہ تھا۔ اس کا پلاٹ راجستھان کی مشہور لوک کہانی کا روجے دان دیتھا کی کہانی سے ماخوذ ہے۔ یہ ایک ایسے چور کی کہانی پر مبنی ہے جو بے حد بہادر، نڈر اور اپنے فن میں ماہر ہونے کے ساتھ بے حد سچا، دیانتدار اور اپنے وعدے پر جان دے کر بھی قائم رہنے والا ہے۔

حبیب تنویر نے سب سے پہلے اس کہانی کو راجستھان میں چل رہے ایک ورکشاپ میں ڈرامائی شکل دینے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ 1974 کے اواخر میں بھلائی (چھتیس گڑھ) کے ورکشاپ کے دوران انھوں نے اس کہانی پر دوبارہ کام کرنا شروع کیا۔ یہ ورکشاپ بھلائی کے کھلے میدان میں چل رہا تھا۔ یہ ستنامی تقریب کا موقع تھا اور جب انھوں نے ستنامیوں کو بار بار اسٹیج پر آتے جاتے دیکھا تو انھیں اس کہانی کو پیش کرنے کی ترغیب ملی۔ انھوں نے یہ اعلان کیا کہ میرے پاس ایک نامکمل ڈراما ہے لیکن کیونکہ یہ موقع ستنامیوں کے جشن کا ہے اور ان کی زندگی کا موٹو بھی سچائی یعنی 'ستیہ ہی اشور ہے، اشور ستیہ' ہے، کیوں نہ اس ڈرامے کو یہاں پیش کیا جائے۔ اس طرح حبیب تنویر نے 'نیا تھیٹر' اور چھتیس گڑھ کی مختلف ناٹک منڈلیوں کے اداکاروں کے ساتھ مل کر شروع میں 40 منٹ کا ایک برجستہ (Improvised) ڈراما پیش کیا جسے وہاں خوب سراہا گیا۔ وہ اس پر مسلسل کام کرتے رہے اور جب دہلی کے ناظرین کے سامنے اسے پیش کیا تو ان کا ردعمل خود حبیب تنویر کی زبانی سنیے:

''کمانی آڈیٹوریم میں جب اسے پہلی بار پیش کیا گیا تو وہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔ وہ (چرن داس) مر گیا۔ مکمل خاموشی۔ عجیب خاموشی۔ ناظرین یہ سوچتے ہوئے کھڑے ہو گئے کہ اگلی لائن کب آئے گی؟ پریشان ...اور پھر باہر جانے سے پہلے وہ رکے، گھومے اور پھر کئی منٹوں کے لیے دروازے پر بے چین کھڑے رہے۔''

(حبیب تنویر: اٹ مسٹ فلو، ص 68)

چرن داس چور کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد حبیب نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اب انھوں نے پوری توجہ چھتیس گڑھ کی لوک کہانی، موسیقی، رقص ونغمہ اور رسم و رواج کو ڈرامائی صورت میں ڈھالنے کی طرف مبذول کر دی۔ اس کے لیے انھوں نے چھتیس گڑھی زبان کو ہی وسیلۂ اظہار بنایا۔ 'چرن داس چور' کے بعد انھوں نے کئی اہم ڈرامے اسٹیج کیے جیسے 'ہرما کی امر کہانی'، 'بہادر کلارن'، 'دیکھ رہے ہیں نین' اور 'کام دیو کا اپنا بسنت ریتو کا سپنا' وغیرہ مگر 'چرن داس چور' کی ہمسری کوئی نہیں کر سکا۔

1990 کے اواخر میں حبیب تنویر اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ دہلی سے بھوپال منتقل ہو گئے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام گزارے۔ انھوں نے تھیٹر کے اپنے ساٹھ سالہ کیریئر میں تقریباً ڈیڑھ سو سے زائد ڈرامے اسٹیج کیے جن میں کئی میل کے پتھر بھی ثابت ہوئے۔

■

Md Shahnawaz Quamar
08, Kaveri Hostel, JNU
New Delhi-110067
Mob:9599493749

توصیف بریلوی

مانک ٹالا کے افسانوں میں ہندو دیومالائی عناصر

گوپال کرشن مانک ٹالا (پ: 20 ستمبر 1924 - و: 1 فروری 2013) کی شناخت ماہر پریم چندیات کے طور پر کی جاتی ہے لیکن بچپن سے اردو ادب کا وسیع مطالعہ کرنے کی وجہ سے انھوں نے خود کو فکشن سے قریب پایا اوران کی پہلی کتاب 'پیاسی بیل' (اپریل 1964) افسانوی مجموعے کی شکل میں منظر عام پر آئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے افسانہ نگار اور بعد میں محقق اور ماہر پریم چندیات ہیں۔ گوپال کرشن ان کا نام اور مانک ٹالا خاندانی نام ہے۔ مانک ٹالا کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے آبا واجداد موتیوں کی تجارت کرتے تھے اور اسی لیے ان کا خاندان 'مانک ٹالا' کہا جانے لگا تھا جسے موصوف نے اپنا قلمی نام بنایا اور شہرت پائی۔ مانک ٹالا نے اپنے اصل نام گوپال کرشن کو اس لیے نہیں لکھا کیونکہ اس وقت تک کرشن چندر ادبی دنیا میں مشہور ہو چکے تھے۔ مشابہت سے بچنے کے لیے مانک ٹالا استعمال کیا۔ 21 ستمبر 1924 لاہور کے نزدیک قصبہ باغبان پورہ میں پیدا ہوئے اور ملک کی تقسیم سے پہلے وہ بی ایس سی کر چکے تھے اور جرنلزم میں ڈپلوما کر رہے تھے۔ ہجرت کے بعد تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور پہلے شملہ پھر دہلی اور اس کے بعد ممبئی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہ تو ہوا مانک ٹالا کا مختصر تعارف۔ اب دیو مالا کے متعلق بھی کچھ عرض کرتے چلیں تاکہ مانک ٹالا کے افسانوں پر اس کے بعد کچھ گفتگو کی جا سکے۔

'دیو مالا' ایک اپسرا کا نام تھا جو کہ ہندی زبان کا لفظ ہے اور ظاہر ہے سنسکرت سے ہندی میں پہنچا۔ عربی میں اسے اساطیر یا علم الاصنام کہتے ہیں اور اسی لیے اردو والے بھی اسے اساطیر، علم الاصنام یا صنمیات کہتے ہیں۔ انگریزی میں دیو مالا کے لیے لفظ Mythology استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی ایسا کوئی ملک، قوم، علاقہ اور مذہب ہوگا کہ جس کا تعلق اساطیر سے نہ ہو۔ مختلف قسم کی اساطیر یا دیو مالائیں ہیں جن میں ہندو دیو مالا یا ہندوستانی اساطیر، عربی اساطیر، یونانی اساطیر، چینی اساطیر، جاپانی اساطیر، یہودی اساطیر، ایرانی اساطیر، افریقی اساطیر وغیرہ بطور خاص ہیں۔

دیو مالا، اساطیر یا علم الاصنام وہ علم ہے جس میں کسی بھی مذہب، قوم اور علاقے کی قدیم تاریخ اور اس مذہب کے پھلنے پھولنے، اس کو بنانے میں اہم کردار ادا کرنے والے پراسرار لوگ، رشی منی، بزرگ، دیوی دیوتا، راکشش یعنی اچھے اور برے ہر طرح کے کرداروں کا ذکر بڑی ہی ڈرامائی کیفیت کے ساتھ اکثر تاریخی حوالوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

ہندو پورانک کتھائیں اور وید مثلاً: چاروں وید (رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھروید)، مہابھارت، رامائن اور پُران۔ ان سبھی کتابوں میں ہندو مذہب کے متعلق تو معلومات ہیں ہی ساتھ ہی دیوی دیوتاؤں کی کریائیں، ان سے سرزد ہونے والے رفاہ عامہ کے لیے کارناموں کا ذکر، شور ویروں کا ذکر، راکششوں اور اسوروں کا ذکر، دیوتاؤں اور اسوروں کی مایاوی جنگوں کا ذکر وغیرہ ملتا ہے جو کہ ہندو اساطیر یا ہندوستانی اساطیر کا خاصہ ہے۔

مانک ٹالا کے افسانوں میں ہندو دیو مالائی عناصر کی نشاندہی سے پہلے ایک بات اور عرض کی جاتی ہے کہ دیو مالا میں داستانوں کی طرح مافوق الفطری عناصر ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار نے انھیں ہو بہو افسانے میں شامل کر دیا ہو۔ افسانہ نگار افسانے کے واقعے کو مضبوطی دینے یا اس کی تائید میں صرف ایک جملے سے بھی دیو مالائی واقعے کی طرف اشارہ کر سکتا ہے یا پھر کسی محاورے سے بھی یہ کام لے سکتا ہے بعض اوقات افسانہ نگار یہی کام افسانے کے عنوان اور کرداروں کے ناموں اور ان کے کاموں سے بھی لیتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی عورت کا نام لکشمی ہے اور اس کے قدم رکھتے ہی اس کے شوہر کے گھر میں دولت کی بارش ہونے لگی تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے یہاں ہندو دیو مالائی کردار دھن کی دیوی یعنی لکشمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مانک ٹالا کے افسانوں میں لاہور کی گلیوں، میلوں ٹھیلوں کا ذکر، بچپن، ہجرت کا کرب، ہندو مسلم اتحاد، وفاداری، عشق و محبت، سیر و سیاحت اور تجارت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ایسا اس لیے بھی کہ ان کی زندگی لاہور سے شروع ہو کر ہجرت کے بعد شملہ، دہلی اور ممبئی میں گزری اور ان کی سیر و تفریح کی خواہش اپنے بھائی کی تجارت کے کام کو ودیشوں میں پھیلانے کی وجہ سے پوری ہوئی۔ ان موضوعات کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتے وقت وہ حقائق کو ترجیح دیتے ہیں لگتا ہی نہیں کہ ان کا کوئی بھی افسانہ حقیقت پر مبنی نہ ہو۔ انھیں افسانوں کے درمیان ہندو دیو مالائی عناصر بھی راہ پا جاتے ہیں ایسا شاید اس لیے بھی ہوا کیونکہ وہ ایک ہندو کنبے سے تعلق رکھتے تھے اور یہ سب ان کی گھٹی میں پہلے ہی تھا لیکن ان کے افسانوں میں مسلم اور دیگر اساطیر بھی دیکھنے ملتی ہیں۔ مانک ٹالا کے وہ افسانے جن میں ہندو دیو مالائی عناصر واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں وہ ہیں: 'ست یگ کا آدمی'، 'بندھن'، 'گدھوں کی کمی نہیں'، 'معجزہ'، 'طمانچہ'، 'فردوس گم گشتہ'، 'سراب'، 'رشوت'، 'ڈورین گرے کی دوسری تصویر'، 'وش کنیا'، 'نالی کا کیڑا'، 'تھوتھا چنا'، 'مادھو لال حسین'، 'ہوری کا دوسرا جنم' اور 'کالکی اوتار' بطور خاص ہیں۔ ان افسانوں میں مانک ٹالا نے ہندو دیو مالائی عناصر کو کرداروں، تاریخ، عنوان یا کہاوت کے ذریعے سمویا ہے۔

موصوف کا مشہور افسانہ 'گدھوں کی کمی نہیں' سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ہم نے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر ننگے بدن، بھوکے پیٹ، ایک سو ایک روز تک سمادھی لگائی تھی۔ ہم نے بدری ناتھ اور کیدار ناتھ کے مندروں کے سامنے چالیس چالیس روز ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اتر دھیان

کیا۔ تب جا کر ہمیں گیان ہوا۔ بھگوان نے ہمارے کان میں یہ منتر پھونکا اور کہا کہ جادو کی دنیا کے کشٹ دور کرو اور یہ منتر گھر گھر میں بانٹ دو۔ اس کاغذ پر یہی وہ منتر ہے جس سے جادو کا اثر نشٹ ہو گیا۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں ایک ٹھگ جوگی کا روپ دھارے ہوئے ہے وہ ان مقامات پر تپسیا کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے جہاں پر کسی زمانے میں شو جی آسن لگا کر بیٹھتے تھے۔ ہندو دیو مالا میں شو جی کا بڑا مقام ہے۔

دوسرا جنم ہندو مذہب اور ہندو دیو مالا میں اہمیت کا حامل ہے۔ ہندو دیو مالا کے مطابق انسان کو ان کے کرموں کے مطابق ہی انسان یا جانوروں کے قالب میں اگلا جنم دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی انسان اچھے کام کرتا ہے تو ہی اسے اگلے جنم میں انسان کا جنم مل سکتا ہے ورنہ اسے کسی جانور کا جنم ملتا ہے۔ افسانہ 'طمانچہ' میں گردھاری اور اس کی بیوی کی گفتگو سے اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''صرف ایک سیر؟ گردھاری کی بیوی نے اس کا مذاق اڑایا۔ کم سے کم تین سیر ہوگا ہی۔ میرے ہاتھ سے تو پٹاری ہی گر چلی تھی۔ بہت مشکل سے سنبھالی تھی۔

'ہاں اڑھائی تین سیر سے کم کیا ہوگا' گردھاری نے بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی 'ہم تو سمجھ بیٹھے تھے بڑھیا بالکل پھانک ہے۔'

'دیگ کے سانپ کی کہاوتیں سنی تھیں۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا'

بھگوان کی قسم پچھلے جنم میں ضرور ناگن ہوگی یہ بڑھیا۔''[2]

مذکورہ بالا اقتباس کے آخری جملے میں پچھلے جنم کی بات ہندو دیو مالائی عنصر ہے جس میں اس بڑھیا کو دولت کو محفوظ کرنے کی وجہ سے گردھاری کی بیوی اسے پچھلے جنم میں ناگن کہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گردھاری اور اس کی بیوی کو یہ لگتا ہے کہ اس بڑھیا نے بہت سے زیورات بچا کر رکھے ہوئے ہیں۔

محنت کے ذیل میں افسانہ 'فردوس گم گشتہ' سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دیوتاؤں نے زہر کا سمندر بلو کر امرت نکال لیا تھا۔ جذبہ صادق ہو تو زندگی کی تلخیوں میں ڈھلے ہوئے پیکر میں انسان محبت کا امرت پی سکتا ہے۔''[3]

اس مختصر سے اقتباس میں ہندو دیو مالا کے اس دور کا ذکر ہے جب دیوتاؤں نے ایک بڑے سے اژدر کی مدد سے سمندر کو بلویا تھا ٹھیک ویسے ہی جیسے دہی کو بلو کر مکھن نکالتے ہیں۔ ہندو دیو مالا میں یہ بہت ہی اہم واقعہ ہے۔ انھوں نے سمندر سے امرت نکالا تو گویا کہ ہندو اساطیر کے مطابق امرت سمندر میں ہوتا ہے۔ اس بات کا بھی علم ہوتا ہے۔

افسانہ 'وش کنیا' میں جدید دور کے میاں بیوی کی کہانی ہے لیکن جب میاں کو اپنی بیوی پر شک ہو جاتا ہے تو وہ اس ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ کب وہ اپنی بیوی کو اس کے عاشق کی تصویر کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑے۔ اس کے اس ہرجائی پن کی وجہ سے وہ اسے من ہی من وش کنیا کہتا ہے۔ افسانہ 'وش کنیا' سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''نیند کی آغوش میں مدہوش ریتا کا پر شباب سنہری پیکر کرنوں کے سمندر میں نہا رہا تھا۔ کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ وارفتہ سا ہو کر ریتا سے لپٹ جاتا لیکن آج اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے مدمقابل اس کی ریتا نہیں بلکہ کوئی وش کنیا سو رہی ہے جس کے ایک ہی لمس سے وہ موت کی آغوش میں پہنچ جائے گا۔''[4]

مندرجہ بالا اقتباس میں شوہر اپنی بیوی کو وش کنیا سمجھنے لگتا ہے۔ ہندو دیو مالا میں وش کنیاؤں کا ذکر خوب ملتا ہے۔ وش کنیا ایک ایسی عورت ہوتی تھی جسے بچپن ہی سے لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کا ہنر سکھایا جاتا تھا اور بالخصوص اس کو دھیمے دھیمے زہر پلا کر پروان چڑھایا جاتا تھا کہ اس پر کوئی بھی زہر اثر نہیں کرتا تھا اور وہ اگر کسی کے ناخن بھی مار دے تو وہ شخص سیدھے موت کے منہ میں پہنچ جائے۔ یوں تو یہ وش کنیا والا معاملہ عہد قدیم سے تعلق رکھتا ہے لیکن کہا جاتا ہے اس طرح کی کنیاؤں کا استعمال کافی بعد تک راجا مہاراجاؤں کے زمانے میں بھی ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ مغلوں کے زمانے میں بھی۔

سناتن دھرم کے مطابق جب دنیا پر پاپ بڑھیں گے تو بھگوان وشنو کالکی اوتار لے کر دنیا پر آئیں گے اور پاپیوں کا سنگھار کریں گے۔ کالکی اوتار کا ذکر ہندو مذہبی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ افسانہ کالکی اوتار میں مانک ٹالا نے وشنو دیو، نارد منی، شو جی اور پاروتی وغیرہ کے دور جدید کی مناسبت سے حالات بیان کیے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ افسانہ مزاحیہ ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ افسانہ بہت ہی گمبھیر حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانوں نے بگاڑ رکھے ہیں جس سے دیوی دیوتا تک متاثر ہو جاتے ہیں۔ اسی افسانے میں افسانہ نگار نے انسانوں کے ذریعے پھیلائی ہوئی آلودگی کا ذکر بھی کیا ہے اس سے مانک ٹالا کی ماحولیاتی حسیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ یوں تو پورا افسانہ ہی ہندو دیو مالا کے تانے بانے سے بنا گیا ہے اور ساتھ ہی جدید دنیا کی جارحیت کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ افسانہ کالکی اوتار سے ایک ٹکڑا دیکھیں:

''برہم لوک میں وشنو بھگوان تیار ہو کر باہر ٹہل رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں گدا دوسرے میں چکر، تیسرے میں شنکھ اور چوتھے میں تازہ کنول کا پھول چاروں طرف اپنی سگندھ پھیلا رہا ہے۔ ان کی اردھانگنی (نصف بہتر) لکشمی دیوی ابھی تک تیار ہو کر باہر نہیں آئی ہیں۔ ناری ہو یا دیوی تیار ہونے کے لیے دو منٹ کا مطلب دو گھنٹہ ہوتا ہے۔ آج وہ لکشمی دیوی کے ساتھ اپنے واہن گرڑ (عقاب اور انسان سے مشابہ پرندہ) پر بیٹھ کر تینوں لوکوں کی سیر کے لیے جانے والے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر گرڑ اپنے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جیٹ انجن کے طیاروں سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتار گرڑ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک بارہا اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

اتنے میں 'نارائن نارائن' کہتے ہوئے نارد منی پرکٹ (نمودار) ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں وینا (جو ان ہی کی ایجاد تھی) اور دوسرے میں کھڑتال۔ گلے میں رودراکش کی مالائیں، بازوؤں اور کلائیوں میں موتیے کے گجرے۔ وشنو بھگوان کو ڈنڈوت پرنام کیا اور ایک طرف ادب سے کھڑے ہو گئے۔''[5]

'کالکی اوتار' افسانہ پوری طرح سے ہندو دیو مالائی کرداروں کی مدد سے لکھا گیا ہے اور ان کرداروں کا آج کے زمانے سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

مانک ٹالا کے دیگر افسانوں میں بھی ہندو دیو مالائی عناصر ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں چکر دھر، لکشمی، درگا اور سریتا جیسے دیو مالائی کردار بآسانی مل جائیں گے۔ ساتھ ہی دیو مالائی واقعات بھی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں ہندو معاشرے یا گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے ان میں کہیں نہ کہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر ہندو دیو مالائی عناصر در آتے ہیں۔

حواشی

1. (افسانوی مجموعہ: پیاسی بیل، افسانہ: گدھوں کی کمی نہیں- مانک ٹالا، بھارت لیتھوورکس، بمبئی، اپریل 1964، ص 135
2. افسانوی مجموعہ: پیاسی بیل، افسانہ: طمانچہ- مانک ٹالا، بھارت لیتھوورکس، بمبئی، اپریل 1964، ص 150
3. افسانوی مجموعہ: پیاسی بیل، افسانہ: فردوس گم گشتہ- مانک ٹالا، بھارت لیتھوورکس، بمبئی، اپریل 1964، ص 170
4. افسانوی مجموعہ: گناہ کا رشتہ، افسانہ: وش کنیا- مانک ٹالا، یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس، بمبئی، 1974، ص 122، 123
5. افسانوی مجموعہ: ہوری کا دوسرا جنم، افسانہ کالکی اوتار- مانک ٹالا، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، فروری 1999، ص 73

■

Tauseef Barelvi
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9058296593

مشرقی پنجاب میں اردو صحافت

امتیازات و خصوصیات

یوسف رامپوری

'مشرقی پنجاب' سرزمین ہند کا وہ خطہ ہے جس نے اردو کے ارتقا و فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اردو سے اس علاقے کا رشتہ شروع سے ہی رہا ہے۔ اسی لیے بعض ماہرین لسانیات کو اردو کی جڑیں پنجاب کی مٹی میں نظر آئیں۔ اردو سے پنجاب کے دیرینہ تعلق ہی کی وجہ سے یہاں اردو کی مختلف اصناف کے ماہرین و مشاہیر نے جنم لیا اور دنیا بھر میں اپنی انفرادیت و شناخت قائم کی۔ حالانکہ تقسیم ہند کے سانحہ اور امتداد زمانہ کے باعث پنجاب کی جغرافیائی حدود تبدیل ہوئیں، مگر اردو مختلف قسم کے تغیرات کے بعد بھی پنجاب میں زندہ رہی۔ جہاں تک اردو صحافت کی بات ہے تو پنجاب میں اردو صحافت کا ایک تابناک ماضی رہا ہے اور آج بھی اردو صحافت پنجاب میں زندہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پنجاب میں اردو صحافت کو عہد بہ عہد مختلف النوع حالات سے گزرنا پڑا۔

پنجاب میں اردو صحافت کے آغاز کا زمانہ وہی ہے جو اردو صحافت کے باضابطہ وجود میں آنے کا زمانہ ہے۔ پنجاب میں اردو کا باضابطہ پہلا مطبوعہ اخبار ہفتہ وار 'کوہ نور' کو قرار دیا جاتا ہے جو 14 رجنوری 1850 کو لاہور سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط کا ہی زمانہ دراصل قومی سطح پر اردو صحافت کے وقوع پذیر ہونے کا زمانہ ہے۔ اگر چہ اس سے پہلے بھی چند اردو اخبارات ضرور منظر عام پر آئے تھے، جیسے 'جام جہاں نما' (1822)، دہلی اردو اخبار (1836)۔ ان کے بعد 1850 تک اور بھی کئی اخبارات نکلنا شروع ہوئے مگر ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ہاں 1850 کے ارد گرد ضرور خاصی تعداد میں ملک کے مختلف علاقوں و خطوں سے اردو اخبارات تیزی کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ اردو صحافت کے اس ابتدائی زمانے میں پنجاب پیش پیش رہا۔

اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1850 سے لے کر 1857 تک صرف سات برسوں میں تقریباً 16 اخبارات پنجاب کے افق پر جلوہ گر ہوئے۔ پنجاب سے نکلنے والے اس عہد کے اخبارات نے 1857 کی تحریک میں اسی طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس طرح دوسرے صوبوں کے مختلف اخبارات نے لیا تھا۔ جیسے جیسے 1857 کا زمانہ ماضی بعید کے دھندلکوں میں روپوش ہوتا گیا، پنجاب میں اردو اخبارات و رسائل کی تعداد بڑھنے لگی۔ بیسویں صدی کے اوائل اور وسط میں پنجاب اردو صحافت کے اہم مراکز میں سے ایک تھا کیونکہ یہاں سے اس زمانے میں مجموعی طور پر سیکڑوں اخبارات و رسائل شائع ہوتے تھے، مگر تقسیم وطن کے سانحے کے ساتھ پنجاب بھی تقسیم ہوگیا، اس لیے پنجاب سے نکلنے والے اخبارات بھی جغرافیائی حدود کی تقسیم کا شکار ہو کر منقسم ہوگئے۔ ہندوستان میں واقع پنجاب 'مشرقی پنجاب' کہلایا۔ گو کہ اس جغرافیائی تقسیم کے بعد اردو اخبارات و رسائل کی معتدبہ تعداد مغربی پنجاب کے ساتھ وابستہ ہوگئی، تاہم دوسری جانب مشرقی پنجاب کی گود بھی اردو صحافت سے خالی نہ رہی۔ تقسیم وطن کے بعد اردو صحافت پنجاب میں زندہ اور تابندہ رہی، اور اس صوبے سے پرانے اخبارات کے ساتھ نئے روزنامے، ہفتہ وار، اور ماہنامے شائع ہوتے رہے، لیکن بیسویں صدی کی نویں دہائی کا زمانہ مشرقی پنجاب میں اردو اخبارات کے لیے بڑا صبر آزما ثابت ہوا۔

1984 کے واقعہ سے پورا مشرقی پنجاب متاثر ہوا تو اردو اخبارات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اس دہائی میں کئی سارے رسائل و جرائد اور روزناموں کی اشاعت بند ہوگئی۔ 1947 سے 1984 تک کے دور کو مشرقی پنجاب میں اردو صحافت کا روشن دور کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں یہاں اردو اخبارات و رسائل خوب نکلتے تھے۔ اس کا اندازہ ڈاکٹر محمد اسلم کے پیش کردہ اعداد و شمار سے کیا جاسکتا ہے کہ 1947 سے 1984 تک

کے درمیانی عرصے میں اردو کے 20روزنامہ اخبارات، 78 ہفتہ واراخبارات، 31پندرہ روزہ اخبارات، 48ماہانہ رسائل شائع ہوتے تھے ،لیکن 1984 کے بعد یہ تعداد خاصی کم ہوگئی ،البتہ آج بھی اردو کے کئی اہم اخبارات ورسائل مشرقی پنجاب کے مختلف اضلاع سے شائع ہورہے ہیں۔ ان میں روزنامہ 'ہندسماچار' کو اولیت حاصل ہے جو جالندھر اور چنڈی گڑھ سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے ۔یہ اخبار نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

پنجاب کے جن اخبارات کو اپنے اپنے زمانے میں مقبولیت حاصل ہوئی ،ان میں روزنامہ ملاپ جالندھر، روزنا پرتاپ جالندھر، روزنامہ اجیت امرتسر وجالندھر، ہندسماچار جالندھر،لدھیانہ ایکسپریس لدھیانہ، نوائے ملت لدھیانہ، تازہ اخبار لدھیانہ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان میں سے بیشتر اب بند ہوچکے ہیں، لیکن جس زمانے میں وہ شائع ہوتے تھے، انھیں خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ان کے علاوہ اور بھی درجنوں اخبارات مشرقی پنجاب سے نکلے اور بند ہوئے۔اس طرح پنجاب کی سرزمین سے شائع ہونے والے کئی اخبارات نے اپنی شناخت بنائی اور خوب پذیرائی حاصل کی۔

اہم ہفتہ وار اخبارات کے طور پر ہفتہ روزہ کوٹلہ ٹائمز ہفتہ روزہ صدائے اہل پنجاب ہفتہ روزہ جذبات، ہفتہ روزہ چنگاری، پنجاب گزٹ، دوآبہ، طوفان، صدائے وقت، عوامی تحریک، نذرانہ، عوامی جمہوریت کا تذکرہ کرنا ناگزیر ہے۔مشرقی پنجاب سے نکلنے والے درجنوں ہفتہ روزہ اخبارات میں اور بھی کئی اخبارات کو عوام وخواص کے درمیان پسند کیا گیا۔اگر ماہانہ رسائل کی بات کریں تو مشرقی پنجاب سے نکلنے والے ایسے ماہانہ رسائل کی بھی بڑی تعداد ہے جن کا حلقۂ قارئین وسیع تھا۔مثلاً ماہانہ پاسبان، ماہانہ پکھراج، ماہانہ پرواز ادب، ماہانہ دارالسلام، جاں نثار، تعمیر سیرت، ساقی، پرواز وغیرہ۔مشرقی پنجاب میں ماہانہ، دو ماہی اور سہ ماہی رسائل کی تعداد پچاس سے بھی زائد رہی ہے، جن میں سے اکثر اب بند ہو چکے ہیں۔

پنجاب کے جن اخبارات کو اپنے اپنے زمانے میں مقبولیت حاصل ہوئی ،ان میں روزنامہ ملاپ جالندھر، روزنا پرتاپ جالندھر، روزنامہ اجیت امرتسر وجالندھر، ہندسماچار جالندھر، لدھیانہ ایکسپریس لدھیانہ، نوائے ملت لدھیانہ، تازہ اخبار لدھیانہ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مشرقی پنجاب کی سرزمین نے ایسے سیکڑوں اردو صحافی پیدا کیے ہیں جنھوں نے اردو صحافت کو آگے بڑھایا۔ دوسرے صوبوں کے بھی بہت سے افراد کی صحافیانہ صلاحیتوں کو پنجاب سے نکلنے والے اخبارات ورسائل نے نکھارا ہے۔اردو کے معروف ادیب وصحافی مولانا ابوالکلام آزاد نے 'وکیل' امرتسر سے وابستہ رہ کر اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کو نکھارا اور اس کے بعد ایک بہت ہی معیاری اور کامیاب ومقبول ہفتہ وار اخبار 'الہلال' جاری کیا، جو اردو صحافت کے آسمان پر پوری تابانی کے ساتھ چمکا اور اردو صحافت کو ایک معیار ووقار عطا کرنے میں کامیاب ہوا۔

مشرقی پنجاب کی اردو صحافت ہندوستان کے مختلف صوبوں کی اردو صحافت سے کچھ مماثلت بھی رکھتی ہے اور کچھ تفاوت بھی۔اس کا اندازہ مختلف اخبارات ورسائل کے نئے اور پرانے شماروں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر جس طرح مختلف صوبوں کی اردو صحافت نے 1857 میں اپنا کردار ادا کیا، اسی طرح مشرقی پنجاب کے اخبارات نے اپنا رول نبھایا۔ایسے ہی جس طرح ملک کے زیادہ تر اردو اخبارات ورسائل ہندوستان کی آزادی کے خواہاں رہے، اسی طرح پنجاب کے اردو اخبارات ورسائل بھی آزادئ ہند کے علمبردار رہے۔مشرقی پنجاب کے اردو اخبارات ورسائل نے قومی، عالمی، علاقائی خبروں اور رپورٹوں کو جگہ دی۔

اردو اخبارات وجرائد خواہ وہ کسی بھی جگہ سے نکلتے ہوں بالعموم سماجی، ادبی، تعلیمی ضمیمے نکلتے ہیں، مشرقی پنجاب کے اخبارات بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔ ان میں الگ الگ موضوعات پر گوشے اور ضمیمے شائع ہوتے رہے ہیں۔مشرقی پنجاب کے بعض اخباروں کے ضمیمے گراں قدر اور بہت معیاری ہوتے ہیں، بالخصوص ادب کے حوالے سے پنجاب کے زیادہ تر اخبارات میں ضمیمے اور نمبرات شائع ہوتے تھے۔ملاپ میں ادبی مضامین، شعروشاعری، افسانے اہمیت کے ساتھ شائع کیے جاتے تھے، ہندسماچار میں بھی شعروشاعری، افسانے، تنقیدی وادبی مضامین، طنزومزاح، تبصرے اور جائزے شامل اشاعت کیے جاتے رہے ہیں۔لدھیانہ ایکسپریس نے صفحہ نمبر 12 اور 15 ادبی مواد کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ 'ویکلی لیڈی راج، ہفتہ روزہ جذبات، ہفتہ روزہ صدائے اہل پنجاب (مالیرکوٹلہ) جیسے اخبارات ادبی مواد کی اشاعت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔مشرقی پنجاب کے اخبارات کتابت، طباعت اور تزئین کے لحاظ سے وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو اخبارات وجرائدخواہ وہ کسی بھی جگہ سے نکلتے ہوں بالعموم سماجی، ادبی، تعلیمی ضمیمے نکلتے ہیں، مشرقی پنجاب کے اخبارات بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔ ان میں الگ الگ موضوعات پر گوشے اور ضمیمے شائع ہوتے رہے ہیں۔

پنجاب کی اردو صحافت بعض اعتبار سے دوسرے مقامات کی اردو صحافت کے مقابلے میں کچھ ایسی خصوصیات کی حامل جنھیں جسے وہاں کی اردو صحافت کا امتیاز کہا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر پنجاب کے اردو اخبارات کی زبان ملک کی دوسری ریاستوں کے اردو اخبارات سے الگ نظر آتی ہے۔یہاں کے اخبارات میں ہندی اور پنجابی کے الفاظ کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں، جب کہ دوسرے صوبوں کے اردو اخبارات ورسائل اتنے زیادہ ہندی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔مثال کے طور پر 'ہندسماچار' کے یکم فروری کے شمارے میں شائع یہ خبر ملاحظہ فرمائیں:

''آتنک واد پر پاکستان کے دوہرے رویے کی وجہ سے افغانستان نے اس سے دوری بنالی ہے۔افغانستان کے راشٹرپتی اشرف غنی نے آج پاکستان کے پردھان منتری شاہد عباسی سے فون پر بات کرنے سے صاف انکار کردیا ہے۔'' (ہندسماچار، یکم فروری، 2018)

اس اقتباس میں آتنک واد، راشٹرپتی، پردھان منتری وہ ہندی الفاظ ہیں جنھیں دوسرے مقامات کے اردو اخبارات استعمال نہیں کرتے، وہ آتنک واد کی جگہ دہشت گردی، راشٹرپتی کی جگہ صدر جمہوریہ اور پردھان منتری کی جگہ وزیر اعظم لکھتے ہیں، البتہ اب زبان کی صورت حال میں کافی فرق آرہا ہے اور اس کی غالباً بنیادی وجہ یہ ہے کہ پنجاب کے اردو اخبارات ایجنسیوں کی خبریں شائع کررہے ہیں اور زیادہ تر ایجنسیاں اردو خبروں میں ہندی، پنجابی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتی ہیں۔

مشرقی پنجاب کے اردو اخبارات کا انفراد یہ بھی ہے کہ ان کے زیادہ تر ایڈیٹران اور مالکان غیرمسلم رہے

پنجاب میں اردو رسائل واخبارات کے زیادہ تر قاری غیر مسلم رہے ہیں۔کیونکہ وہاں کے اردو اخبارات میں مسلمانوں کے مسائل کم اور سکھوں وہندوؤں کے مسائل زیادہ ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مشرقی پنجاب میں اردو صحافی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم تھے اور ہیں۔

ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کسی خاص طبقے کی زبان نہ کل تھی اور نہ آج ہے۔ذیل کی تفصیل سے اندازہ کیا جاسکتا ہے:

اخبارات کا نام	ایڈیٹر/مالک
محنت، جالندھر	ستیہ نند شاکر
سندیش، لدھیانہ	برہم دیو موہالہ
بے بس، لدھیانہ	دھرم پال کپور
نوائے ملت، لدھیانہ	سریندر سود
ترجمان، لدھیانہ	امرداس بھاٹیہ
عوامی اخبار، امرتسر	رتن سنگھ
آزاد بھارت، امرتسر	نہل سنگھ
نیشنل فرنٹ، لدھیانہ	موہن لال
جمہوری سوشلزم، امرتسر	پیارے لال کوثر
نئی منزل، لدھیانہ	جوگندر لال پانڈے
ڈگر، بھٹنڈہ پنجاب	مدن لال کیف
رہبر، گورداس پور	اوم پرکاش
پندرہ روزہ اخبار آزاد جگت، لدھیانہ	اونکار ناتھ شرما
آن پنجاب، پٹھانکوٹ	کرپال سنگھ
نیل کمل، پٹھانکوٹ	برج موہن
عوامی لیڈر، امرتسر	ہربھجن مجبور
حیات، لدھیانہ	اودے چند
ماہنامہ رازِ صحت، جالندھر	بہاری لال کھتری
پیغامِ صحت، فیروزم پور	ہنسراج
پرواز، لدھیانہ	راج شرما
نگارش، مہندر باوا امرتسر	مہندر باوا
منور، امرتسر	پریم کمار ساز
جن سنسار، امرتسر	آر ایل بھنڈاری
گرداب، امرتسر	رام رچھپال پروانہ
ساری دنیا، امرتسر	امرناتھ
تعمیر سیرت، مالیر کوٹلہ	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن
انمول رتن، نگران تارن پنجاب	کلدیپ سنگھ

مذکورہ فہرست سے ظاہر ہے کہ مشرقی پنجاب میں اردو صحافت کو مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں نے اپنایا۔ اس فہرست سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مشرقی پنجاب کی اردو صحافت میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم رہی ہے۔ مشرقی پنجاب کے اردو اخبارات ورسائل سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ بلاتفریق مذہب وملت اردو پنجاب کے باشندوں کی پسندیدہ زبان رہی ہے اور پنجاب کے لوگوں نے دل کھول کر اپنے خیالات ونظریات کی اشاعت وترسیل کا ذریعہ اردو کو بنایا اور یہ تاثر دیا کہ اردو پر ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا دوسروں کا۔اخبارات ورسائل کی مذکورہ تفصیل سے اس بات کی بھی آگہی ہوتی ہے کہ پنجاب میں اردو رسائل واخبارات کے زیادہ تر قاری غیر مسلم رہے ہیں۔کیونکہ وہاں کے اردو اخبارات میں مسلمانوں کے مسائل کم اور سکھوں وہندوؤں کے مسائل زیادہ ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مشرقی پنجاب میں اردو صحافی مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم تھے اور ہیں۔

مشرقی پنجاب کے اردو اخبارات ورسائل اس اعتبار سے دوسرے صوبوں کے اردو اخبارات ورسائل سے جدا نظر آتے ہیں کہ ان میں مسلم کلچر کی جھلک کم دکھائی دیتی ہے، جب کہ دوسرے مقامات کے اخبارات خواہ وہ دہلی سے نکلنے والے ہوں یا اتر پردیش سے، یا مغربی بنگال، گجرات، مہاراشٹر، کرناٹک، وغیرہ سے، ہر جگہ اردو اخبارات مسلمانوں کی زیادہ باتیں کرتے ہیں، ان کے مسائل اٹھاتے ہیں وغیرہ۔ جب کہ مشرقی پنجاب کے اردو اخبارات ورسائل سے یہ تاثر قائم نہیں ہوتا۔ چند فیصد اخبارات ورسائل کا ضرور استثنا کیا جاسکتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر یہاں کے اخبارات پر مسلم چھاپ نہیں ہے۔ دوسرے صوبوں کے اردو اخبارات ورسائل پر مسلمانوں کی چھاپ واضح طور سے نظر آتی ہے۔دوسرے

پنجاب میں اردو کی اس صورت حال کوآزادی کے بعد بھی برقراررکھنے میں مشرقی پنجاب کی اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مشرقی پنجاب میں اردو جاننے والوں، پڑھنے سمجھنے والوں اور اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے مگر ساتھ ہی اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے پنجاب میں اردو کی گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے اور نئی نسلیں اردو کی طرف کم متوجہ ہورہی ہیں۔

صوبوں کی اردو صحافت میں زیادہ تر کیا بلکہ 90-80 فیصد مسلمان صحافی ہیں، ہندوؤں یا سکھوں کی تعداد بہت کم ہے یا نہ کے برابر ہے۔یہ صورتِ حال یوپی، دہلی، مغربی بنگال، مہاراشٹر، گجرات، حیدرآباد ہر جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔اس تناظر میں مشرقی پنجاب کی اردو صحافت کا منظرنامہ مختلف ہے، اسے مشرقی پنجاب کی اردو صحافت کا امتیاز بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس حوالے سے یہ بات فخر کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو کا حقیقی چہرہ پنجاب میں پہلے بھی دکھائی دیتا تھا اور آج بھی نظر آتا ہے۔یعنی اردو پر کسی خاص قوم یا ملت کی اجارہ داری نہیں ہے، وہ گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار وآئینہ دار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تقسیم وطن کے بعد اردو کو بھی تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی اور بہت سی جگہوں پر یہ رویہ اختیار کیا گیا۔ بہت سی جگہوں پر غیر مسلم خاندانوں نے اردو سے رشتہ منقطع کرلیا، اور بہت سی جگہوں پر اردو کو مسلمانوں نے اپنالیا، مگر مشرقی پنجاب اس طرح کے تصور سے الگ رہا اور اس نے اردو کے ساتھ اپنے رشتے کو مضبوطی کے ساتھ قائم رکھا، یہاں تقسیم وطن کے بعد بھی اردو میں اخبارات ورسائل نکالے گئے، اردو اخبارات خریدے، پڑھے گئے، اردو میں لکھا گیا اور اردو کو اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا گیا۔

پنجاب میں اردو کی اس صورت حال کو آزادی کے بعد بھی برقرار رکھنے میں مشرقی پنجاب کی اردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مشرقی پنجاب میں اردو جاننے والوں، پڑھنے سمجھنے والوں اور اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے مگر ساتھ ہی اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جیسے جیسے وقت آگے بڑھ رہا ہے پنجاب میں اردو کی گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے اور نئی نسلیں اردو کی طرف کم متوجہ ہورہی ہیں۔ جہاں اس کی دوسری بہت سی وجوہات ہیں، وہیں ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ فی زمانہ یہاں اردو صحافت کا زور خاصا کم ہوگیا ہے، اردو اخبارات ورسائل کی تعداد بھی گھٹی ہے اور ان کے قارئین کی بھی۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مشرقی پنجاب میں اردو صحافت کو پھر سے مقبول بنانے کی کوشش کی جائے، مزید اردو اخبارات ورسائل جاری کیے جائیں اور اردو قارئین کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بھی تگ ودو کی جائے۔اردو صحافت کا جو منظرنامہ ماضی میں پنجاب کی سرزمین پر نظر آتا تھا، اس کے احیا کی سعی کی جائے۔

■

Dr. Yusuf Rampuri
Mohalla Tandola Tanda
Rampur-244925 (UP)

شیخ عمران

روزنامہ 'رہبرِ دکن' سے 'رہنمائے دکن' کا 100 سالہ صحافتی سفر

آزاد ہندوستان میں حیدرآباد کی ایک مخصوص شناخت ہے۔ دکن کا یہ تاریخی شہر اپنی گنگا جمنی تہذیب اور اردو کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف ہے۔ اس شہر کو تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کے معاملے میں ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے جہاں اس شہر نے اردو کو کئی نامور شاعر، ادیب، محقق، نقاد، مفکر دیے وہیں صحافت کے معاملے میں بھی اس شہر کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ قدیم سے ہی صحافت کی جڑیں اس شہر سے پیوستہ رہی ہیں۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کی تاریخ قدیم بھی ہے اور عظیم بھی۔ حیدرآباد میں زبان و ادب کے فروغ کے لیے کہیں نہ کہیں صحافت کا بھی نمایاں کردار رہا ہے اگر ایسا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس شہر سے اردو کے کئی بڑے اخبار جاری ہوئے اور کچھ عرصہ بعد بند ہوگئے ان اخبارات میں آفتابِ دکن، مشیرِ دکن، دکن پنچ، سفیرِ دکن، نظامی، محبوب گزٹ، صحیفہ، معارف، افسر الاخبار، آصف الاخبار، ہزار داستان، آصفی، گلزارِ دکن وغیرہ شامل ہیں لیکن ان ہی میں 'رہبرِ دکن' ایک ایسا اخبار ہے جو آزادیٔ ہند سے پہلے جاری ہوا اور آج بھی جاری ہے۔ جنوبی ہند کی اردو صحافت کے لیے یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس اخبار نے اپنے 100 برس مکمل کرلیے ہیں۔ یہ حیدرآباد کا واحد اردو اخبار ہے جو اپنے 100 سال مکمل کرنے کے بعد بھی آج بڑی آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ یہاں میں اس بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس روزنامہ کو دو ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دور وہ ہے جب یہ روزنامہ 'رہبرِ دکن' کے نام سے اگست 1921 میں منظرِ عام پر آیا اور کئی برس تک جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔ اس کا دوسرا دور 'رہنمائے دکن' (موجودہ نام) سے شروع ہوتا ہے جو جولائی 1949 میں جاری ہوا اور آج بھی اسی نام سے جاری ہے۔

'رہنمائے دکن' حیدرآباد ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی اردو صحافت میں ایک بہترین اور معیاری اخبار ثابت ہوا۔ رہنمائے دکن روایتی طرز کا اخبار ہے۔ اس اخبار کی خدمات کے پیشِ نظر اسے جنوبی ہند کی اردو کا نمائندہ اخبار کہا جاسکتا ہے۔ ادبی سرپرستی میں اس اخبار نے اپنا منفرد رول ادا کیا جو ناقابلِ فراموش ہے۔ بابائے دکنی محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری وغیرہ کی نایاب تحریریں اس روزنامے کا حصہ رہیں۔

سید احمد محی الدین نے اپنی ادارت میں 1 اگست 1921 میں افضل گنج حیدرآباد سے ایک روزنامہ جاری کیا جس کا نام 'رہبرِ دکن' تھا۔ 'رہبرِ دکن' جن حالات میں جاری ہوا وہ حالات اردو اور صحافت دونوں کے لیے ناسازگار تھے، اخبار کا جاری ہونا بڑا مشکل کام تھا لیکن سید احمد محی الدین نے اپنی بے باکانہ صحافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس اخبار کو جاری کیا جو آگے چل کر شہر حیدرآباد کا ایک عظیم اخبار ثابت ہوا۔

''رہبرِ دکن کا شمار جنوبی ہند کے اس دور کے تمام اردو روزناموں میں کثیر الاشاعت روزنامے کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس اخبار کی اس دور میں تعدادِ اشاعت آٹھ دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ 'رہبرِ دکن' کے سالنامے اور خاص نمبر عوام الناس میں اور بالخصوص ادبی حلقوں میں بہ نظرِ تحسین دیکھے جاتے تھے۔ اس اخبار کے اداریوں نے سیاسی افراتفری کے زمانے میں عوام کی صحیح رہنمائی کی۔''

(حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: ایک جائزہ، محمد اعجاز الدین حامد، ص 61)

'رہبرِ دکن' نے حیدرآباد کی اردو صحافت کو جلا بخشی۔ سید احمد محی الدین نے مدیر کی حیثیت سے کئی برس کام کیا۔ انھوں نے اس روزنامے میں کئی اضافے بھی کیے جو اس کی شہرت کا باعث بنے۔

1942 میں سید احمد محی الدین کا انتقال ہوگیا اور حامد محی الدین اس اخبار کے مدیر ہوئے۔ صرف ایک سال تک وہ اس اخبار سے وابستہ رہے چونکہ ان کی تقرری حیدرآباد سول سروس میں ہوگئی۔ جس کی وجہ سے ان کو اخبار چھوڑنا پڑا اور ان کی جگہ سید محمود وحید الدین اس اخبار کے مدیر نامزد ہوئے۔

سید محمود وحید الدین نے اس اخبار کی ادارت کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی۔ خاص بات یہ ہے کہ آزادیٔ ہند کے وقت بھی سید محمود وحید الدین اس اخبار کے مدیر تھے۔ آزادی کے بعد جب ملک فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں تھا تو حیدرآباد میں بھی اس کی گونج سنائی دی۔ بلکہ بڑی شدت سے سنائی دی چونکہ اس وقت تک حیدرآباد نظام شاہی کے تحت تھا۔ 1948 میں یہاں 'پولس ایکشن' ہوا، جسے 'رہبرِ دکن' کے مدیر سید محمود وحید الدین نے 'ملٹری ایکشن' سے تعبیر کیا۔ 'رہبرِ دکن' ستمبر 1948 میں حیدرآباد کی سیاسی تبدیلی تک زندہ رہنے کے بعد بند ہوگیا۔

اب ایک نئے نام سے اخبار کے لیے کسی معتبر شخص کی تلاش شروع ہوئی تو رہبرِ دکن کے ایک سابق رکن منظور حسن پر نظر گئی جو کہ رہبرِ دکن کے انتظامی امور کے

ذمہ دار تھے اور نئے اخبار کی ادارت کے لیے بہت موزوں بھی تھے۔ لہٰذا اب پرانے اخبار کا نیا نام 'رہنمائے دکن' رکھا گیا۔ جو جولائی 1949 کو منظر عام پر آیا۔ مدیر کی حیثیت سے منظور حسن کا انتخاب عمل میں آیا۔ اخبار کے تمام انتظامی امور کی ذمے داری سید محمود نے سنبھالی۔ منظور حسن کی سبکدوشی کے بعد محمود صاحب نے اس کی ادارت کی ذمے داری سید لطیف الدین قادری (وقار الدین قادری کے بڑے بھائی) کے سپرد کی جو سن 1984 تک 'رہنمائے دکن' سے وابستہ رہے۔ سید لطیف الدین قادری ایک اعلیٰ درجے کے صحافی تھے انھوں نے 'رہنمائے دکن' کو مقبولیت عطا کرنے کی غرض سے کئی اہم کام انجام دیے۔ سید لطیف الدین قادری کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید وقار الدین نے 'رہنمائے دکن' کی ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ سید وقار الدین کی ادارت میں اس اخبار کے سنہری دور کا آغاز ہوا۔

وقار الدین صاحب کی نگرانی میں 'رہنمائے دکن' کو ہمہ گیر شہرت حاصل ہوئی ایسا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وقار الدین صاحب خود ایک اعلیٰ درجے کے صحافی ہیں گزشتہ کئی برسوں سے ادب وقوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے جس وقت اس اخبار کی ذمہ داری بطور مدیر اپنے کندھوں پر لی وہ وقت اور حالات کافی نازک تھے۔ اخبار نکالنا اور اسے جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن باوجود اس کے وقار الدین نے بہترین انداز میں اس اخبار کو جاری رکھا اور نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس اخبار کو ہندوستان کے دیگر اردو اخبارات کی فہرست میں صف اول پر پہنچا دیا۔ مئی 2015 میں سید وقار الدین کو 'ستارۂ فلسطین' جیسے باوقار اعزاز سے نوازا گیا۔ آج 'رہنمائے دکن' شہر حیدرآباد سے نکلنے والے بڑے اخبارات میں شامل ہے۔ اداریوں کی حق گوئی وبے باکی، مدیر کا نڈر وبے خوف ہونا یہ ابتدا ہی سے رہنمائے دکن کا شیوہ رہا ہے۔ بقول سید وقار الدین (مدیر روزنامہ رہنمائے دکن):

''ہم حق بات لکھنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے اور صحیح معنوں میں اردو صحافت اگر دکن میں نام کمائی ہے تو روزنامہ 'رہبر دکن' کی وجہ سے جو آزادی سے قبل بارہ تا چودہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور ہمارے نامہ نگار لندن، واشنگٹن، قاہرہ اور دلّی میں ہوتے تھے۔''

(حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات: سید ممتاز مہدی، ص 390)

غالباً یہ اردو کا پہلا اخبار ہے جس کے نامہ نگار ملک کے تمام بڑے شہروں کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی موجود تھے۔ یہ اخبار اس زمانے میں بھی تمام پڑوسی ممالک کے علاوہ افغانستان، مصر، عرب ممالک اور انگلینڈ تک جاتا تھا۔

'رہنمائے دکن' کی مقبولیت کے لیے کئی عناصر کار فرما رہے ہیں جن میں اس اخبار کے مختلف کالمس کا نمایاں رول رہا ہے جن کا مختصر تعارف درج ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پسند اپنی اپنی: رہنمائے دکن کا مستقل ہفتہ واری کالم تھا۔ جو سن 1959 میں شروع کیا گیا۔ اس کالم کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قارئین کو ایک عنوان دیا جاتا تھا اور اس عنوان کے تحت ان سے اشعار لکھوا کر اسے شائع کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کالم کو قارئین میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اردو میں رہنمائے دکن کے متعلق ذوق پیدا ہوا۔

ہماری جامعات: ہماری جامعات رہنمائے دکن کے دیگر کالمس کی طرح ایک غیر معمولی کالم تھا۔ اس کالم میں جامعہ عثمانیہ سے وابستہ بلند پایہ شخصیات کا تعارف پیش کیا جاتا تھا، ساتھ ہی جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبہ جات کی سرگرمیوں کا جائزہ بھی اس کالم کے تحت لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کافی برسوں تک جاری رہا۔ اس کالم کو اردو داں طبقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

گلہائے صد رنگ: یہ روزنامہ رہنمائے دکن کا ایک مستقل کالم تھا۔ جو ہر دوشنبہ کو پابندی سے شائع کیا جاتا تھا۔ 'گلہائے صد رنگ' کالم کے ذیل میں حیدرآباد کے نومشق شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یہ کالم سن 1961 میں شروع کیا گیا اور تقریباً دس برس جاری رہا۔ اس کالم میں شاعروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر مختصر رائے بھی پیش کی جاتی تھی۔ اس کالم کی بدولت شہر حیدرآباد میں نومشق اردو شاعروں کا اچھا خاصا گروہ تیار ہوا۔ ان شاعروں میں حمید الدین شاہد، فیض الحسن، صلاح الدین نیر (مدیر ماہنامہ خوشبو کا سفر) رئیس اختر، باقر منظور، رؤف خیر، ابوالفضل محمود، قطب سرشار، ڈاکٹر راہی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں بعد میں یہی شعرا اردو کے بلند پایہ شاعر ثابت ہوئے، اور ادب کے میدان میں اپنا نام کمایا۔

بچوں کا صفحہ: 'رہنمائے دکن' میں شائع ہونے والے اس صفحہ کو اہل نظر نے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا۔ رہنمائے دکن میں یہ صفحہ بڑا مقبول رہا۔ 'بچوں کا صفحہ' میں ادب اطفال سے متعلق مختصر کہانیاں، نظمیں، پہیلیاں وغیرہ شائع کی جاتی تھیں۔ تخلیق کار بچوں کے نام بھی اس صفحہ میں شائع ہوا کرتے تھے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ یہ اس روزنامے کی ایک نئی پہل تھی جو کافی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ اس صفحہ کے باعث بچوں کا لکھنے پڑھنے کا رجحان بڑھا۔ اس صفحہ کے ذریعے بچوں کو ادب سے جوڑنے میں یہ روزنامہ کامیاب رہا۔ یہ اس دور کا واحد روزنامہ تھا جس میں بچوں کا صفحہ پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔

کچھ عرصہ جاری رہنے کے بعد اس صفحہ کا نام بدل کر 'طلبا اور نوجوانوں کا صفحہ' کر دیا گیا۔

طلبا اور نوجوانوں کا صفحہ: اس صفحہ میں اردو کے اُبھرتے ہوئے نوجوان قلمکاروں کی تخلیقات کو پیش کیا جاتا تھا۔ دیگر زبانوں کے تراجم بھی اس صفحہ کا حصہ بنتے رہے۔ اس کے علاوہ اس صفحہ میں تنقید وتبصرہ پر بھی بات کی جاتی تھی جس کو بہت پسند کیا گیا۔ بہرکیف رہنمائے دکن کے دیگر صفحات کی طرح اس صفحہ کو بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

رہبر و رہرو: حیدرآباد دکن میں طنز ومزاح کی ایک بہترین روایت رہی ہے۔ رہنمائے دکن نے بھی اس روایت کو جاری رکھا۔ رہبر و رہرو ایک مزاحیہ کالم تھا جسے بہت شہرت ملی۔ اس کالم میں سنجیدہ اور باوقار طنز کا پہلو نمایاں رہا۔ شفیع الدین ناکارہ اس کالم کو ترتیب دیا کرتے تھے۔ ان کے بعد پروفیسر سلیمان اطہر نے اس کالم کو جاری رکھنے میں اہم رول ادا کیا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا نام اردو اور حیدرآباد دونوں کے لیے تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ ایک اعلی ادیب ونقاد تسلیم کیے جاتے ہیں کئی برسوں تک 'رہنمائے دکن' کے ادبی صفحہ 'رفتار سیاست' سے وابستہ رہے۔ جب وہ آٹھویں جماعت میں زیر تعلیم تھے ایک کہانی لکھ کر اشاعت کی غرض سے 'رہنمائے دکن' کو بھیجی جو اس اخبار میں بہت جلدی شائع ہوگئی۔ یہ اس کم سن طالب علم کی پہلی ادبی تحریر تھی جو منظر عام پر آئی۔ اس اشاعت کے بعد اردو کے اس خدمت گار کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سلیمان اطہر جاوید اردو کے بڑے ادیب بن گئے۔ کئی برسوں تک انھوں نے اس روزنامے میں ملازمت بھی کی۔ 'رفتار سیاست' رہنمائے دکن کا ایک مقبول صفحہ تھا۔ لوگ صرف 'رفتار سیاست' کی خاطر دوشنبہ کا خاص ایڈیشن خریدا کرتے تھے۔ تروپتی یونیورسٹی میں تدریسی شعبہ سے وابستہ ہوجانے کے بعد رہنمائے دکن کی ملازمت کو انھوں نے خیر اباد کہا لیکن رہنمائے دکن کے لیے کافی عرصہ تک مضامین لکھتے رہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال صاحب (مدیر ماہنامہ شگوفہ) کی رہنمائے دکن سے دلی وابستگی تھی۔ وہ اس کے 'شعروادب' کے صفحہ سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال نے 'شعر وادب' کے صفحہ کے ذریعہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ تقریباً دس برس وہ اس اخبار سے جڑے رہے۔ اخبار کے انتظامی امور میں وہ ایک ذمہ دار شخص تھے۔ وقار الدین اور منظور حسن صاحب سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ جتنا عرصہ اس روزنامہ کا حصہ رہے وہ دور رہنمائے دکن کی خدمات کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ ادبی صفحہ کی ترتیب کے علاوہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے اخبار کے لیے اداریے بھی لکھے جنھیں کافی سراہا گیا۔ دور حاضر میں حیدرآباد کے نامور ماہنامہ 'شگوفہ' کے مدیر کی حیثیت سے آپ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اخبار کے عمومی دور ہی سے اردو کی مختلف اصناف کا احاطہ رہنمائے دکن کے ادبی صفحہ میں کیا گیا۔ افسانہ، ناول وغیرہ پر توجہ دی گئی لیکن زیادہ زور شاعری پر رہا۔ اس ضمن میں مدیر رہنمائے دکن سید وقار الدین رقمطراز ہیں:

''ہم نے شاعری کے لیے زیادہ جگہ رکھی ہے چوں کہ اس کا Response بہت ہی اچھا ہے۔ چونکہ ہر اخبار کو اپنے قارئین کی خواہش کے مطابق ہی مواد دینا ہوتا ہے لہذا ہمارے اخبار میں جتنا مواد ادب کے بارے میں شائع ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ شعر و شاعری کی نذر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ عوام کی پسند ہے۔''

'رہنمائے دکن' نے اردو زبان کے فروغ، ترقی و ترویج کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مفادات کی ترجمانی بڑی بے باکی کے ساتھ کی۔ قومی، بین الاقوامی، ریاستی اور مقامی خبریں معتبر ذرائع سے حاصل کر کے عوام تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ رہنمائے دکن، صحافت کو ادب عالیہ بنا کر پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ کئی نوجوانوں کی تربیت کر کے انہیں کامیاب صحافی بنایا۔ جس کی وجہ سے آج بھی یہ روزنامہ عوام و خواص میں مقبول ہے اور حیدرآباد کی صحافت میں اس اخبار کو خاص مقام حاصل ہے۔

(حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات: سید ممتاز مہدی، ص 391)

صفحہ 'گلستان': اس روزنامہ کے تمام صفحات غیر معمولی ہوتے ہیں جیسے کھیل کود کا صفحہ، فلمی صفحہ، روزگار سے متعلق صفحہ وغیرہ، لیکن جس صفحہ کے باعث اس روزنامہ کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی وہ 'گلستان' ہے۔ یہ صفحہ در اصل خالص ادبی نوعیت کا حامل تھا۔ اردو کے مشہور ومعروف صحافی، شاعر حسن فرخ یہ صفحہ ترتیب دیتے تھے۔ 'گلستان' نے حیدرآباد کے کئی اہل قلم کی ذہنی و ادبی نشوونما میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے کئی نئے قلمکار، ادیب اور شاعر اس صفحہ میں چھپ کر پروان چڑھے۔ اس ادبی صفحہ نے نئے لکھنے والوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

'گلستان' ادبی صفحہ میں اردو کے جن نامور شعرا وادبا کے نام ہمیشہ جڑے رہے ان میں پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، مظفر مجاز، محمد حبیب بیدل شاذ تمکنت، احمد قاسمی، قدیر انصاری، حامد اکمل، عابد صدیقی، نادر اسلوبی، ڈاکٹر مجید بیدار، بشیر احمد، نادر المسدوسی، ڈاکٹر راہی، انیس احمد انیس، حسن فرخ، کامل حیدرآبادی، حیدر حسین، اقبال شیدائی، حامد رضوی، نسیم اعجاز نسیم، طاہر حسین طاہر، روبینہ نازلی، ضامن علی حسرت، رشید رہبر، شوکت علی درد وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب یہ صفحہ 'رہنمائے دکن' کی روح کہلاتا تھا۔ بروز پیر پابندی کے ساتھ یہ صفحہ شائع ہوتا تھا۔ 'گلستان' میں منتخب نامور شعرا کی غزلیں، نظمیں، رباعیات، حمد، نعت، منقبت، قطعات وغیرہ کو جگہ دی جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نثری وتنقیدی مضامین بھی اس ادبی صفحہ کا اہم حصہ تھے۔ ہندوستان اور بیرون ملک کے مختلف حصوں سے تخلیق کار اپنی تخلیقات ارسال کرتے تھے۔ 'گلستان' کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اس صفحہ میں اردو زبان وادب سے متعلق منعقد ہونے والے کانفرنس، سمینار اور ادبی مشاعروں کی روداد کو بھی بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا جاتا تھا۔ اس صفحہ میں نئے لکھنے والوں کو بطور خاص ترجیح دی جاتی تھی۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' کا دائرہ صرف ادب اور سیاست تک محدود نہیں ہے۔ اپنے اسلامی مزاج کے باعث بھی اس روزنامے کو بہت قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ 'رہنمائے دکن' میں محرم اور اعراس وغیرہ کے مواقع پر خراج عقیدت والی تخلیقات کو بھی اس روزنامہ میں جگہ دی گئی۔ میلادالنبیؐ، عیدین، شب معراج، شب برات، شب قدر کے مواقع پر خصوصی اشاعتیں عمل میں لائی گئیں۔ قومی تہوار 26 جنوری اور 15 اگست جیسے موقعوں پر آزادی ہند سے متعلق تحریریں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں 'رہنمائے دکن' نے کئی یادگار نمبر بھی شائع کیے ہیں جن میں 'غالب نمبر'، 'اقبال نمبر' جامعہ عثمانیہ کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر 'گولڈن جوبلی نمبر' آصف سابع نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں جنھیں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔

'رہنمائے دکن' نے اردو زبان کے فروغ، ترقی و ترویج کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مفادات کی ترجمانی بڑی بے باکی کے ساتھ کی۔ قومی، بین الاقوامی، ریاستی اور مقامی خبریں معتبر ذرائع سے حاصل کر کے عوام تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ یہی نہیں بلکہ رہنمائے دکن، صحافت کو ادب عالیہ بنا کر پیش کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کے علاوہ کئی نوجوانوں کی تربیت کر کے انھیں کامیاب صحافی بنایا۔ جس کی وجہ سے آج بھی یہ روزنامہ عوام وخواص میں مقبول ہے اور حیدرآباد کی صحافت میں اس اخبار کو خاص مقام حاصل ہے۔

حوالہ جات:

1. حیدرآباد دکن کے اردو اخبارات: ایک جائزہ، محمد اعجاز الدین حامد، ص 12,61
2. حیدرآباد میں اردو صحافت: طیب انصاری، ص 11,48
3. حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات، سید ممتاز مہدی، ص 43,390,391
4. اردو صحافت آزادی کے بعد: ڈاکٹر افضل مصباحی، ص 281
5. اردو میڈیا: سید فاضل حسین پرویز، ص 82

■

Dr. Shaikh Imran
Asst.Professor, Dept.of Urdu
Vasantrao Naik Govt.Inst.of Arts & Social Sciences,Nagpur 440001
Mob: 09921986904

عبدالناصر فاروقی

ابوالقاسم زہراوی

اسلام کے عہد زریں میں جن حکما اور سائنسدانوں نے مختلف علوم وفنون میں اپنے کارہائے نمایاں سے دنیا کو متحیر کیا ان میں طب و جراحت کے میدان میں اہم خدمات انجام دینے والی اندلس کی ایک عبقری شخصیت ابوالقاسم زہراوی (936-1013) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ نہ صرف ایک ماہر جراح، تجربہ کار طبیب اور علم الادویہ کے ایک متبحر عالم کے طور پر جانے جاتے ہیں بلکہ ایک لائق وفائق مدرس، معلم، دانشور، محقق اور مصنف کی حیثیت سے بھی ان کی شخصیت مسلم ہے۔ خوش قسمتی سے زہراوی کا تعلق اندلس کے اس دور سے ہے جب وہ اسلامی حکومت کے زیر سرپرستی تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مقام پر فائز تھا اور اس کا دارالخلافہ قرطبہ ایک عظیم علمی مرکز کے طور پر دنیا بھر میں مشہور تھا۔ وہاں کی سرزمین مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین فن سے آباد تھی جو اپنی تحقیق وریسرچ کے ذریعے علوم کی آبیاری میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ زہراوی اسی مردم خیز شہر قرطبہ کے نزدیک چھ میل کی دوری پر شمال مغربی جانب واقع زہرا نامی قصبہ میں 936 میں پیدا ہوا۔ (اریبین میڈیسن، حصہ اول، ص 85) اس کے آبا واجداد عرب کے انصار قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو حجاز سے ہجرت کرکے آیا اور پھر اندلس میں آباد ہوگیا تھا۔ (حمارنہ اینڈ سونیڈیکر، ص 15) یوروپی زبانوں میں زہراوی کو Abulcasis، Albucasis، Bulcasis، Bulcasim، Bulcari، Alzahrawi، Ezzahrawi، Zahravius، Alcarani، Alsarani، Alcaravi، Alcaravius اور Alsahrawi جیسے مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ (مسلم اسکالرس اینڈ سائنٹسٹ، ص 51)

زہراوی کا بچپن اپنے وطن الزہرا میں ہی گزرا۔ اس نے تعلیم کے مراحل بھی وہیں طے کیے اور پھر درس و تدریس اختیار کرکے طب وجراحت کے عملی میدان میں قدم رکھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے خلیفہ الناصر (وفات 961) کے درباری طبیب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں لیکن جارج سارٹن (1884-1956)، مائیلی اور دوسرے مورخین نے اسے خلیفہ المستنصر (زمانہ خلافت 961-967) کا طبیب خاص بتایا ہے اور بعض نے ان دونوں کا درباری طبیب بتایا ہے۔ ڈونالڈ کیمپبل (1921-1967) نے لکھا ہے کہ وہ عبدالرحمٰن سوم کے دربار سے وابستہ تھا۔ (ہمدرد میڈیکس، ص 6) اس زمانے کے دوسرے اطبا کے برعکس زہراوی نے زیادہ اسفار نہیں کیے بلکہ ایک جگہ مقیم رہ کر حادثات کے شکار لوگوں اور جنگ وجدال میں زخمی ہونے والے افراد کی تیمارداری اور ان کے علاج ومعالجہ میں اپنی زندگی صرف کی۔ زہراوی کا انتقال 1013 میں ہوا۔ (ابوکیسس آن سرجری اینڈ انسٹرومینٹ، ص 7) اس سے چند سال قبل یعنی 1010 میں مدینۃ الزہرا کا سقوط ہوگیا اور وہ عیسائیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، اس لیے زہراوی کے حالات زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ اس کا ذکر سب سے پہلے اندلس کی ایک جامع العلوم شخصیت ابومحمد ابن الحزم (994-1064) نے اپنی تحریر میں کیا ہے اور اسے ایک عظیم طبیب اور جراح بتایا ہے۔ وہ زہراوی سے اپنی واقفیت اور شناسائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "وقد أدركناه وشاهدناه" (ہم نے ان کو پایا اور ان کو دیکھا ہے)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف زہراوی کا ہم عصر تھا بلکہ اس کی شہرت سے بھی واقف تھا۔ (ہمدرد میڈیکس، ص 5)

زہراوی کی سوانح کا مختصر خاکہ ابوعبداللہ محمد بن فتوح بن عبداللہ الحمیدی (وفات 488ھ/ 1095) نے اپنی تصنیف 'جذوة المقتبس فی تاریخ علماء الاندلس' (جذوۃ المقتبس، ص 302) میں سب سے پہلے پیش کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے:

''ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی اصحاب علم و فضل، حامل دین وشریعت شخصیات میں سے ہیں۔ ان کا وہ خاص فن جس میں ان کو تقدم وتفوق حاصل ہوا 'طب' ہے۔ فن طب میں ان کی ایک ضخیم، مشہور ومعروف، حشو و زوائد سے پاک اور انتہائی نفع بخش کتاب ہے جس کا نام انھوں نے 'التصريف لمن عجز عن التاليف' رکھا۔ ابومحمد علی بن احمد نے اس کتاب کا تذکرہ کیا اور اس کی تعریف میں تحریر کیا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ فن طب اور جراحی کے سلسلے میں قول وعمل کے لحاظ سے اس سے زیادہ جامع کوئی دوسری کتاب تصنیف نہیں کی گئی ہے تو ہماری تصدیق کی جائے گی۔ چوتھی صدی ہجری کے بعد اندلس میں ان کی وفات ہوئی۔''

قرطبہ کی جس گلی کے مکان نمبر 6 میں زہراوی رہتا تھا اسے Calle Albucasis کا نام دیا گیا ہے۔ یہ مقام اب سیاحوں کا مرکز ہے اور اسے ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اسے اندلس کے سیاحتی شعبے کی نگراں کمیٹی نے اپنی تحویل میں لے کر محفوظ کرلیا ہے اور اس پر کانسے کی تختی پر لکھا گیا ہے۔ ''یہ وہ گھر ہے جہاں ابوالقاسم رہتا تھا''

(http://eu.wikipedia.org/wiki/Abul Qasimat-Zahrawi)

زہراوی کی زندگی اور اس کی گراں قدر تصنیف کے مطالعے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی علاج و معالجہ کو فروغ دینے، سرجری میں کمال حاصل کرنے اور درس و تدریس میں گزاری۔ اس کی کتاب 'التصریف' 30 مقالات پر مشتمل ایک بیش قیمت علمی کارنامہ ہے جس کا آخری حصہ یعنی 30 واں مقالہ جراحت سے متعلق ہے جس سے ایک عرصے تک یورپ کے ماہرین جراحت نے استفادہ کیا ہے۔

زہراوی ایک جانب جہاں علاج و معالجہ میں ماہر سمجھا جاتا تھا وہیں دوسری طرف اسے درس و تدریس میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کا ثبوت وہ چند ہدایات اور نصیحت آمیز کلمات ہیں جو اس نے اپنے شاگردوں کے لیے تحریر کیے ہیں جن سے اس کی شخصیت ایک بہترین معلم اور مربی کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس نے عملیات کے طریقے بیان کرتے ہوئے اپنے طلبا کو ''اے میرے بچو!'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت سے پیش آتا تھا اور ان کے ہر سوال کا جواب بہت توجہ سے دیتا تھا۔ ان کی بھلائی کی فکر اسے ہر وقت دامن گیر رہتی تھی۔ اس نے ایک اچھے طبیب اور مریض کے مابین خوشگوار تعلقات پر بہت زور دیا ہے کیونکہ مریض کی دیکھ بھال، مرض کی تشخیص اور اس کے تدارک میں یہ چیزیں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ویلکم لائبریری لندن میں ایک تصویر محفوظ ہے جس میں وہ کسی مریض کا علاج کرتا ہوا نظر آرہا ہے اور چاروں طرف شاگرد کھڑے ہوئے اس کے لیکچر کو غور سے سن رہے ہیں۔ مریض کے معاشی حالات اور ان کی غربت و مفلسی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ شافی مطلق پر مکمل بھروسہ کرنے والا ایک رحمدل، نرم خو اور خداترس طبیب تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ مریض کی شفایابی کے لیے معالج صرف کوشش کرسکتا ہے، شفا دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ اس نے مریض کے مکمل امتحان اور سریری مشاہدات بھی نقل کیے ہیں تاکہ طلبا کو تشخیص مرض میں رہنمائی حاصل ہوسکے۔ اس نے جراحت کی عملی مشق کے لیے تشریح البدن اور منافع الاعضا کی بنیادی ابتدائی معلومات کو ضروری قرار دیا ہے۔ طبی اخلاقیات پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ اپنے شاگردوں کو متنبہ کرتا ہے کہ جاہل اور غیر مستند طبیبوں کے علاج سے پرہیز کیا جائے کیونکہ ایسے لوگ نام و نمود اور پیسوں کے لیے علاج کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے فن میں ماہر نہیں ہوتے اس لیے ان سے علاج کرانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم زہراوی کے چند حکیمانہ اقوال تحریر کررہے ہیں جو اس نے طلبا اور شاگردوں کی رہنمائی کے لیے اپنی تصنیف کے حصۂ جراحت میں جابجا تحریر کیے ہیں۔ عملی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہر طبیب کے لیے ان کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے:

(1) میں نے کتاب میں ہر جگہ ان اعمال سے منع کردیا ہے جن سے تم کو ڈرنا، بچنا اور احتیاط کرنا چاہیے تاکہ کسی جاہل کو طعنہ زنی کا موقع نہ ملے۔ (مقدمہ جراحیات زہراوی)

(2) آپریشن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جس میں کوئی خطرہ نہ ہو اور دوسرا وہ جس میں اکثر حالات میں موت واقع ہوجاتی ہے۔ (ایضا)

(3) مریضوں کے لیے نرمی، مہربانی اور بہتر طریقہ استعمال کرو جو سلامتی اور بہتر انجام کی طرف لے جائے۔ (ایضا)

(4) زیادہ خطرناک امراض سے بچو جن سے تمھارے دلوں میں دین و دنیا کے تئیں شبہ داخل ہوجائے اس لیے کہ یہی راستہ دنیا میں تمھارے مرتبہ اور آخرت میں تمھاری تقدیروں کو بلند و باقی رکھنے والا ہے۔ (ایضا)

(5) جالینوس نے وصیت کی ہے کہ برے امراض کا علاج نہ کرو کیونکہ اس سے تم برے طبیب مشہور ہوجاؤگے۔ (ایضا)

(6) جب سرطان محض خلط سوداوی سے ہو تو اس میں لوہے کے آلات (یعنی جراحی آلات) نہیں استعمال کرنا چاہیے سوائے اس وقت جب کہ وہ کسی ایسے عضو میں ہوجائے جس کا استیصال کلی (Tatoal cradication) قابل داشت ہو۔ (ایضا)

(7) علم جراحت حاصل کرنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس علم کو حاصل کرنے سے قبل بہت محنت سے جالینوس کے تعلیم کردہ علم تشریح کا غائر مطالعہ کرے یہاں تک کہ اعضا کی ہیئت، افعال، ان کے جوڑ، ہڈیوں کی پہچان، اعصاب و عضلات کی پہچان، شمار، مخارج اور افعال سے مکمل واقفیت حاصل ہوجائے۔ (ایضا)

(8) بقراط کا قول ہے کہ فن جراحت میں نام کے اطبا بہت ہوتے ہیں مگر کام کے کم ہوتے ہیں۔ (ایضا)

(9) جو شخص تشریح نہ جانتا ہو تو لازمی طور پر وہ انھی غلطیوں میں مبتلا ہوجائے گا جن میں میں نے بہت سے لوگوں کو گرفتار پایا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس علم کا ماہر خیال کرتے تھے اور علم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے مدعی تھے۔ (ایضا)

(10) میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ جس چیز میں شبہ ہو اس عمل سے بچو کیونکہ تم کو طرح طرح کے مریضوں سے سابقہ پڑے گا، جن میں بعض پر مرض غلبہ پالیتا ہے اور تکلیف بڑھ جاتی ہے حتیٰ کہ آسانی سے موت ہوجاتی ہے اور ان میں بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ صحت کی امید میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مرض مہلک ہوتا ہے اس لیے تم کو ان سے بچنا ضروری ہے۔ (جراحیات زہراوی، ص 39)

(11) تمھیں خوف، رغبت اور حرص سے بالاتر ہونا چاہیے۔ (ایضا)

(12) کسی مرض کے علاج کی طرف اس وقت تک پیش قدمی نہ کرو جب تک کہ تم کو یقینی طور پر تشخیص نہ ہوجائے کہ نتیجہ اچھا نکلے گا۔ (ایضا)

(13) اپنے مریضوں کا علاج کرتے وقت ان کے مرض اور انذار مرض (Prognosis) پہلے دریافت کرلو اور سلامتی کا راستہ ڈھونڈو کیونکہ اس فن سے تمھاری بڑائی، تعریف اور نیک نامی ہوگی۔ (ایضا)

(14) میں تم کو اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں کہ تم مہارت حاصل کرو۔ (ایضا)

(15) نازک اور خطرناک چیزوں سے احتیاط کرنا اور بچنا لازم ہے کیونکہ اس طرح کے بہت سے موقعوں پر دھوکا ہوجاتا ہے اور خطرہ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور اکثر موت واقع ہوجاتی ہے۔ (ایضا)

(16) علاج سے نفع و نقصان کی کیفیت کا بیان بہت طویل ہے اور یہ علم دقیق، مشکل اور ایک پوشیدہ راز ہے۔ (ایضا ص 3)

(17) جو لوگ تجربہ کار نہیں ہیں اور عمل کرنا نہیں جانتے ان کے لیے اس فن کو ترک کردینا بہتر ہے۔ (ایضا ص 8)

(18) میں نے قدما کی کتابوں کے وسیع مطالعے سے فائدہ اٹھاکر ہڈی جوڑنے کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس سے فائدہ بھی حاصل کیا ہے اور خصوصیت سے اس سلسلے میں تمام عمر تجربہ کرتا رہا۔ (ایضا ص 189)

(19) اگر خلع کے ساتھ زخم یا کسر یا دونوں چیزیں شامل ہوں تو ان کو ٹھیک کرنے کی کوشش سوائے اس شخص کے جو ماہر فن ہو، طویل تجربہ رکھتا ہو اور غصہ والا نہ ہو، کسی اور کو نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس سے اکثر

موت واقع ہوجاتی ہے۔ (ایضاً ص 231)

(20) امراض بسیطہ (Simple diseases) پر دھیان رکھو، پوری کوشش سے کام کرو لیکن خطرناک کام سے بچتے رہو کیونکہ یہ تمھارے جاہ و مرتبہ کو باقی رکھنے والی اور تمھاری عزت کو زیادہ محفوظ رکھنے والی چیز ہوگی۔ (ایضاً ص 232)

(21) اس کام (سرجری) کو وہی شخص انجام دے جو ماہر فن ہو، طویل تجربہ رکھتا ہو، متین ہو اور غصہ والا نہ ہو۔ (ایضاً ص 233)

(22) یہ کام طبیب حاذق کا ہے کہ وہ اپنے تجربہ کے مطابق آلات خود ایجاد کرے کیونکہ بعض ایسے امراض ہیں جن کے آلات کا ذکر متقدمین نے نہیں کیا ہے۔ (ایضاً ص 70)

(23) اگر تم کو طویل تجربہ ہو اور آلات کے بنانے میں مہارت اور پہچان ہے تو تم خود ہر مرض کے لیے آلات تجویز کرلوگے۔ (ایضاً ص 154)

(24) اگر عورت کا آپریشن کرنا ضروری ہو تو ایک ادھیڑ عمر والی طبیبہ کو اپنے ساتھ لو، اگر نہ ملے تو ایک پاکدامن طبیب مع ایک ہوشیار قابلہ کے اپنے ساتھ لو اور اس کو یہ ہدایت کردو کہ وہ تمھارے بتانے کے مطابق تفتیش کرے۔ (ایضاً ص 113)

(25) قابلہ کو چاہیے کہ پہلے وہ ولادت طبعی کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کرے۔ (ایضاً ص 124)

(26) قابلہ کو سمجھدار اور نیک طینت ہونا چاہیے۔ اسے اپنے فن پر عبور ہوتا کہ کسی غلطی یا لغزش کا امکان نہ ہو۔ (ایضاً ص 125)

(27) قابلہ کو ہوشیار ہونا چاہیے تاکہ وہ اسقاط جنین پر بہ آسانی قابو پاسکے۔ (ایضاً ص 127)

(28) جنین کا رحم کے اندر بن کر ساقط ہوجانا اللہ کی حکمت ہے۔ ان سب حالات میں قابلہ کو ہوشیار ہونا چاہیے اور اس قسم کی صورتوں پر بہ آسانی قابو پالینا چاہیے نیز قابلہ کو پاک وصاف ہونا چاہیے اور ہر کام نہایت نرمی اور آسانی سے کرنا چاہیے اور ہر ممکن طریقے سے حفاظت وسلامتی کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

(29) آلات کی بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ کسی آلہ کو معمولی نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ کسی نہ کسی وقت اس کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ (ایضاً ص 134)

(30) تیر نکالنے کی ہر ممکن تدبیر کرو اور اس میں نرمی اور ثابت قدمی رکھو۔ (ایضاً ص 172)

(31) فصد اور اس کے عوارضات کی کیفیت بیان کی گئی

ہے، تم کو ان چیزوں کی اصلاح اور کیفیت کے لیے پہلے سے تیاری کرلینا چاہیے۔ (ایضاً ص 178)

(32) شقاف لگاتے وقت خاص طور سے احتیاط رکھنا چاہیے کہ مریض کمزور یا عورت یا حاملہ یا بچہ یا بوڑھا تو نہیں ہے کیونکہ مواد نکلنے سے روح حیوانی تحلیل ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی مریض اس طرح مرجاتا ہے کہ علم بھی نہیں ہوتا اس لیے تم کو اس میں بہت زیادہ پرہیز کرنا چاہیے۔ (ایضاً ص 81)

(33) اگر مرض کی ابتدا ہو تو اس کو اچھی طرح تفتیش کرلینا چاہیے۔ (ایضاً ص 39)

(34) ہمارے علم میں یہ بات عمل و تجربہ سے ثابت ہوچکی ہے اور ہم صنعت کے طریقے بھی جان گئے ہیں اور چیزوں کے حقائق کو بھی سمجھ گئے ہیں۔ (ایضاً ص 4)

(35) اس باب (آپریشن، فصد وجراحت) میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو زیادہ نازک اور خطرناک ہیں اس لیے ان سے احتیاط کرنا اور بچنا لازم ہے۔ (ایضاً ص 30)

(36) جب تم استسقاء زقی کا ادویہ سے علاج کرچکو اور ان سے فائدہ نہ ہو تو اگر مریض ضعیف ہو یا اس کو استسقاء کے علاوہ کوئی اور مرض جیسے اسہال وسعال وغیرہ لاحق ہو تو ہرگز آپریشن نہ کرو کیونکہ ایسا کرنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ (ایضاً ص 100)

(37) نیالے رنگ کے مسے کو نہیں کاٹنا چاہیے (بالخصوص اس وقت) جب اس میں حس بھی کم ہو اور دیکھنے میں بھی بھدا معلوم ہو کیونکہ یہ ورم سرطانی ہوتا ہے۔ (ایضاً ص 98)

(38) قینچی سے ختنہ کرنا اور ڈورے سے ٹانکے لگانا ایک ایسا تجربہ ہے جو مجھے بہترین معلوم ہوا کیونکہ کھال کے دو حلقے ہونے کی وجہ سے آپریشن کے لیے قینچی ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔ (ایضاً ص 105)

(39) ہم نے اکثر جراحوں کو غلط داڑھیں اکھاڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اناڑی دانت اکھاڑنے والوں کی طرح کبھی دانت نہ اکھاڑو، کیونکہ وہ ہمارے بیان کیے ہوئے طریقوں سے کام نہیں لیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے مریض خاص طور پر جبکہ داڑھ ٹوٹ بھی جائے اور اس کی جڑیں ساری کی ساری یا کچھ باقی رہ جائیں، بہت سخت تکلیفوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ (ایضاً ص 67)

(40) ہلنے والی داڑھوں کو چاندی اور سونے کے تاروں سے باندھنے کا کام ایک تجربہ کار و ماہر فن انجام دے کیونکہ یہ بہت باریک و گہرا کام ہے۔ (ایضاً ص 72)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زہراوی نے ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق طبیب کی طرح مشاہدہ کو علم کی بنیاد اور تجربہ کو اس کا ایک لازمی حصہ قرار دیا۔ بغیر مہارت حاصل کیے ہوئے مریضوں کا علاج کرنے کا وہ سخت مخالف تھا۔ اس نے قدم قدم پر اپنے شاگردوں کی رہنمائی کے لیے اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں جن اصولوں کا ذکر کیا ہے ان میں عطائی حکیم اور غیر تجربہ کار جراحوں کے علاج سے بچنے، قدما کی کتابوں کا وسیع مطالعہ کرنے، علم تشریح ومنافع الاعضا میں مکمل طور پر عبور حاصل کرنے، خطرناک امراض کے علاج سے پرہیز کرنے، مرض کے انجام سے باخبر ہونے نیز علاج کرنے سے قبل مرض کی اچھی تشخیص وتفتیش کرلینے جیسی مفید اور کارآمد ہدایات وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں۔ اس کے یہ مشورے موجودہ دور میں بھی انتہائی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

■

Abdun Nasir
Associate Prof Dept of Surgery
Ayurvedic and Unani Tibbia College
Qarol Bagh
New Delhi - 110005

شفیق احمد

وبائی امراض اور انسانی رویہ کورونا وائرس کے تناظر میں

جب سماج میں وبائی بیماریوں کے تعلق سے غیر سائنسی سوچ پیدا ہوتی ہے اور افواہیں اور غلط معلومات لمبے عرصے تک گردش کرتی ہیں تو عوام کے اندر بے یقینی، خوف اور غصے جیسے منفی رجحانات جنم لیتے ہیں جو کہ کسی بھی صحت مند معاشرے کے لیے باعث تشویش ہیں اور پریشانی کا سبب بھی۔ گزشتہ سالوں میں ایسے چند واقعات پیش آئے ہیں جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سال 2014 میں لائبیریا کی راجدھانی منروویہ میں ایک بھیڑ نے ایبولا کلینک پر حملہ کردیا۔ اسی طرح کی افواہوں اور غلط خبروں کی وجہ سے بھارت، نائجیریا اور پاکستان میں پولیو کی ٹیموں پر حملے ہوئے جس میں کئی لوگوں کی موت بھی واقع ہوگئی۔ حال ہی میں دھاراوی اور اندور میں کورونا کی میڈیکل ٹیم پر حملے کی خبریں موصول ہوئیں۔ سائنسی و تحقیقی شواہد اور ترسیل و ابلاغ کی حکمت عملی کے استعمال سے عوام کے بیچ میں رائج منفی رجحانات اور ان کے رویے میں مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

موجودہ بین الاقوامی بحران یعنی کورونا وائرس کی وبا پر قابو پانے کے لیے کمیونی کیشن برائے سماجی و رویہ جاتی تبدیلی (Social and Behaviour Change Communication-SBCC) کے اصولوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے جو کہ انسانی عادات و اطوار میں بامقصد تبدیلی لانے کی ایک موثر حکمت عملی ہے۔ یہ حکمت عملی کسی بھی فرد، گروپ یا کمیونٹی کی سوچ، رسم و رواج اور رویے میں تبدیلی پیدا کرتی ہے تاکہ لوگ طبی مسائل، غربت اور قدرتی آفات وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لیے تعمیری رویہ اپنا سکیں۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایس بی سی سی کے اصولوں کے مطابق سماج میں کسی بھی سرکاری اور غیر سرکاری ترقیاتی پروگرام تحقیق اور سائنسی شواہدات پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ کسی گروہی یا ذاتی فکری مفروضات پر۔ کورونا وائرس کی خطرناک بیماری کے دور میں انسانی رویے میں وسیع پیمانے پر تبدیلی لازمی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارے، یونیسف کے مطابق ''ایس بی سی سی تحقیق پر مبنی ایک مشاورتی عمل ہے جو معلومات اور طرز عمل پر بحث کرتی ہے، گروپ اور افراد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ شراکتی عمل میں شریک ہوں اور اپنی ضروریات اور حقوق کا تعین کریں۔ یہ باہمی تعاون کے عمل، نجی اور عوامی مذاکرات پر زور دیتی ہے تاکہ انسانی رویے میں بڑے پیمانے پر تبدیلی آئے، جس میں سماجی طور طریقے اور ساختیاتی نابرابری شامل ہے۔'' چنانچہ اس پس منظر میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ کون سی مخصوص عادتیں اور طرز عمل ہیں جن سے کوئی فرد کورونا وائرس سے متاثر ہوتا ہے یا محفوظ رہتا ہے۔ چونکہ کورونا کی بیماری سے پہلے بھی انسانیت سارس اور مارس جیسے امراض سے نبرد آزما ہوچکی ہے لہٰذا پیش نظر مضمون ایس بی سی سی کے تناظر میں گزشتہ تجربات کے حوالے سے کورونا وائرس کے خطرات کو کم کرنے کے امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔

کورونا وائرس کی بیماری: عالمی ادارہ صحت کے مطابق کورونا وائرس کی مختلف قسمیں ہیں جو امراض تنفس اور کبھی کبھی امراض شکم کی علامات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ امراض تنفس میں معمولی نزلے سے لے کر نمونیہ تک شامل ہے لیکن بعض اوقات کورونا وائرس خطرناک بیماریوں کا باعث بن سکتا ہے کیوں کہ کبھی کبھی اس کی علامات کی تشخیص آسان نہیں ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی شکل تاج یعنی کراؤن سے ملتی ہے اس لیے اسے کورونا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اس بیماری کے حوالے سے مسلسل تحقیقات جاری ہیں اس لیے اس کی علامات اور تشخیص کے بارے میں محققین اور

سائنس دانوں کی آرا مسلسل بدل رہی ہیں۔

سارس اور کورونا وائرس کی بیماریاں: جیسا کہ اوپر بھی ذکر کیا گیا کہ کورونا وائرس سے پہلے سارس اور ایبولا جیسی بیماریوں کے قہر سے انسانیت دوچار ہو چکی ہے۔ سارس (Severe Acute Respiratory Syndrome) وبا کی ابتدا نومبر 2002 میں چین سے ہوئی جس نے 26 ملکوں میں 8098 افراد کو متاثر کیا اور ساتھ ہی اس بیماری سے 774 افراد جاں بحق ہوئے۔ اس کی شرح اموات تقریباً 10 فیصد رہی۔ اس بیماری کے قہر کو دور کرنے میں خاص طور پر ٹاپ ڈاؤن اپروچ اور سیاسی کمٹمنٹ کا حتمی رول ہے جس میں انسانی سوچ اور برتاؤ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ سارس اور کرونا وائرس میں فرق کے ساتھ ساتھ یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے جینیاتی خدوخال 86 فیصد سارس سے مشابہت رکھتے ہیں اور حیاتیاتی ساخت بھی کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ یہ بھی قیاس لگایا جارہا ہے کہ یہ دونوں انسانوں میں چمگادڑ سے ہی پھیلنے والے وائرس ہوسکتے ہیں نیز دونوں وائرس خصوصی طور پر ڈراپ لیٹ سے پھیلتے ہیں۔

سارس کو پھیلنے سے روکنے کے لیے جسمانی دوری، آئی سولیشن اور کمیونٹی قرنطین کی حکمت عملی اپنائی گئی۔ تقریباً آٹھ مہینے کے بعد اس وبائی مرض کو ختم کیا جاسکا تھا۔ سارس سے نمٹنے کے دوران اسپتالوں میں انفیکشن کو روکنے اور طبی عملے کو محفوظ رکھنے کی ہر ممکن تدبیر کو اپنایا گیا جس میں پی پی ای کٹ کی فراہمی، صفائی کا اہتمام، اسپتال میں غیر ضروری بھیڑ کو کم کرنا اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والے طبی عملے کو غیر سارس زدہ علاقوں میں جانے سے ممانعت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ کورونا وائرس اور سارس میں یکسانیت کے باوجود یہ ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ جیسے کہ کورونا کے پھیلنے کی رفتار تیز مگر شرح اموات بہت کم ہے اور علامات و تشخیص میں بھی فرق ہے۔ لیکن دونوں سے بچنے کے بنیادی اصولوں میں مشابہت پائی جاتی ہے جس میں انسانی کردار و عمل اور عادات واطوار کو اہمیت حاصل ہے۔

کورونا وائرس کا پھیلنا: کورونا وائرس ایک انسان سے دوسرے انسان میں ڈراپ لیٹ کے ذریعے خاص طور پر ان لوگوں میں پھیلتا ہے جو ایک دوسرے سے جسمانی طور پر بہت قریب (6 فٹ سے کم دوری) ہوتے ہیں۔ جب کورونا سے متاثرہ فرد کھانستا، چھینکتا یا بات کرتا ہے تو اس کے ناک اور منہ سے نکلنے والے باریک قطرات آس پاس کے افراد کے منہ یا ناک کے راستے داخل ہوکر پھیپھڑے تک پہنچ جاتے ہیں اور وہیں سے بیماری جنم لیتی ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص بظاہر کورونا سے متاثر نظر نہ آتا ہو مگر اس سے دوسرے افراد متاثر ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کی اس سطح کو چھوتا ہے جہاں پہلے سے وائرس موجود ہے اور پھر اپنے منہ، ناک اور آنکھ کو انہی آلودہ ہاتھوں سے چھوتا ہے تو وہ وائرس سے متاثر ہوسکتا ہے۔

کورونا وائرس اور انسانی رویہ: تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ کورونا وائرس کے پھیلنے اور انسانی عادتوں میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ بلکہ اس قسم کی بیماریوں میں انسانوں کی لائف اسٹائل کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ طرز زندگی میں تبدیلی اس وائرس کو روکنے میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ جسمانی دوری اور گھر پر رہنے کی عادتوں نے کورونا وائرس کو پھیلنے سے روکنے میں عالمی حکمت عملی کے طور پر حد درجہ مقبولیت حاصل کی ہے جب کہ حقیقت یہ بھی ہے کہ عوام کو معاشی، نفسیاتی، جذباتی اور جسمانی شکل میں اس کی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔

چہرہ یا ٹی زون کو چھونا: چہرہ حیاتیاتی اعتبار سے حساس اور نازک بطور سماجی اعتبار سے انسانی وجود، شناخت اور شخصیت کا محور بھی ہے۔ چہرے کو بار بار چھونے کا عمل انسانی نفسیات اور سماجی وتہذیبی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وائرس کے پھیلنے اور چہرے کو بار بار چھونے کی عادت کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ جیسا کہ سائنسی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ منہ، ناک اور آنکھ (ٹی زون) وائرس کے پھیلنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور انہی راستوں سے وائرس پھیپھڑے میں داخل ہوکر انسان کو بیمار کردیتے ہیں۔ چونکہ ہاتھ انسانی جسم کا وہ حصہ ہے جو سب سے زیادہ چیزوں اور افراد سے ربط میں رہتا ہے اسی لیے ہاتھوں میں سب زیادہ وائرس کے ہونے کا امکان رہتا ہے۔ بار بار چہرے پر ہاتھ پھیرنا اور چھونا خود سے باخبر اور بے خبر ہونے کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ کئی بار جب انسان کسی خیال یا گہری سوچ میں محو ہوتا ہے تو اپنے ہاتھ کو چہرے کے الگ الگ حصوں پر رکھتا ہے، باہمی گفت وشنید کے دوران اپنی موجودگی اور احساسات کو درج کرانے کے لیے کئی بار چہرے پر ہاتھ لگا دیتا ہے، کسی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے وقت انگلیوں کو دونوں ہونٹوں پر رکھ لیتا ہے اور محفل میں غیر متوقع ہنسی کو چھپانے کے لیے بھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی شرماتے وقت بھی اکثر لوگ چہرے کو ہاتھوں سے چھپاتے ہیں، اپنے آپ کو خوبصورت اور پرکشش بنانے کے لیے مختلف اقسام کی کاسمیٹک کا استعمال کرتے وقت بار بار چہرے کو چھونا پڑتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی بالوں میں بلا ساختہ انگلیاں پہنچ جاتی ہیں۔ چہرے پر دانے یا مہانسے نکلے ہوں تو اس کو بار بار چھونے سے اپنے آپ کو روک پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی بستیاں جہاں مچھر اور مکھیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں وہ اگر چہرے پر کاٹتے ہیں تو انھیں بھگانے کے لیے چہرے پر ہاتھ چلا جاتا ہے اور کھجلی کا احساس بھی ہاتھوں کو چہرے پر خود بخود کھینچ لیتا ہے۔ غرض انسان کی اس طرح کی عادتوں کو فروغ دینے میں بہت سارے جذباتی، نفسیاتی، سماجی و ثقافتی اور طبعی عوامل کارفرما ہوتے ہیں لہٰذا سائنسی اور تحقیقی شواہد کی بنیاد پر کورونا وائرس کے تناظر میں اس انسانی رویے کو جانچنا، پرکھنا اور سمجھنا نہایت ہی اہم ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر بہتر عادات، طرز عمل اور طرز فکر کو فروغ دینے کے لیے مداخلتی پروگرام کا خاکہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

چہرے کو نہ چھونے والے ایسے مداخلتی پروگرام کا مطالعہ بہت کم ملتا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ایسا کرنے سے چہرہ چھونے کی عادتوں میں کوئی بدلاؤ آیا ہے۔ مشاہداتی مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگ ایک گھنٹے میں اوسطاً 23 مرتبہ چہرہ چھوتے ہیں۔ جب لوگوں سے کہا گیا کہ وہ جب بھی اپنے چہرے کو چھوتے ہیں تو اسے نوٹ کرلیا کریں تو چھونے کے رجحان میں کمی کے بجائے اضافہ نظر آیا۔ اس لیے یہاں پیچیدگی مزید بڑھ جاتی ہے کہ غیر شعوری طور پر لوگوں میں چہرہ نہ چھونے کی عادت کو کیسے فروغ دیا جائے!

کھانسنا اور چھینکنا: کھانستے، چھینکتے اور ناک صاف کرتے وقت استعمال ہونے والے کاغذ یا کپڑے کے رومال کو اس طرح سے رکھا یا پھینکا جائے جس سے کسی کو انفیکشن ہونے کی ہرگز گنجائش نہ ہو۔ کھانستے یا چھینکتے وقت آستین یا رومال سے منہ کو ڈھانکنا وائرس کے پھیلنے کے امکان کو کم کرتا ہے کیونکہ یہ ناک اور منہ سے نکلنے والے قطرات کو دور تک پھیلنے سے روکتا ہے۔

ماسک کا استعمال: ماسک کے استعمال سے بھی وائرس کو پھیلنے سے روکنے میں مدد ملتی ہے یعنی ماسک لگانے والا فرد اگر مریض ہے تو وہ ماسک پہن کر چھینکتا، کھانستا یا بات کرتا ہے تو دوسرے لوگوں کے متاثر ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص جو مریض نہیں ہے اگر وہ ماسک لگائے تو وہ اس صورت میں وائرس سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ حالانکہ عالمی ادارہ صحت ماسک 95 کے استعمال کی وکالت کرتا ہے جس کا استعمال عام لوگوں

کی دسترس سے باہر ہے جب کہ ادارے کی اس اپیل کے سائنسی شواہدات پیش کرنے پر سوالیہ نشان ہے۔ پھر بھی ماسک لگانے کی عادت اور لگانے کا صحیح طریقہ دونوں ہی خاطر خواہ اہمیت رکھتے ہیں۔

جسمانی دوری: جسمانی دوری کو سماجی دوری کا نام دیا گیا ہے جو کہ مناسب لفظ نہیں ہے۔ جسمانی دوری ہی موزوں لفظ ہے جو اس بات کی سفارش کرتا ہے کہ کم سے کم دو میٹر کی جسمانی دوری بنا کر رکھا جائے تا کہ ایک شخص کے بولتے، کھانستے یا چھینکتے وقت منہ اور ناک سے نکلنے والے لعاب کے قطرات سے ارد گرد کے لوگ محفوظ رہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کسی بھی طرح کی بھیڑ اور اجتماع کا حصہ نہ بنے۔

رضاکارانہ جانچ: اگر کسی کو بخار، کھانسی، نزلہ یا کورونا کی علامات نظر آتی ہیں تو اس کو رضاکارانہ طور پر اپنی طبّی جانچ کروانا چاہیے تا کہ وائرس کا شروع میں ہی پتہ کر کے علاج ہو جائے اور دوسروں کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔ جانچ میں تاخیر کا مفہوم ہے کہ خود کو اور اپنے گھر والوں کو شدید پریشانی میں ڈالنا اور بیماری کو بڑھاوا دینا ہے۔

قرنطین: اگر کسی فرد کو کورونا وائرس کا مشتبہ مریض ہونے کی وجہ سے اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اس کا احترام لازم ہے۔ بصورت دیگر بیماری کے پھیلنے کا اندیشہ بڑھ جائے گا۔ ساتھ ہی سرکاری طبّی عملے کی بھی ذمّے داری ہوتی ہے کہ وہ ایسے افراد کا برابر طبّی معائنہ کرتے رہیں اور ضرورت پڑنے پر مزید سہولیات فراہم کریں۔

ہاتھ دھونا یا سینی ٹائزر کا استعمال: کسی بھی چیز کو چھونے سے وائرس کے پھیلنے کا امکان مزید بڑھ جاتا ہے ایسی صورت میں کسی بھی سامان کو چھونے کے بعد ہاتھ کو صابن سے دھونا یا سینیٹائزر کا استعمال کرنا اور سامان کو جرثوموں سے پاک کرنا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ وہ وائرس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہاتھ انسانی ضرورتوں کی تکمیل میں سب سے زیادہ حرکت و عمل میں ہوتا ہے۔ ہاتھ کی صفائی کے تعلق سے کئی طرح کی داخلی تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں مگر کورونا کے پس منظر میں تحقیقات ضروری ہیں۔

کمیونی کیشن برائے سماجی و رویہ جاتی تبدیلی اور تحفظاتی رویے کا فروغ: یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کمیونی کیشن برائے سماجی و رویہ جاتی تبدیلی نے افراد اور کمیونٹی کے درمیان معلومات، فکر اور طرز عمل کو متاثر کرنے اور بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس میں شدید غربت، صنفی نابرابری، صحت عامہ کی ہنگامی صورت حال، خطرناک قسم کی بیماریاں، ماحولیات اور سماجی ڈھانچہ شامل ہے (USAID, 2017)۔ 2018 میں منعقدہ بین الاقوامی ایس بی سی اجلاس کے مطابق "ایس بی سی عوام کو شریک عمل رکھتی ہے، روایت کو بدلنے، عادت کو تبدیل کرنے میں لوگوں کی مدد کرتی ہے اور دنیا کو درپیش ترقیاتی چیلنجز کا حل تلاش کرنے کے لیے آواز بلند کرتی ہے جس میں جمہوریت اور بہتر حکمرانی شامل ہیں۔"

بہت سارے صحت کے پروگراموں نے ایس بی سی کا استعمال عوام کی صحت کو بہتر کرنے اور خوش حال زندگی فراہم کرنے کے لیے کیا ہے۔ ان پروگراموں میں خاندانی منصوبہ بندی، تولیدی صحت، زچہ، بچہ کی صحت، مہلک بیماریاں جیسے کہ ایچ آئی وی/ایڈز، ٹی بی، پولیو، ملیریا اور منشیات کے استعمال کی روک تھام قابل ذکر ہیں۔ عام طور پر ایس بی سی کا استعمال صحت عامہ کے پس منظر میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے جو کہ افراد اور کسی گروپ کے ذریعے صحت مند طریقے اپنانے اور اس کو برقرار رکھنے پر بحث کرتا ہے۔ پولیو اور ٹیکہ کاری کی مہم نے ایس بی سی کا استعمال قومی اور بین الاقوامی سطح پر پالیسی اور رائے سازی کو متاثر کرنے کے لیے بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ بھارت نے اس کا استعمال ایک بڑی حکمت عملی کے طور پر تولیدی صحت اور ایچ آئی وی/ایڈز کنٹرول پروگرام میں کیا۔ چونکہ ایس بی سی نفسیاتی، حیاتیاتی، سماجی، ماحولیاتی اور رویہ جاتی علوم کے زیر سایہ ان عوامل کو مختلف نظریات کی بنیاد پر سمجھنے کی کوشش کرتی ہے جو انسانی رویے اور عادات و اطوار کو الگ الگ انداز میں متاثر کرتے ہیں۔

ایس بی سی کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ کوئی انسانی برتاؤ کسی خلا میں واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایک خاص پس منظر ہوتا ہے۔ ان کی جڑیں نسل در نسل اپنائے جانے والے سماجی رسم و رواج کے اندر گہرائی سے پیوست ہوتی ہیں۔ تاہم اپنے برتاؤ میں مخصوص تبدیلیاں کر کے لوگ نہ صرف اپنی صحت بلکہ آنے والی نسلوں کی بہتر صحت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایس بی سی پیغام رسانی کی ایک موثر اور سائنسی حکمت عملی کے طور پر طبّی اور ترقیاتی میدان میں استعمال کی جاتی ہے۔ ایس بی سی اشتہار بازی سے بالکل مختلف ہے بلکہ یہ پیغام رسانی کے لیے مختلف چینلوں کا استعمال کرتی ہے تا کہ سماج کی مختلف سطحوں تک رسائی ممکن ہو جیسے کہ فرد، گروپ، کمیونٹی، پالیسی ساز اور سماجی ادارے وغیرہ۔ یہ صحیح وقت پر صحیح معلومات کو ضرورت مند افراد تک پہنچاتی ہے اور پیغام رسانی کے ایسے ذرائع کا استعمال کرتی ہے جس پر لوگ بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ منصوبہ بند، سائنسی اور اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہوئے کام کرتی ہے۔ کسی بھی مداخلتی پروگرام کا خاکہ تیار کرنے سے پہلے مسئلے کو گہرائی سے سمجھتی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرتی ہے اور انسانی رویے سے تعلق رکھنے والے نظریات کا استعمال کرتے ہوئے پروگرام کا خاکہ تیار کرتی ہے پولیو پروگرام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے قابل اعتماد اداروں کے ذریعے لوگوں تک معلومات پہنچائی گئی۔

کامیاب کمیونی کیشن پروگرام ایک ایسی معیاری تحقیق سے وابستہ ہوتا ہے جس میں اسٹیک ہولڈرس کی ضرورتوں کا پوری طرح تجزیہ کیا جاتا ہے، مسائل کی پہچان، اس میں شامل پیچیدگیوں کو سمجھا جاتا ہے اور تبدیلی میں رکاوٹ پیدا کرنیوالے عوامل جیسے کہ معلومات، مہارت، عوامی طرز فکر اور اعتقاد کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کے مقصد کے تعین میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مقصد بالکل خاص ہو، قابل پیائش ہو جس کو ایک متعینہ مدت میں حقیقی طور پر حاصل کیا جا سکے۔ پیغامات کی تیاری میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ پیغام اسٹیک ہولڈرس کی ضرورتوں کے مطابق ہو اور رسم و رواج سے ہم آہنگ بھی ہو، مقامی و تہذیبی حساسیت کا لحاظ بھی ہو، آسان فہم اور مقامی زبان میں ہو۔

خلاصہ: لہٰذا کورونا وائرس کی بیماری سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ مذکورہ پہلوؤں اور کمیونی کیشن کی باریکیوں کو دھیان میں رکھا جائے تا کہ جلد از جلد اس مہلک بیماری سے انسانیت نجات پا سکے۔ کورونا اور سارس جیسے وبائی امراض کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ایس بی سی کے اصولوں کا استعمال انسانی رویے، اعتقاد اور طرز فکر میں تبدیلی لانے کے لیے کیا جائے تو کورونا وائرس سے پیدا ہونے والے خطرات کو کم کیا جا سکتا ہے اور مستقبل میں بھی اس طرح کے طبّی بحران کو قابو کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

■

Shafeeque Ahmad
Department of Social Work
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob: 917052998181
shafeeque.azmi@gmail.com

لئیق احمد صدیقی

ابتدائی طبی امداد

ہمارے ملک ہندوستان میں ہر سال ہزاروں لوگ زندگی کی جنگ لمحہ آخر میں ہار جاتے ہیں، صرف اس لیے کہ بروقت مریض کو طبی مدد نہیں مل پاتی۔ ظاہر ہے ڈاکٹر ہر سڑک یا گلی کوچہ میں موجود نہیں ہوتے۔ ان کی جگہ تو ہاسپٹل ہوتی ہے۔ مگر ہر سڑک یا گلی کوچہ میں انسان تو ہوتے ہیں جو اگر طبی مدد مریض کو دے سکیں تو کم وقت میں زاید نفع ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں اکثریت اس فن سے واقف نہیں اس لیے کہ فرسٹ ایڈ کی تربیت کا نظم ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ عوام تو درکنار خواص کو بھی فرسٹ ایڈ کی تربیت نہیں ہے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہنگامی حالات میں ڈاکٹر سے رجوع ہوں گے مگر ڈاکٹر تک مریض کو پہنچانے کی ذمہ داری تو عوام کی ہوتی ہے۔ اگر عوام فرسٹ ایڈ کے فن سے واقف ہوں تو مریض کو بہتر نگہداشت کے ساتھ ہاسپٹل پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہر عام وخاص کے لیے ضروری ہے کہ فرسٹ ایڈ کی تربیت حاصل کریں۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہیں صرف 2 تا 8 کلاسس میں یہ فن سیکھا جا سکتا ہے۔ ہم اوروں کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات کے لیے اور اپنے اہل خانہ کے لیے اس تربیت کو حاصل کریں۔ بعض احباب تو فرسٹ ایڈ کو صرف مرہم پٹی سمجھتے ہیں۔ آج ہم آپ سے فرسٹ ایڈ کیا ہے اس تعلق سے اہم معلومات فراہم کریں گے۔

دنیا کے کئی ممالک میں ہر شہری کو کچھ اہم تربیت دی جاتی ہے جن میں شامل ہے فوجی تربیت، فرسٹ ایڈ کی تربیت وغیرہ۔ مگر ہمارے ملک میں ابھی اس کی مکمل تربیت کا نظام ہر شہری کے لیے نافذ نہیں ہے۔ جس کے نتیجہ میں لاکھوں لوگوں کی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اگر مقام حادثہ پر فرسٹ ایڈ تربیت یافتہ کوئی مل جاتا تو شاید زندگی بچ جاتی۔

ہمارے ملک میں 2 اہم ادارے فرسٹ ایڈ ٹریننگ کا اہتمام کرتے ہیں۔ جس میں شامل ہے St. John Ambulance Association اور Red Cross Society ویسے تو یہ دونوں ہی بین الاقوامی ادارہ جات ہیں جن کی شاخیں ہمارے ملک کے ہر صوبے میں ہیں۔ ان اداروں سے فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد ہر طالب علم کو سند دی جاتی ہے۔ یہ سند ملازمت کے لیے بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ حکومت کے بعض محکمات میں اس سند کے بغیر ملازمت یا پرموشن نہیں ملتا۔ محکمہ پولیس، الکٹرسٹی، RTC کے تمام ملازمین کو اس تربیت سے گزرنا ہوتا ہے۔

یہ ٹریننگ مرد و خواتین ہر دو کے لیے ضروری ہے۔ ٹریننگ کے لیے عمر کی قید نہیں۔ کسی سند کی ضرورت نہیں۔ کوئی بھی سمجھدار اس تربیت کو حاصل کر سکتا اور ضرورت کے وقت کسی مریض کے کام آسکتا ہے۔ اسکول، کالج کے اساتذہ اس ٹریننگ کو ضرور حاصل کریں۔ اسپورٹ ٹیچرس، سیکوریٹی گارڈ وغیرہ کے لیے یہ تربیت بہت کارآمد ہوتی ہے۔ جو نوجوان ملازمت کے خواہش مند ہوں اندرون یا بیرون ملک، اس تربیت کو حاصل کر کے سند ضرور حاصل کیجیے بہت کام آئے گی۔ انشاءاللہ۔

فرسٹ ایڈ ٹریننگ حاصل کرنے کے 2 طریقے ہیں، پہلا ٹریننگ کے لیے آپ کو سینٹ جان ایمبولینس ایسوی ایشن (St. John Ambulance Association) یا (ریڈ کراس سوسائٹی) Red Cross Society کے کسی ٹریننگ سنٹر پر جانا ہوگا۔ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا کہ 20 تا 30 خواہش مند احباب کسی جگہ جمع ہو جائیے اور St. John Ambulance Association (سینٹ جان ایمبولینس ایسوی ایشن) کے دفتر کو مطلع کیجیے۔ وقت اور دن طے کیجیے تب وہاں سے ڈاکٹروں کی ٹیم آپ کے شہر، گاؤں، آفس، ادارہ، اسکول، کالج وغیرہ پر آکر ٹریننگ دے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جتنے تعلیمی ادارے، سنٹرس، کالج، دینی مدارس وغیرہ ہیں ان میں ہر سال ایک مرتبہ یہ ٹریننگ ضرور کروائی جائے۔ ہر آدمی ڈاکٹر تو نہیں بن سکتا مگر ایمرجنسی میں کسی کے کام تو آسکتا ہے۔ ہندوستان کے کسی بھی کونے میں یہ ٹریننگ دی جا سکتی ہے بشرطیکہ طلبہ کی مطلوبہ تعداد ہو۔ فون پر بھی اس ٹریننگ کی معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کورس اور سند کے لیے فیس بھی ادا کرنا ہوتی ہے۔

جہاں تک فرسٹ ایڈ کی مشمولات کا تعلق ہے اس میں کئی بیماریاں ہیں جو اچانک آجاتی ہیں۔ ان کے تعلق سے تربیت دی جاتی ہے۔ جن میں سے چند کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔ چوٹ لگنا، فراکچر، بے ہوش ہونا، مرگی، لولگنا، ناک سے خون بہنا، شوگر کا کم ہونا، B.P. کا اچانک بڑھنا، گلے میں کچھ اٹکنا، ہارٹ اٹیک، سانپ کا کاٹنا، زہر پینا، پانی میں ڈوبنا، آگ یا پانی سے جلنا، کتے کا کاٹنا، برین اسٹروک، وغیرہ۔

اوپر ذکر کی گئی اکثر بیماریوں میں مریض کے اردگرد احباب کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ جتنی جلدی یہ احباب حرکت میں آئیں مریض کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں چند ایسی غلط باتیں سرایت کر گئی ہیں کہ مریض کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ مثلاً جلنے کے بعد چکنی چیز لگانا، مرگی کے بعد لوہا ہاتھ میں دینا، ڈوبنے کے بعد پیٹ کا پانی نکالنا، سانپ کاٹنے کے بعد زخم کو کاٹنا، ناک سے خون بہنے کے وقت اینٹ سنگھانا، وغیرہ ان اقدامات سے مریض کو کچھ نفع

نہیں ہوتا اگر یہ سب غلط ہے تو درست کیا ہے۔ اس کی معلومات فرسٹ ایڈ کورس میں پڑھائی جاتی ہے۔ بعض احباب مریض کو صرف اس وجہ سے روڈ پر چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ اس کو یہ ڈر رہتا ہے کہ پولیس اس کو پکڑے گی۔ اس جگہ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کے پاس فرسٹ ایڈ کی سند ہو تو آپ کو قانونی مدد ملے گی اور آپ کو کوئی دشواری نہیں ہوگی مریض کی مدد کرنے پر۔ اس لیے کہ آپ ٹرینڈ ایمرجنسی ٹکنیشین ہیں جو حادثہ کے وقت مریض کی مدد کرتے ہیں۔

یاد رکھیے کہ فرسٹ ایڈ ایک تکنیک ہے۔ جو بغیر دوا کے عمل میں لائی جاتی ہے مقام حادثہ پر۔ اس لیے صرف کتاب میں پڑھ کر کوئی فرسٹ ایڈر نہیں بن سکتا بلکہ ڈاکٹر و دیگر اساتذہ کی نگرانی میں اس کی مختصر ٹریننگ لینا ضروری ہے۔ کتاب پڑھنے سے معلومات تو ہو سکتی مگر عملاً کسی مریض کو سہارا دینا مشکل ہے۔ فرسٹ ایڈ ٹریننگ میں اساتذہ آپ کو ابتدا سے سکھائیں گے۔ جسم کی ANATOMY, PHYSIOLOGY, کے ساتھ Pulse پلس چیک کرنا، سانس چیک کرنا، مرض کی شناخت کرنا، ضرورت ہو تو CPR کرنا، Recovery Position میں ہاسپٹل بھیجنا وغیرہ۔ یہ امور سمجھنے کے لیے کلاس میں حاضری ضروری ہے۔ یہاں صرف بیماریوں میں احتیاطی تدابیر کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شدید خون کا بہاؤ

انسان کے جسم میں 5½ لیٹر خون ہوتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک تہائی 1/3 خون بہہ جائے تو مریض شاک میں چلا جاتا ہے۔ Blood Donation میں جو خون دیا جاتا ہے اس سے کوئی نقصان نہیں اس لیے کہ بہت کم مقدار میں خون نکالا جاتا ہے۔ خون کی کچھ مقدار جسم میں Reserve رہتی ہے۔ اگر کسی کو خون بہہ رہا ہو تو پہلا کام مریض کو لٹا دیجیے۔ اور جس حصہ سے خون بہہ رہا ہو اس کو اوپر کیجیے۔ جہاں سے خون بہہ رہا ہو اس پر کپڑا گٹھری کر کے رکھ دیجیے۔ (ٹشو پیپر، روئی بھی زخم پر رکھ سکتے ہیں) کپڑے سے زخم پر پریشر ڈالیے دس منٹ تک، عموماً خون دس منٹ میں رک جاتا ہے۔ اگر روئی کپڑا خون سے بھیگ جائے تو اس کو زخم سے ہرگز نہ ہٹائیے۔ بلکہ اس پر دوسرا کپڑا رکھ دیجیے۔ اور زخم پر پریشر بنائے رکھیے۔ ممکن ہو تو پٹی باندھ کر پلاسٹک زخم کی پٹی پر لپیٹ دیجیے اور برف سے سینکیے، دواخانہ پہنچنے تک۔ بعض مرتبہ زخم سے خون بہتا ہے مگر جسم کے اندر ہی رہتا ہے۔ جسم کے باہر نہیں نکلتا۔ ایسا مریض بے ہوش ہو سکتا ہے۔ مریض کو لٹا کر اس پر گرم کپڑا ڈال دیجیے اور دونوں پیر اوپر کر لیجیے۔

جلد از جلد دواخانہ پہنچایئے۔

ناک سے خون بہنا:

ناک سے خون اکثر دو وجوہ سے بہتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے اور ناک میں خون کی رگ زخمی ہونے سے۔ جب اندازہ ہو کہ ناک پر مار لگی ہو یا گرمی کے موسم میں ناک سے خون بہہ رہا ہو تو ناک کو دو انگلیوں سے 10 منٹ تک دبایئے اور گردن جھکا دیجیے۔ اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر مریض کو لٹانا نہیں۔ ناک سے خون بہہ رہا ہو مگر گرمی کا موسم نہیں چوٹ لگنے کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ عمر زیادہ ہو۔ B.P کا مریض ہو۔ مریض کو کچھ ذہنی ٹینشن ہو تو ایسے مریض کی ناک خون بہتے وقت ہرگز نہ دبایئے۔ ہائی B.P کے مریض میں خون ناک سے نہیں دماغ سے بہتا ہے۔ اگر ناک دبائیں گے تو خون واپس بھیجے میں جمع ہوگا۔ اور مریض کو مزید نقصان ہو سکتا ہے۔ ایسے مریض کو صرف سر جھکا کر بیٹھنا ہوگا۔ خون نکلنے دیجیے اور جلد دواخانہ پہنچایئے۔

اچانک بے ہوش ہونا:

یہ ایک ایمرجنسی کنڈیشن ہے جسے شاک کہتے ہیں۔ جو جسم کے اعضاء رئیسہ کو خون نہیں پہنچنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جیسے بھیجہ۔ اس حالت میں مریض اچانک بے ہوش ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی جیسے جسم سے خون کا بہت بہہ جانا۔ آگ سے جلنا۔ الرجی۔ کرنٹ لگنا۔ پیچش۔ ڈی ہائیڈریشن، قے، انفکشن وغیرہ۔ جو مریض شاک میں ہو اس کو پسینہ زیادہ آتا ہے۔ جسم ٹھنڈا رہتا ہے۔ سانس تیز چلتی ہے۔ ذہنی الجھن، اور مریض بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ایسے مریض کو فوراً جانچ کے لیے ہاسپٹل لے جانا ضروری ہے۔ مریض کے ارد گرد والوں کو فوراً حرکت میں آنا ضروری ہے۔ آپ کو اس طرح اچانک بے ہوش ہو جانے والے مریض کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ پہلے مریض کو چت لٹا دیجیے۔ مریض کے پیر اوپر کیجیے اور اپنے کندھوں پر یا کرسی پر رکھ دیجیے کچھ دیر۔ مریض بے ہوش ہوا ہے دماغ کو خون نہ پہنچنے سے اگر دونوں پیر اوپر ہوں گے تو پیر کا خون دماغ کو جائے گا اس طرح مریض ہوش میں آسکتا ہے۔ ساتھ ہی مریض کو گرم لحاف اڑا دیجیے۔ تاکہ جسم گرم ہو جائے۔ یاد رکھیے ایسے مریض اکثر پیاس کی شکایت کرتے ہیں۔ بھول کر بھی پانی مت پلایئے۔ مریض کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہوتی۔ ہو سکتا کہ بے ہوشی کی وجہ سے پانی پیٹ کے بجائے سانس کی نالی میں چلا جائے۔ مریض کو ہاسپٹل پہنچایئے۔

جلنا:

انسان کا جسم کئی وجوہ سے جل سکتا ہے۔ جس میں شامل ہے آگ، گرم پانی، بھاپ، الکٹرک شاک، سورج کی شعائیں، کیمیکل، وغیرہ۔ جتنی تیز گرمی جسم کو لگے گی اتنا ہی زیادہ جلد اندر تک جل سکتی۔ جلی ہوئی جلد پر کبھی بھی چکنی چیز مت لگایئے۔ اس لیے کہ چکنی چیز اندر کی گرمی باہر نہیں آنے دیتی اور اندر کے اعضا خراب ہو سکتے ہیں۔ انڈے، ٹوتھ پیسٹ مت لگایئے۔ اس سے انفکشن ہو سکتا ہے۔ چاہے جلد کسی بھی وجہ سے جلی ہو اس کا آسان علاج پانی ہے۔ جلے ہوئے حصہ کو 20 منٹ پانی میں رکھیے۔ تاکہ اندر کی گرمی باہر آئے۔ اس کے بعد زخم کو ڈھانک کر ہاسپٹل پہنچایئے۔

دم گھٹنا:

یہ ایک میڈیکل ایمرجنسی ہے جسے چوکنگ کہتے ہیں۔ جس میں سانس کی نالی کسی چیز سے بند ہو جاتی ہے۔ جیسے کھاتے وقت کوئی چیز سانس کی نالی میں چلی جائے۔ کھاتے وقت باتیں کرنا، ہنسنا، غصہ کرنا، جلدی جلدی کھانے سے، شراب پینے کے بعد کھانے سے کوئی چیز سانس کی نالی میں جا سکتی۔ مریض کو جب گلے میں رکاوٹ محسوس ہو تو، بات نہیں کر سکتا، تو پہلے مریض کو کھانسے کی کوشش کرنے کو کہیے تاکہ پھنسی ہوئی چیز نکل

جائے۔اس کے بعد مریض کی پیٹھ پر 5 مرتبہ زور سے ماریئے۔اگر اس سے بھی آرام نہ آئے تو مریض کو 5 Abdominal thrust دینا ہوگا۔اس طریقہ کو کلاس میں سکھایا جاسکتا ہے اور آخری حربہ ہے CPR مگر سیکھنے کی بہت مشق کرنا ہوگی۔چھوٹے بچے کے گلے میں کچھ اٹک جائے تو پیٹھ پر مارنے سے چیز نکل جائے گی۔

دل کا دورہ:

ہارٹ اٹیک ،دل کے اندر خون کی نالی میں رکاوٹ سے دوران خون رک جانے سے ہوتا ہے۔جس سے دل کے مسلز کام کرنا بند کر دیتے ہیں۔خون کی نالیوں میں رکاوٹ چربی سے آسکتی ہے، چربی اور خون کے کلاٹ جم جاتے ہیں دل کی شریانوں میں ۔جس کی وجہ سے خون بہہ نہیں سکتا۔بعض اوقات کسی غم یا خوشی کی خبر سن کر اچانک دل کے اندر خون کی نالی میں سکڑن آسکتی ہے۔ جس کی وجہ سے خون رک کر دل کا دورہ پڑ سکتا ہے۔دل کا دورہ ایسے لوگوں میں زیادہ پایا جاتا ہے، جن کا سونے جاگنے کا نظام درست نہ ہو۔ذہنی کام زیادہ کرنے والے ہوں۔چکنا زیادہ کھاتے ہوں۔ ورزش نہ کرتے ہوں۔ B.P شوگر کے مریضوں، سگریٹ پینے والے ہوں اور جن کے خاندان میں پہلے کسی کو دل کا دورہ پڑ چکا ہو۔ان تمام قسم کے لوگوں کو ہارٹ اٹیک کبھی بھی آسکتا۔

ہارٹ اٹیک کی نشانیاں یہ ہیں کہ مریض کے سینے میں گھٹن محسوس ہو۔ سینے میں درد ہو۔ بے چینی ہو۔درد جسم کے دوسرے حصہ تک پہنچتا ہو۔مسوڑوں میں درد ہارٹ اٹیک کی اہم نشانی ہے۔مریض اگر ہوش میں ہو تو مریض کو بٹھا دیجیے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ مریض کے دونوں پیر موڑ کر گھٹنوں کے نیچے کچھ رکھ دیجیے۔تا کہ دل پر زور کم پڑے اور دواخانہ روانہ کیجیے۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو Recovery Position میں ہاسپٹل روانہ کیجیے۔اگر مریض کی حالت تشویش ناک ہو تو فوراً CPR کیجیے۔ CPRایک آسان طریقہ علاج ہے جس کا سیکھنا ہر شہری کے لیے ضروری ہے۔St John Ambulance Association کی جانب سے CPR کی بہترین تربیت دی جاتی ہے۔اگر سیکھنے والے زیادہ ہوں تو یہ احباب آپ کے پاس آکر سکھاتے ہیں اور سند بھی عطا کی جاتی ہے۔

سانپ کاٹنا:

دنیا بھر میں 2600 قسم کے اور ہندوستان میں 250 قسم کے سانپ ہیں۔ان میں سے صرف 30 تا40 قسم کے سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ان چالیس میں سے بھی چند سانپ کا زہر جان لیوا ہوتا ہے۔ اکثر لوگ زہر سے نہیں بلکہ ہیبت سے مر جاتے ہیں۔ہندوستان میں 4 قسم کے سانپ زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔جب سانپ ڈستا ہے تو زہر خون میں شامل ہو جاتا ہے۔اور دماغ، گردے ،دل تک پہنچ جاتا ہے۔زخم سے خون نکلتا ہے۔مسوڑوں سے خون نکلتا ہے۔آنکھیں بند ہونے لگتی ہے۔مریض 2 تا5 گھنٹوں میں مرسکتا ہے۔اگر ایک گھنٹے میں مریض کو دواخانہ پہنچایا جائے تو جان بچ سکتی ہے۔

آپ کو کیا کرنا ہوگا۔سب سے پہلے مریض کو دلاسا دیجیے۔یہ بتایئے کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا ۔آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ جہاں سانپ نے کاٹا ہے اس جگہ کو مت ہلایئے، ٹائٹ مت باندھیے۔جس جگہ زخم ہے اس کے اوپر کپڑے سے پٹی باندھیے۔

کچھ کام جو ہرگز نہیں کرنا ہے۔کسی چیز سے ٹائٹ نہیں باندھنا۔زخم کو نہیں کاٹنا۔زخم کو کاٹنے سے جو زہر اب تک جلد یا گوشت میں تھا وہ خون میں مل جائے گا۔اگر زخم کو کاٹا نہیں گیا تب زہر کو دل تک پہنچنے میں 2 گھنٹے لگ سکتے ہیں مگر جب زہر خون میں مل جائے تو زہر کو دل یا دماغ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔اس طرح زہر کے زخم کو کاٹنے سے انسان جلد مرسکتا ہے دواخانہ پہنچنے سے پہلے۔

مرگی:

دماغ میں اچانک رفتار بڑھنے سے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔اکثر یہ دورہ صرف 5 منٹ ہی کا ہوتا ہے۔جب بھی کسی کو مرگی کا دورہ شروع ہو وہاں موجود احباب کی ذمہ داری ہے کہ مریض کے نزدیک تمام چیزوں کو دور کردیں تا کہ مریض زخمی نہ ہو۔مریض کے ہلتے ہوئے ہاتھ مت پکڑیے۔لوہا، کنجی وغیرہ کچھ بھی ہاتھ میں مت دیجیے۔اس سے کوئی فائدہ نہیں۔کوئی بد بو مریض کو نفع نہیں دے سکتی۔آپ کو 5 منٹ خاموشی سے دیکھنا ہے۔ اس کے بعد مریض کو کروٹ لیٹا دیجیے۔تا کہ مریض کے منہ سے نکلنے والی رطوبت وغیرہ آسانی سے نکل جائے، حلق میں نہ جائے۔30منٹ کے بعد مریض کو بٹھا سکتے ہیں۔ یہ مرض بچپن سے جوانی تک رہتا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ایسے مریض کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ گھر کا پتہ اور فون نمبر ضرور رکھیں تا کہ ایمرجنسی حالت میں گھر والوں کو مطلع کیا جاسکے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مریضوں کا مسلسل علاج کسی ایک ڈاکٹر کے پاس چلے۔بار بار ڈاکٹر کو مت بدلیے۔

شدید گرمی میں لو لگنا:

لو لگنا: تیز گرمی میں اکثر یہ مرض اچانک آسکتا ہے۔ پہلے مریض کو قے، متلی ہو سکتی ہے، کمزوری محسوس ہو سکتی، بہت زیادہ مقدار میں پسینہ بہہ جاتا ہے۔ وغیرہ۔مریض کے جسم کا پانی کم ہو جاتا ہے۔ایسے مریض کو جلد راحت نہ دی جائے تو مریض کی کیفیت میں اچانک تبدیلی آسکتی ہے اور بخار 103 یا اس سے زائد ہوسکتا ہے۔مریض کو شدید دردسر ہوتا ہے۔اور مریض بے ہوش ہوسکتا ہے۔

ایسے مریضوں کو جب ہوش آئے تو پانی خوب پلایئے۔ O R S پلایئے۔ جسم کو ٹھنڈے کپڑے سے پونچھنا ہوگا۔تا کہ بخار کم ہو۔کپڑے اتاریے۔مریض کو جلد از جلد ٹھنڈی ہوا پنکھے کے قریب پہنچایئے۔تا کہ جسم کی گرمی نکل جائے۔جوس پانی پلایئے تا کہ جو پانی جسم سے نکل گیا وہ واپس جسم میں آجائے۔

لقوا:

یہ بیماری اکثر دماغ میں خون کے منجمد ہونے سے اچانک شروع ہوتی ہے۔دماغ سے خون رسنے سے بھی ہوسکتی ہے۔ہائی B.P،شوگر، ہارٹ کے مریضوں میں یہ بیماری کا خدشہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ چکنی غذا استعمال کرنے والے افراد اور وہ احباب جن کو ذہنی ٹینشن رہتا ہو اس مرض میں کبھی بھی ملوث ہوسکتے ہیں۔

اگر اچانک کسی کو بات کرنے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ہاتھ خود سے نہ اٹھایا جاسکے،کوئی چیز پکڑی نہ جاسکے۔ منہ تیڑا ہو رہا ہو۔تو سمجھ لینا چاہیے کہ دماغ میں کچھ خرابی ہو رہی ہے۔ ایسے افراد کو پہلے لیٹا دینا چاہیے۔سر کے نیچے تکیہ دیجیے۔کپڑے ڈھیلے کیجیے۔منہ میں کچھ ہو تو صاف کیجیے۔غور کیجیے کہ مریض کو سانس لینے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے۔کوشش کیجیے کے مریض کو سیدھی کروٹ لیٹا کر جلد از جلد دواخانہ پہنچا دیجیے۔

اس جگہ ہر مرض کا طریقہ علاج بتلانا بہت مشکل ہے۔یہ ایک مستقل کورس ہے ۔خواہش مند حضرات کو وقت نکالنا ہوگا سیکھنے کے لیے۔یہ معلومات اپنے ذاتی نفع کے لیے حاصل کرنا ضروری ہے۔بعض مرتبہ مرض تھوڑا ہوتا ہے مگر معلومات کے نہ ہونے سے انسان گھبرا جاتا ہے۔ دواخانے میں ایسے پریشان افراد کو اور پریشان کر کے زیادہ بل بنائے جاتے ہیں۔اس لیے آپ سے التماس ہے کہ فرسٹ ایڈ کورس کی ٹریننگ ضرور حاصل کیجیے۔یہ کورس اکثر چھٹیوں کے دن صبح سے شام تک منعقد کیا جاتا ہے۔ اپنے گھر والوں، شاگردوں، زیر نگیں حضرات کو ترغیب دیجیے کہ قوم وملت کی فلاح و بہبود کے لیے اس قسم کے فن کو سیکھیں۔کیا پتہ ہم کب کسی کے کام آسکیں۔

■

Dr. Laeeq Ahmed Siddiqi
First Aid & Home Nursing Trainer
Osmanbagh, Bahadurpura
Hyderabad - (Telangana)
9948993158
drlayeeqahmed@gmail.com

صدیقی صائم الدین

سراج کی شاعری میں اسلامی تلمیحات

سید شاہ سراج حسینی اورنگ آبادی کی تاریخ پیدائش 11 مارچ 1712 (13 صفر 1124ھ) ہے۔ بعض کے نزدیک ان کا سنہ پیدائش 1715 بھی ہے۔ ان کی شاعری کا کل زمانہ بے حد مختصر ہے۔ 1734 تا 1740 کے عرصے کے درمیان ہی ان کی شاعری کا کچھ موجود ہے۔ سراج کی عمر ابھی محض 12 برس کی تھی کہ آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ آپ پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ جذب و سرور کی ایسی کیفیت ہوتی جس میں آپ کا ہوش جاتا رہتا۔ آپ لباس و جسم کی قید کو محسوس کرنے سے عاجز ہو کر صحرا نوردی کیا کرتے۔ اسی کیفیت میں آپ کو اکثر شعر کہتے سنا گیا افسوس کہ ایک مجذوب نوجوان کی باتوں کو کون سنتا۔ یہی وجہ رہی کہ آپ کے اس دور کے اکثر اشعار ضائع ہو گئے ہیں بالخصوص فارسی کلام۔ آپ اکثر کسی بزرگ کے مزار پر ملتے۔ خاص کر شاہ برہان الدین غریب نواز (خلدآباد) کے مزار پر اسی جذب و سرور کی کیفیت میں بیٹھے دکھائی دیتے۔

آپ سن بلوغت کو پہنچتے پہنچتے جذب کا شکار ہو گئے لیکن ایسے شواہد موجود ہیں کہ آپ اس کیفیت میں بھی اشعار کہا کرتے تھے اور وہ مکمل اور سرشاری سے مزین کلام ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کی طبیعت واپس لوٹی تو آپ کے ضمیر نے آپ کو بے چین کرنا شروع کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے الفاظ اب شعور کی سطح کو چھوتے ہوئے ایک خاص شکل میں لبوں کی تراوٹ سے گزرنے لگے جس کے نتیجے میں وہ اشعار طشت از بام ہوئے جنھوں نے شاہ سراج کو ایک نام اور اردو کو ایک ایسا شاعر دیا جو ادب کو پروان چڑھانے میں اس کا رہبر ثابت ہوا۔

سراج کی فطرت نے انھیں شاعری اور سپہ گری کی جانب متوجہ کیا حالانکہ دونوں باتیں متضاد کیفیات پیدا کرتی ہیں لیکن سراج کے اندر دونوں بدرجۂ اتم رہیں۔ چنانچہ آپ نے قلب و ذہن کی تسکین کی خاطر ان دونوں ہی کی جانب توجہ مبذول کی۔ آپ پیشے سے سپاہی تھے، چنانچہ 1746 کو آصف جاہ کی سرپرستی میں بالکنڈہ کی جنگ میں شامل ہوئے اور ایک فاتح کی حیثیت سے اورنگ آباد لوٹے۔ یہی وہ جنگ ہے جس کا ذکر سراج نے مثنوی 'بوستان خیال' میں کیا ہے۔

سراج کو ہم جمالیات کا شاعر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ کی جمالیات اردو شعرا میں بہت اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا معشوق چاہے وہ پیکر رکھتا ہو یا کہ مرکبات سے پاک ہو دونوں ہی ایک مسلم حقیقت ہیں۔

سراج کی شاعری میں جا بجا ایسے اشارے بکھرے پڑے ہیں جن کا مطالعہ ہمیں ان کے مذہبی افکار کی جانب کھینچتا ہے۔ وہ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے سارے عالم میں مشہور ہیں لیکن ان کے کلام کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ کیا صرف سراج اسی فکر کے شاعر تھے؟

سراج کے زمانے میں مذہب کی بنیادیں بے حد مضبوط تھیں۔ سراج خود بھی صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت سے فیضان حاصل کرتے رہے۔ اس صوفی منش شاعر کا بیشتر وقت اللہ والوں کے مزاروں یا زندہ صوفیوں کی خانقاہوں کی نذر ہوتا۔ آپ کو حضرت شاہ عبدالرحمٰن چشتی سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہتے اور انتہائی عجز و نیاز سے آپ کی خدمت کیا کرتے۔ یہ وہی صوفی بزرگ ہیں جن کے کہنے پر سراج نے شاعری ترک کر دی تھی۔

سراج کی شاعری کی بنیاد دو چیزوں پر قائم ہے پہلا حسن دوسرا عشق۔ شاعر کی فکر انھیں دو افکار کے زیر سایہ خیالات کی رو کا استعمال کر کے ذہن کو بالیدہ کرتی ہے۔ سراج عشق مجازی کی پیکر تراشی کرتے ہوئے اس کے سانچے میں اپنی یادوں، اپنے تجربات، اپنی جد و جہد اور اس کے حاصل کو رقم کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ صاف الفاظ میں کہا جائے تو ان کے عشق کو عقل کے بجائے قلب کی نظر سے تولنا مناسب ہے۔

عشق حقیقی کے حوالے سے سراج نے مختلف قسم کی تلمیحات کو اپنے کلام میں جگہ دی۔ ان کے کلام میں جس قسم کے واقعات کی سمائی ہے ان میں خدا، نبیؐ، قرآن، حدیث، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، یوسفؑ، خضرؑ، علیؓ، کربلا، منصور جیسی تلمیحات مختلف مقامات پر بیان ہوتی ہیں۔ ان تلمیحات کا خصوصی پہلو یہ ہے کہ یہ تمام کی تمام اپنے پس

منظر کے حوالے سے مختلف واقعات کی نشاندہی کرتی ہوئی شعر میں کیفیت عظمیٰ کو مائل کرتی ہیں۔ ان کی قرآنی تلمیحات میں اکثر ایک سے زائد واقعات کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ عموماً شعرا کسی واقعہ کو بیان کرنے کی خاطر کسی نبی یا واقعے کا ایک خاص لفظ تراش کر اسے بیان کر دیتے ہیں جبکہ سراج کے پاس ایسا بہت کم ہوا ہے۔ وہ تلمیح کو اشارے و کنایے کے درجے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، دورِ حاضر میں اسے الگ سے اشارہ یا کنایہ کی طرز پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں یہ تلمیحات ہی ہیں جنھیں برتنے والا شاعر اس طرز کا ماہر تھا۔

سراج نے جن تلمیحات کا استعمال کیا ہے ان میں سے چند یہاں پیش ہیں۔ ان تلمیحات میں قرآنی آیات اور حدیث نبوی سے لے کر واقعات و روایات تک کو بیان کیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ سے متعلق تلمیحات:

بارگاہِ ایزدی میں جب اپنی بات رکھنی ہو تو سراج کا معاملہ بڑا مختلف ہے۔ وہ ذہن یا عقل کی بات سننے سے انکار کرتے ہیں۔ انھیں عقل و فہم کی حدود پر قانع ہونے کے بجائے قلب کی اس نظر پر اعتبار ہے جسے خدا نے اپنے نیک بندوں کے لیے مخصوص کیا ہے۔ سراج اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے ربِّ عظیم کی ایک صفت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

الٰہی کر لبالب جام خالی
دکھا مجھ کوں جمال لایزالی

(کلیاتِ سراج، ص 254)

عشق حقیقی کے معنی یہی ہیں کہ جس سے وہ کیا جا رہا ہو وہ ہر نقائص و عیوب سے پاک ہو، اس میں سوائے

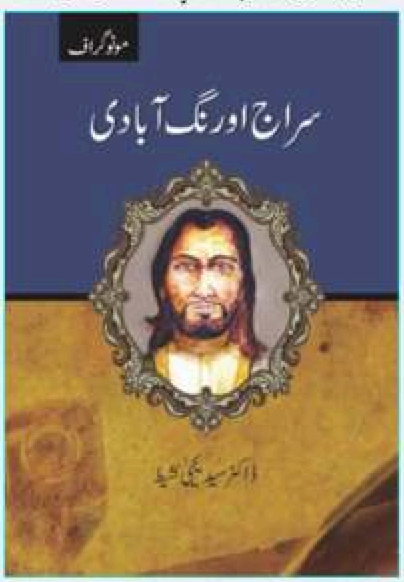

صفات کے کچھ اور نہ ہو۔ جو لم یزل ولا یزال (ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہو) کی خوبی سے آراستہ ہو۔ ایسی صرف ایک ذات ہے اور اسی ذات سے عشق کرنا جائز و لازم بھی ہے۔ سراج کے پاس اس عشق کی اپنی روش ہے۔ ان کے عشق میں تجاوز زیادہ اور عقلی سودے بازی کم ہے۔

ابدی حسن کی مثال خدا کے علاوہ اور کون ممکن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اسے دیکھنا کسی چشم بینا کے بس کی بات نہیں لیکن سراج کے پاس اسی جمال کو دیکھنے کا اشتیاق ایسا گھر کر گیا ہے کہ وہ حسن کے اس نور کو مثل شراب پینا چاہتے ہیں۔ اسے اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ذات جو ازل سے قائم، ابد تک موجود، اس سے قبل کچھ نہیں اس کے بعد کچھ باقی نہیں رہتا ہے اور جس کے حسن کی تعریف نبی آخرالزّماں کر چکے اس کے جمال کے دیکھنے کے لیے کوئی شخص جنون میں آ جائے تو کیا عجب ہے۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

اپس کی صفت آپ وہ بے نظر
کیا ہے علی کلی شئی ء قدیر

(ایضاً، ص 271)

انسان بینائی کی خاطر دیدوں کا محتاج ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا رب ان خالی کٹوروں کو روشنی عطا کرے تاکہ وہ دنیا و مافیہا کو دیکھنے کے لائق بن سکے۔ سراج جذب شوق میں اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا رب صفات سے آراستہ نہیں بلکہ خود صفات ہی صفات ہے اور عالم استعجاب میں کہتے ہیں کہ وہ ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے تبھی تو وہ بینائی کی خاطر نظر کا محتاج نہیں وہ بے نظر ہے لیکن باجود اس کے وہ ہر شئے کو دیکھتا ہے، ہر شے کو جانتا ہے اور ایسا جانتا ہے جیسا کہ کوئی نہیں جانتا۔

تصوف کا ایک ضابطہ ہے کہ ہمیشہ دو اشیا جو ایک دوسرے سے تضاد رکھتی ہوں وہ ایک ہی ہیں۔ یعنی تضاد ہی تکمیل ہے۔ لیکن یہ جان لینا لازمی ہے کہ یہ سب کچھ کس کے لیے ہے۔ اس کا دائرہ صرف اور صرف مخلوق ہے۔ یہاں حق کو اس سے باہر رکھا گیا ہے۔ اس ضابطے کے مطابق زندگی اور موت ایک ہے، پستی و بلندی ایک ہے، صحیح اور غلط ایک ہے۔ حق اور باطل ایک ہے۔ اس کی تفصیل کو سمجھنے کی خاطر یوں کہہ سکتے ہیں کہ فرد کے ساتھ زندگی اور موت جڑی ہے، اسی کے ساتھ پستی اور بلندی کا عمل بھی ہے، پھر اس کے صحیح ہونے یا غلط ہونے کا اشکال بھی اور اسی کے اعمال کے تحت اس کے حق اور باطل ہونے کی نشاندہی بھی۔ یوں گویا ابتدا ہو کہ انتہا اور اچھا ہو کہ برا ہو، سب کچھ ایک ہی ہے۔

آں حضرتؐ سے متعلق تلمیحات:

سراج نے نبیؐ علیہ السلام سے متعلق بھی تلمیحات پیش کی ہیں۔ شاعر کی محمد عربیؐ سے محبت مسلمان کی فطرت کے خاصہ کو بیان کرتی ہے۔ آپؐ کے معاملے میں لب کشائی کوئی سہل عمل نہیں۔ اکثر شعرا اپنے جوہرِ شعوری کو بروئے کار لا کر بڑی جدوجہد سے آں حضرتؐ سے متعلق کلام کرتے ہیں۔ سراج کے پاس اس روش میں جولانی کا احساس شامل ہے۔ وہ واقعات کے حوالے سے جب کسی تلمیح کو شامل کرتے ہیں تو نبی علیہ السلام کی عظمت کو ملحوظ خاطر رکھ کر آپ کے شایانِ شان کلام کرتے ہیں۔ وہ ان واقعات کے ذریعے آپ کو دیگر انبیا علیہم السلام سے جدا اور تمام کا سردار و اولیٰ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

کہ احمد حقیقت کے میدان میں
کہا 'ما عرفناک' اس شان میں

(کلیاتِ سراج، ص 273)

یہ شعر انسان کی حدود کا عکاس ہے۔ انسان اپنے اعمال و افعال کی بنیاد پر خدا عزوجل کو جان پاتا ہے۔ قلب کی تڑپ فرد کو خدا کے قریب کرتی چلی جاتی ہے۔ اس قربت کو معرفت سے مُشتق کیا جاتا ہے۔ لغت میں معرفت کے ایک معنی ''قانون قدرت یا فطری اشیاء کی واقفیت'' کے ہیں۔ لیکن اس شعر میں جہاں نبی علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ شاعر نے یہاں لفظ عرفناک سے خدا کی شکل و صورت کو اخذ کیا ہے۔ یہ شعر کئی واقعات کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ خاص کر معراج کے واقعے کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ شاعر کا پہلا مصرع تین اہم لفظوں سے تیار ہوا ہے۔ پہلا 'احمد' دوسرا 'حقیقت' تیسرا لفظ 'میدان' یہاں غور و خوض نشاندہی کرتا ہے کہ نبیؐ جس قدر خدا کی ذات سے متعارف تھے کوئی دوسرا اس میدان میں آپ کے مدمقابل آ نہیں سکتا۔ انبیاء کرام لاکھ مختلف معجزات اور اختیارات والے گزرے ہیں لیکن خدا کی ذات کو دیکھنے اور آپ سے باہم کلام ہونے کا یہ موقع آدمؑ سے لے کر آخری انسان تک کسی کو حاصل نہیں ہونے والا ہے۔

قیامت میں مالک قہار سے بچانے والی ذات نبی محمدؐ ہی کی ہے۔ آپ ہی کی ذات ہے جو بروز قیامت خدا کے غصے کو فرو کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔ آپ کو امام الانبیا یوں ہی تو نہیں بنایا گیا۔ شاعر کہتا ہے۔

عجب روز محشر کا سردار ہے
صف انبیا میں وہ سالار ہے

(ایضاً، ص 275)

معراج کے وقت نبیؐ کی عظمت اور ان کی بڑائی کو دکھلانے کی خاطر خدا تعالی نے انھیں بیت المقدس میں تمام انبیا کے روبرو کیا آپ نے وہاں امامت فرما کر اپنی سرداری اور اولیت کو ثابت کیا۔ یہی وہ عظمت ہے جسے شاعر اپنے لیے باعث تفاخر جانتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

جگت میں اوسے سلطنت ہی مدام
جماعت میں ہے انبیا کی، امام

(ایضاً،ص 275)

نبی کی پیروی، خدا کی پیروی ہے۔ دین حق کی پیروی ہے شاعر کہتا ہے۔

تمنا میں اپنی مجھے رکھ مدام
بحق محمدؐ علیہ السلام

(ایضاً،ص 275)

آں حضرتؐ کی بعثت سے قبل والد کا انتقال، بچپن میں والدہ، پھر دادا اور چاچا کے انتقال نے آپ کو بالکل اکیلا چھوڑ دیا لیکن آپ اس آزمائش میں کھرے اترے، اس کے بعد خدا نے آپ کو حق کا ہادی بنا کر شریعت کو آپؐ پر مکمل کیا شاعر آپ کی ان تکالیف سے پُر واقعات کو یکجا کر کے آپ کو درّیتم کے نام سے پکارتا ہے، گویا یہ آپ ہی کی صفت ہے۔

رہ شرح کا ہادیِ مستقیم
شریعت کے دریا کا دُرِّ یتیم

پروردگار نے تمام انبیاء و مخلوقات میں بہترین و افضل آں حضرت کو کہا ہے۔ خدا نے آپ کو چنا اور آپؐ کے طفیل کائنات کو وجود بخشا، شاعر آپ کی ان صفات کے سایے میں رہنے کی دعا مانگتا ہے۔

سدا گم رہوں کا وہ ہی رہنما
ہے خیرالورا احمد مجتبیٰ

محشر کے میدان میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو بڑے سکون میں ہوں گے اور سائے میں کھڑے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو عاشق رسول ہوں گے۔ شاعر یہیں سے اپنا شعر اخذ کر کے کہتا ہے۔

محشر میں سراج کیا مجھے خوف
ایمان مرا محمدی ہے

(ایضاً،ص 677)

سراج کے یہاں عشق رسول کی انتہا یہ ہے کہ خود خدا ان سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ آپ کی محبت اور آپ سے ملنے کے اشتیاق میں آپ کو معراج کراتا ہے۔ وہ آپ کو اپنے سامنے بٹھاتا ہے اور اپنا دیدار کرواتا ہے۔ کہتے ہیں۔

عشق ہے عشق کہ ہے اس کو دو عالم کا راج
عشق ہے عشق کہ ہے سر پہ اسے آہ کا تاج
عشق ہے عشق کہ پایا ہے محبت میں رواج
عشق ہے عشق کہ مشہور ہوا نام سراج
عشق ہے عشق کہ خود مظہر رحمان ہوا

(ایضاً،ص 709)

سراج دیگر انبیاء کرام کے واقعات جو کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔ نصیحت اور اصلاح نفس کی خاطر ان کو موقع بہ موقع استعمال کرتے رہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا واقعہ جو نمرود کے ساتھ پیش آیا اور خدا نے اپنے خلیل کی خاطر جب نار کو گلزار کر دیا تو سراج کہتے ہیں۔

لگے ہیں ہجر کے شعلے دکھا بہار جمال
تو کر یہ آتش نمرود، باغ ابراہیم

(ایضاً،ص 689)

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم کا پورا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ سراج نے اس شعر میں اسی واقعے کے ذریعے جو بات بیان کی ہے وہ آتش نمرود کے درمیان حکم خداوندی سے تیار ہوئے باغ کا اشارہ ہے کہ جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو خدا نے آگ کو گلزار میں تبدیل کر دیا۔ آپ کے پاس فرشتہ آیا کہ جو حکم ہو کیا جائے لیکن آپ نے انھیں جواب دیا کہ میرا رب سب جانتا ہے۔ اللہ تعالی کو اپنے خلیل کی ادا اس قدر پسند آئی کہ اس نے آگ کو حکم دیا کہ ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ آگ حکم خداوندی سے ٹھنڈی ہو گئی۔ کیا ہی محبت اور تعلق خدا ہو گا کہ خدا آگ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ جبکہ اس کی تاثیر ہی جلانا اور گرم ہونا ہے۔ عشق کے اس جذبے سے سراج مخلوق کی حدود اور خالق کا اختیار پیش کرتے ہیں۔

موسیٰؑ کو اللہ تعالی نے کلیم اللہ بنایا۔ اپنے معبود و محبوب سے کلام کے دوران کیا بعید کہ دل بے اختیار ہو اٹھے اور دیدار کا خواہشمند ہو جائے چنانچہ موسیٰ نے اختیار سے باہر کی خواہش پیش کی۔ رب نے انھیں ان کی حدود کا اعادہ کروایا لیکن عشق کو کیا کیجئے۔ محبوب کے دیدار کے ایک پل کے لیے عاشق کی جان جانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ شاعر اسی ضمن میں کہتا ہے۔

الٰہی مجھ کوں دکھلا جلوۂ نور
مرا دل کر بہار شعلۂ طور

(ایضاً،ص 256)

سراج کی شاعری میں جا بجا رب کائنات کی محبت اور اس کے دیدار کا شدید اشتیاق موجود ہے۔

تجلیات محبت کوں کیوں نہ جا دیکھے
ہوا ہے شوق میرا طور بے خودی پہ کلیم

(ایضاً،ص 689)

یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی قرآن کریم میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک نبی جس نے بچپن سے حالات کا سامنا کیا۔ بھائیوں سے دھوکا کھایا، کنویں میں ڈالا گیا، مصر میں بطور غلام بیچا گیا اور اس کے بعد اپنے نفس کی غلام خاتون کے حصے میں آنے کے باوجود اپنے جسم و ایمان کی حفاظت کی خاطر قید کی مشقت جھیلی اور کیسے مصر کا کل مختار بن گیا۔ شاعر اس تمام واقعے کو کوزے میں بند کرتے ہوئے کہتا ہے۔

الٰہی دل کوں میرے ہے تمنا
جمال یوسفی پر کر زلیخا

(ایضاً،ص 254)

زلیخا کا عشق یوسفؑ کے لیے مصیبت بن گیا۔ آپ نے اس عشق کی خاطر جو یکطرفہ تھا بہت صعوبتیں جھیلیں۔ لیکن زلیخا کا اپنا عشق بھی اس کے لیے اذیت اور مستقل تشنگی کا باعث ہوا۔ جہاں ہم اس قصے سے یوسفؑ کی پاکیزگی کو اخذ کرتے ہیں وہیں ہمیں زلیخا کی چاہت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ہاں زمانے کی جہالت اور لوگوں کے پاس دین حق کی فہمائش نہ ہونے کے باعث اس عشق میں لذت نفس بھی شامل ہو گئی جس نے اس عشق کے والہانہ پن کو بھی مجروح کیا۔ سراج اس جذبے کے اس پاکیزہ حصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جہاں محبت و عشق میں حصول لذت کی خواہش نہ ہو۔

الغرض سراج کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار موجود ہیں جن پر تصوف کی چاشنی، قلب و روح کی غذا اور صدق گوئی کے جذبات بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی بیشتر تلمیحات قرآنی آیات میں موجود واقعات کی جانب توجہ مبذول کرواتی ہیں۔ انھوں نے قرآنی تلمیحات کے لیے خصوصی تلمیحات گھڑنے کے بجائے تمام اسلامی واقعات کے لیے آیات کے سب سے اہم لفظ کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔ ان کی اکثر تلمیحات، قاری کو استعارہ محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باطن کا مطالعہ قاری کو قرآن و حدیث کی ان روشن زمینوں کی سیر کراتا ہے جہاں پر واقعات کے ایسے سرچشمے پوشیدہ ہیں جو ہدایت و رہنمائی کا سبب ہوتے اور تمام انسانیت کو نیکی، صداقت اور راست گوئی کی تلقین کرتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہ سراج اورنگ آبادی حسینی کے کلام کا اس پہلو سے بھی مطالعہ کیا جائے اور ان باتوں کو منظر عام پر لایا جائے۔

■

Dr. Siddiqui Saimuddin
House No.: 1/17/81 Near Marathwada Flour Mill
Juna Bazar, Head Post Office
Aurangabad - 431001 (MS)

غفرانہ بیگم

اسکولی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مسائل

اردو ایک اہم زبان ہے اور ہندوستان کی درج فہرست قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ عربی اور فارسی سے اردو نے بہت استفادہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کے بہت سے الفاظ ہیں۔ مگر اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ اردو زبان صرف عربی اور فارسی لفظیات تک ہی محدود ہے بلکہ یہ ایسی زبان ہے کہ جس میں دوسری زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ خاص طور پر ہندی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ اس زبان میں اس طرح جذب ہو گئے ہیں کہ فرق کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اردو کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔ ہندی کی طرح اس کی پرورش و پرداخت بھی ہندوستان ہی میں ہوئی اور ان دونوں زبانوں کے درمیان بہت سے اشتراکات بھی ہیں۔ خاص طور پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی دونوں زبانوں میں بہ خوبی ہوئی ہے۔ صوتیات اور قواعد کے لحاظ سے بھی اردو اور ہندی ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ان دونوں زبانوں کا نقطۂ امتیاز صرف رسم الخط ہے۔ ہندی نے دیوناگری لپی کو اپنایا تو اردو نے فارسی رسم الخط کو۔ رسم الخط کے اختلاف کے باوجود دونوں زبانوں میں بڑی قربتیں ہیں۔ اس کے باوجود اردو اور ہندی میں غیر ضروری طور پر تنازعے بھی شروع کیے گئے جس کی وجہ سے بہت سی سطحوں پر اردو کو بہت سے مسائل کا سامنا بھی ہے۔ بولنے والوں کی تعداد سے لے کر اس کی تعلیم و تدریس کے مسائل بھی بہت اہم ہیں۔ خاص طور پر اسکولی سطح پر اردو زبان کی تدریس میں بڑی دقتیں آ رہی ہیں۔ میں یہاں صرف بہار کے اسکولوں کے حوالے سے بات کروں گی کہ بہار کی دوسری سرکاری زبان ہوتے ہوئے بھی وہاں بنیادی سطح پر وہ سہولیات نہیں ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں۔ ایک بات اور بھی ہے کہ آج کے طلبا اردو پڑھنا لکھنا نہیں چاہتے۔ زیادہ تر طلبا کا ارادہ ہوتا ہے کہ دسویں کے بعد اردو سے ان کا واسطہ نہ رہے۔ اس لیے اردو پڑھنے میں ان لوگوں کا دھیان نہیں ہوتا۔ طلبا کی اکثریت ریاضی، سائنس، انگریزی یا دیگر مضامین کو پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ شاید بچوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ اردو زبان بہت محدود ہے اور اس میں روزگار کے مواقع بھی کم ہیں۔ وہ تکنیکی تعلیم حاصل کر کے روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں یا دیگر پیشہ ورانہ کورسز میں داخلہ لیتے ہیں۔ اسی لیے اسکولوں میں تدریسی سطح پر دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ خاص طور پر بہار جو کبھی اردو کا گہوارہ کہلاتا تھا اور وہاں اس زبان کے شیدائیوں کی ایک بڑی تعداد تھی مگر موجودہ دور میں اب اردو سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے جو تشویشناک ہے۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق بہار میں اردو بولنے والوں کی آبادی 87.7 لاکھ ہے لیکن تحقیق کے دوران جب اسکولوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو جو بات سب سے زیادہ کھٹکی وہ یہ کہ اس دور جدید میں طلبا کی اردو زبان پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان طالب علموں میں زیادہ تر اردو زبان صرف اس لیے پڑھ رہے ہیں کہ انھیں 3L فارمولے کے تحت پڑھنے کی مجبوری ہے۔ چند طلبا ہی ایسے ہیں جو اس زبان کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور زیادہ تر طلبا دیگر زبانوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے ہے کیونکہ انھیں لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں اردو ایک غیر ضروری زبان بن سکتی ہے۔

زیادہ تر اسکولوں میں اردو زبان کے ایک یا دو معلمین ہی ہیں اور کئی اسکولوں میں تو اردو زبان کا کوئی بھی معلم ملتا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ سب سے پہلے اردو زبان کے معلموں کی کمی کو دور کیا جائے۔ حکومت کی جانب سے یہ قانون بھی بنایا گیا ہے

کہ تمام اسکولوں میں معلمین تربیت یافتہ ہی ہونے چاہئیں کیونکہ ایک تربیت یافتہ معلم ہی طلبا کے سماجی، ثقافتی ونفسیاتی نشوونما میں بہتر کردار ادا کرسکتا ہے مگر غور و فکر کی بات یہ ہے کہ تربیت یافتہ معلمین بھی اسکولوں میں اپنے کام کو بہتر طریقے سے انجام نہیں دے پارہے ہیں؟

تدریس کو معقول، مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے اساتذہ بہتر سے بہتر طریقۂ تدریس، تدریسی حکمت عملی اور مختلف قسم کے تدریسی اکتسابی آلات کا استعمال کرتے ہیں۔ بیشتر اسکول انتظامیہ کے پاس کسی بھی طرح کا تدریسی اکتسابی آلہ موجود ہی نہیں ہوتا۔ حکومت نے بہار کے تمام اسکولوں میں ایک ہی نصاب پر مبنی 'اسمارٹ کلاسز' شروع کروائی ہیں، تاکہ طلبا بہتر انداز اور خوشگوار ماحول میں سمعی و بصری آلات کے ذریعے تعلیم حاصل کرسکیں۔ مگر بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو زبان کی تدریس کو اسمارٹ کلاسز میں شامل نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ اردو زبان کا مواد ابھی تک تیار ہی نہیں کیا گیا ہے کہ شاید انہی اسباب کی وجہ سے طلبا اپنی مادری زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

اردو زبان کے سامنے ایک اور مسئلہ درپیش ہے جس کو ماہرین نے جدید ٹکنالوجی سے دوری یا عدم توجہی کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان پر آئے دن یہ الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں کہ اس زبان نے اپنے آپ کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ جبکہ آج اردو زبان کو تکنیکی تعلیم سے جوڑنے کی سخت ضرورت ہے تاکہ طلبا کا رجحان اردو زبان کی طرف زیادہ سے زیادہ ہو سکے اور اردو زبان ہر ایک طالب علم کی ضرورت بن جائے۔

زیادہ تر اسکولوں میں اردو زبان کے ایک یا دو معلمین ہی ہیں اور کئی اسکولوں میں تو اردو زبان کا کوئی بھی معلم ملتا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ سب سے پہلے اردو زبان کے معلموں کی کمی کو دور کیا جائے۔ حکومت کی جانب سے یہ قانون بھی بنایا گیا ہے کہ تمام اسکولوں میں معلمین تربیت یافتہ ہی ہونے چاہئیں کیونکہ ایک تربیت یافتہ معلم ہی طلبا کے سماجی، ثقافتی و نفسیاتی نشوونما میں بہتر کردار ادا کرسکتا ہے مگر غور و فکر کی بات یہ ہے کہ تربیت یافتہ معلمین بھی اسکولوں میں اپنے کام کو بہتر طریقے سے انجام نہیں دے پا رہے ہیں؟

دور جدید میں طلبا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے پراجیکٹ پر مبنی تدریس، مسئلوں کو حل کر کے سیکھنا وغیرہ جیسے طریقۂ تدریس کے ذریعے طلبا کو فن تدریس سے واقف کرایا جاتا ہے۔ لیکن بیشتر اسکولوں میں تدریس کی بنیادی سہولیات کا انتظام کیا ہی نہیں گیا ہے۔ اساتذہ اسی پرانے طریقۂ تدریس پر آج بھی قائم ہیں، جب کہ اسکولوں کے تمام معلم تربیت یافتہ ہوتے ہیں، مگر وہ دوران تدریس کسی خاص مہارت کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ ایک اور خاص پہلو یہ ہے کہ زیادہ تر اسکولوں میں تمام طلبا کو اردو زبان کی کتابیں صحیح وقت پر مہیا ہی نہیں ہو پاتی ہیں۔ چار، چھے مہینے بغیر کتابوں کے ہی نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد کتابیں مل بھی جائیں تو طلبا میں وہ رجحان باقی ہی نہیں رہتا کہ بچے اپنی مادری زبان کی کتاب کو صحیح طور پر مکمل بھی کرسکیں۔ ایسے حالات میں اساتذہ کو غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے تدریسی عمل کو اپنائیں کہ طلبا اردو زبان کو دلچسپی سے پڑھنے لگیں۔

این سی ایف 2005 کا مطالعہ کریں تو کسی بھی زبان کی تدریس کے لیے جو رہنما اصول بنائے گئے ہیں، اسکولوں میں ان پر عمل ہی نہیں کیا جارہا ہے۔ ان کے مطابق تمام درجات کے طلبا کی مختلف قسم کے طریقۂ تدریس اور حکمت عملی کے ذریعہ نشوونما کرنی چاہیے۔ مثلاً ابتدائی درجات کے طلبا کو مختصر کہانیاں سنا کر، نظموں کو ترنم میں پڑھانا ہے تاکہ طلبا پہلے تیار ہو جائیں تو پھر وہ اپنے سبق کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔ لیکن زیادہ تر اسکولوں میں آج بھی پرانے طریقۂ تدریس پر عمل کیا جارہا ہے۔ رہنما اصول کے مطابق طلبا کو کتابیں، گائیڈ، نوٹس وغیرہ فراہم کروانے کی بات کہی گئی ہے۔ مگر اسکولوں میں جانے کے بعد ایسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ بہت سے اسکولوں کی لائبریریوں میں اردو کی کتابیں نہیں ہیں اور اگر کسی لائبریری میں کتابیں ہیں بھی تو دیگر زبان کی کتابوں کے مقابلے میں اردو کی کتابیں کم تعداد میں ہیں۔ حالت تو یہ ہے کہ طلبا کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اسکول میں لائبریری بھی ہے اور اس میں اردو زبان کی کتابیں بھی ہیں۔ دوران تحقیق مجھے یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ ایسے اسکول جہاں اردو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے موجود ہے وہاں پر ثانوی سطح کی تعلیم حاصل کر رہے طلبا میں سے زیادہ تر صحیح اردو پڑھنے اور لکھنے سے قاصر ہیں۔ اسکولوں میں تو صحیح طریقے سے اردو زبان کی کلاس ہی نہیں ہوتی ہیں جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ والدین بچوں کو اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے

اردو زبان کے سامنے ایک اور مسئلہ درپیش ہے جس کو ماہرین نے جدید ٹکنالوجی سے دوری یا عدم توجھی کے طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اردو زبان پر آئے دن یہ الزامات عائد ہوتے رہتے ہیں کہ اس زبان نے اپنے آپ کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ نہیں کیا ہے۔ جبکہ آج اردو زبان کو تکنیکی تعلیم سے جوڑنے کی سخت ضرورت ہے تا کہ طلبا کا رجحان اردو زبان کی طرف زیادہ سے زیادہ ہو سکے اور اردو زبان ہر ایک طالب علم کی ضرورت بن جائے۔

کوچنگ، مدرسوں اور مکتبوں میں بھیجنے پر مجبور ہیں۔

اردو زبان جو کہ صرف ہماری مادری زبان ہی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری تہذیب وثقافت سے ہے، خستہ حالی سے دوچار ہے۔ ہر ایک فرد بس تکنیکی تعلیم اور انگریزی کے پیچھے بھاگا جارہا ہے۔ کوئی بھی اردو زبان کی طرف رجوع نہیں کر رہا ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے حکومت کی جانب سے بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں لیکن اسکولی سطح پر ایسا کچھ بھی دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔

اردو زبان ہمارا سب سے قیمتی ورثہ ہے اور اس زبان سے ہم سبھی جذباتی طور پر جڑے ہوئے ہیں کیوں کہ صرف اسی کے ذریعے اپنی مادری زبان کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ زبان جس طرح کی تدریسی مشکلات میں گھری ہوئی ہے ان کو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ تمام اقدامات اور فروغ کی ذمے داری صرف حکومت کی نہیں ہے۔ ہم سبھی کا یہ فرض بنتا ہے کہ اردو زبان کے تدریسی مسائل کو دور کرنے کے لیے، تدریسی ترقی کے لیے کوشش کریں، کیونکہ اردو زبان کی نشوونما اور فروغ کے لیے اب تک جو بھی اسکیمیں پیش کی گئی ہیں ان سے اردو کے حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ آج اردو زبان کو پھر اس کے گھر میں ہی آباد کرنے کی ضرورت ہے۔

■

Ghufrana Begum C/o Md Aariz Ehkam
(Research Scholar)
Dighalbank Police Station, Dighalbank,
Kishanganj- 855101 (Bihar)
Mob.: 8051337759
E-mail: ghufranazahoor786@gmail.com

جنوبی ہند کے شہروں اور علاقوں کے نام پر اردو کے اثرات

عائشہ صدیقہ

اردو زبان کی تاریخ گواہ ہے کہ جہاں جہاں یہ زبان بولی اور سمجھی گئی۔ وہاں نہ صرف زبان کی سطح تک اس کا اثر پڑا بلکہ گاؤں اور شہروں کے نام بھی اردو سے متاثر ہوئے ہیں اسی لیے میں نے اس مقالے میں اردو سے متاثر گاؤں اور شہروں کے ناموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آرکاٹ والیانِ کرناٹک کا صدر مقام تھا، یہ مقام پہلے ریاست پورہ کے نام سے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کے نشیب وفراز اور پہاڑیوں سے قیمتی پتھر دستیاب ہوا کرتے تھے، اس علاقے میں حضرت ٹیپو اولیا کا مزار بھی ہے جو چار سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ نواب حیدر علی والی میسور جب ریاست پورہ آئے تو انھوں نے حضرت ٹیپو اولیا کی زیارت کی اور اولاد کے لیے ان کے مزار پر کھڑے ہو کر منت مانگی تھی جو اللہ کے فضل وکرم سے قبول ہوگئی اور انھیں لڑکا تولد ہوا۔ نواب حیدر علی نے اپنے لڑکے کا نام ٹیپو سلطان رکھا جو آگے چل کر میسور کے نواب بنے، آج ریاست پورہ کا نام بدل کر تمل بولنے والوں نے اسے آرکاٹ کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔ تمل زبان میں آر' کے معنی ندی اور' کاڈ' کے معنی جنگل ہیں، چونکہ نواب سعادت اللہ خان والی آرکاٹ بھی تھے اپنے دورِ حکومت میں جنگل کو کاٹ کر یہاں ایک نہر جاری کروائی تھی تاکہ فوج کے پڑاؤ کے وقت انھیں پانی میسر آئے اس لیے یہ مقام تمل زبان میں آرکاٹ سے موسوم کیا گیا، تمل ناڈو کے سیاسی نقشے میں آرکاٹ کو ایک مشہور علاقے کی حیثیت حاصل ہوگئی، مگر اس نام سے آج کی نسل چنداں واقف نہیں ہے جو کبھی ریاست پورہ کے نام سے مشہور تھا۔

ویلور شمالی آرکاٹ کا صدر مقام ہے ایک تاریخی شہر ہے جو ریاست کے مغربی اضلاع کو تمل ناڈو کی راجدھانی یعنی مدراس سے جوڑتا ہے، اس شہر کی سب سے بڑی پہچان یہاں کا قلعہ ہے جو والیانِ کرناٹک کے دور میں تعمیر کیا گیا، اس شہر میں ایک قدیم عربی درسگاہ بھی ہے جو دارالعلوم لطیفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس درسگاہ کے بانی مولانا قربی ہیں جسے بعد میں ان کے اخلاف نے توسیعی عمارات بنا کر اسے عزت وتوقیر بخشی مولانا قربی کے زمانے میں ویلور' دارالسرور' کے نام سے مشہور تھا کیونکہ یہ شہر ہر پریشاں حال مسافر یا اجنبی کو سکون واطمینان بخشتا تھا، اب اسے تمل زبان والوں نے دارالسرور کو بگاڑ کر ویلور بنا دیا ہے اور یہ شہر اسی نام سے جانا جاتا ہے، یہاں یہ بات یاد رہے کہ تمل بولنے والوں کی اکثریت نے لفظ دارالسرور کو توڑ مروڑ کر ویلور بنا دیا اور صدیوں سے یہ شہر اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اکثریتی زبان ہمیشہ اقلیتی زبان کے ناموں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ (بحوالہ پروفیسر سید سجاد حسین)

مدراس میں والا جاہی سلطنت کے عہد میں اور اس عہد کے خاتمے کے بعد یہاں کے مقامات، علاقوں اور گلیوں کے نام جو حکمرانوں اور صاحب اقتدار لوگوں کے ناموں سے منسوب کیے گئے تھے وہ گزرتے زمانے کے ساتھ لسانی طور پر تبدیلیوں سے دوچار ہونے لگے، حتیٰ کہ آج ان مقامات پر تمل زبان کے لسانی اثرات اس قدر مرتب ہوئے ہیں کہ لوگ ان کے قدیم ناموں سے خال خال ہی واقف ہیں، مثال کے طور پر نواب غلام غوث اعظم کے دور میں ساحل سمندر کے قریب شام کے وقت چہل قدمی کے لیے اپنی بیگمات اور شاہی خاندان کے افراد کے لیے نوابانِ آرکاٹ نے چھ باغ بنائے تھے جہاں وہ شام کے وقت آرام کرتے اور پھر اپنے محل لوٹ جاتے تھے، ایک زمانے تک یہ مقام چھ باغ کے نام ہی سے جانا جاتا تھا، لیکن آزادی کے بعد تمل ناڈو میں سیاسی پارٹیوں اقتدار میں آنے کے بعد یہ نام 'چیپاک' میں بدل گیا، اسے تمل زبان کا لسانی اثر ہی کہنا چاہیے۔ آگے چل کر یہ مقام جو چیپاک کہلاتا تھا اب' چیپاکم' بن گیا ہے۔ اسی طرح نواب صاحب کی ایک بیگم کا نام بڑی بیگم تھا اور ان کے نام سے گلی بڑی بیگم شہر کے ٹرپلیکین علاقے میں آج بھی موجود ہے۔ مگر تمل کے اثرات نے اسے بگاڑ کر بیدی اسٹریٹ بنا دیا ہے۔

شہر مدراس کے مضافات میں ایک علاقہ سعید آباد کے نام سے جو تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نواب سعید کے نام پر رکھا گیا تھا، اسے اس وقت کے لوگ سعید آباد کے نام سے جانتے پہچانتے تھے لیکن تمل زبان بولنے والوں نے سعید آباد کے نام کو اس قدر تہس نہس کر دیا ہے کہ یہ نام اب سعیدو پیٹھی ہوگیا ہے، اور یہی نام اب لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ شہر مدراس میں ایک جگہ کا نام ہے 'میلا پور' اس علاقے میں ایک بڑا مندر بھی ہے نواب غلام غوث خان اعظم نے مندر کے پجاریوں کی درخواست پر ایک بڑی جگہ انھیں انعام میں دی تھی جہاں پر مندر کی انتظامیہ نے پانی کا ایک بڑا گنتھا بنالیا ہے یہ جگہ پہلے 'مولا پور' کے نام سے موسوم تھی چونکہ یہاں مولانا مہربان فخری ناطی آرام فرما ہیں، مولانا کی نسبت سے اس جگہ کا نام مولا پور رکھا گیا تھا جو آگے چل کر تمل زبان کی لسانی زد میں آکر' میلا پور' بن گیا آج یہ جگہ اسی نام سے جانی جاتی ہے۔

(بحوالہ پروفیسر سید سجاد حسین، سابق صدر شعبہ اردو، مدراس یونیورسٹی)

زبانوں کے لسانی اثرات جو علاقوں اور شہروں کے نام پر مرتب ہوتے ہیں اس کا اندازہ اس اقتباس سے بھی لگایا جاسکتا ہے سرینیواس شاستری اپنی کتاب 'ہسٹری آف اولڈ مدراس اسٹیٹ' میں رقم طراز ہیں کہ ضلع کڈلور کے قریب ایک قدیم بندرگاہ جس کا نام 'فرنگی پیٹ' ہے جہاں انگریزوں کے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں یہ علاقہ کیونکہ انگریزوں کی آمد اور ان کے قیام کا مرکز رہا ہے اسی لیے اسے 'پرنگی پیٹ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک زمانے کے بعد جب یہاں تمل بولنے والوں کی آبادی بڑھنے لگی تو اس علاقے کو فرنگی پیٹ کے بجائے پرنگی پیٹ کہا جانے لگا، کیونکہ تمل زبان میں ف کی آواز پ میں بدل جاتی ہے، اسی لیے تمل بولنے والے اس کو فرنگی پیٹ کے بجائے پرنگی پیٹ کہنے لگے۔

دیوان صاحب باغ مدراس شہر کا ایک اہم علاقہ ہے جو قلب شہر میں واقع ہے جہاں پر نواب غوث خان اعظم کے دیوان اور قاضی القضات کے اہل خاندان رہا کرتے تھے، اب یہ علاقہ ایک گنجان آبادی میں منتقل ہوچکا ہے نواب غوث خان اعظم نے یہ علاقہ قاضی القضات اور ان کے اہل خاندان کو بطور انعام دیا تھا آج بھی قضا کے عہدے پر اسی خاندان کے افراد منتخب ہوتے آرہے ہیں۔ اگرچہ اردو والے اس علاقے کے نام کو' دیوان صاحب باغ' کے نام سے ہی جانتے ہیں، جبکہ غیر اردو دان طبقہ اسے 'پیتیا کارتوٹم' کے نام سے پہچانتا ہے یہاں اس بات کی وضاحت کرتی چلوں کہ دیوان صاحب باغ کو غیر اردو دان یہ سمجھنے لگے کہ یہاں پاگل قسم کے لوگ

رہتے ہیں اسی لیے انھوں نے دیوان کو دیوانے سمجھ کر اسے تمل زبان میں 'پیتیا کارتوٹم' ترجمہ کردیا۔ آج تک غیر اردو داں طبقہ 'دیوان صاحب باغ' کو 'پیتیا کارتوٹم' ہی کہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کس طرح ایک زبان کا لفظ ذرا سی غلط فہمی کی وجہ سے دوسری زبان میں غلط ترجمے کے ساتھ زبان زد خاص و عام ہو جاتا ہے۔

دو مختلف لسانی بنیاد رکھنے والے الفاظ و اصوات اور دو الگ الگ تہذیبی پس منظر رکھنے والی زبانوں کا ملاپ کسی بھی جہت اور کسی بھی زاویے سے کیوں نہ ہو، ادبی اعتبار سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ اگر ہم اسی تناظر میں اردو اور تمل زبانوں کے اتحاد کی ادنیٰ امکانی صورت پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان دونوں کا سنجوگ راہو اور کیتو کے ملاپ کی طرح منحوس نہیں بلکہ نیک فال کا باعث ہے۔

ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں میں اردو سب سے کم سن زبان ہے، جس کی عمر تقریباً سات سو سال کہی جاسکتی ہے، اس کے مقابل تمل لگ بھگ چار ہزار سال قدیم زبان ہے جس کے شواہد سندھ (پاکستان) میں موجود ہڑپا اور موہنجوداڑو کے غاروں میں موجود ہیں جہاں پتھروں پر لکھی ہوئی تمل تحریریں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ یہ زبان نہایت عمر رسیدہ اور انتہائی جہاں دیدہ ہے۔ تمل زبان کا تعلق قدیم ہند دراوڈی زبانوں کے قبیلے سے ہے جبکہ اردو جدید ہند آریائی زبانوں کے خاندان کی تسلیم کی گئی ہے جو بقول مصنف آب حیات مولانا محمد حسین آزاد (متوفی 1328ھ) برج بھاشا سے نکلی ہے مگر ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خان نے اپنی گرانقدر تصنیف 'مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو' کے نویں اڈیشن مطبوعہ 1988 میں کھڑی بولی اور ہریانوی کو اردو کی اساس قرار دیا ہے حالانکہ کھڑی بولی بقول سر جارج گریرسن برج بھاشا اور پنجابی کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ (لنگوسٹک سروے آف انڈیا مطبوعہ 1990، ماخوذ از ماہنامہ آج کل، ستمبر 2008 ص19)۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ اردو کے اولین نقاد علامہ باقر آگاہ ویلوری (متوفی 1220ھ) نے مثنوی 'گلزار عشق' کے مقدمہ میں مولانا محمد حسین آزاد سے سو سال پیشتر اس بات کی اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ اردو کی اصل 'برج بھاشا' ہے جس کا اعتراف ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'تاریخ ادب اردو' (جلد دوم، حصہ دوم) میں کیا ہے۔

اردو زبان کے اثرات ہندوستان میں رائج ہر زبان پر مرتب ہوئے ہیں، یہ اس لیے کہ یہی ایک واحد زبان ہے جس کا اثر و رسوخ تحریک آزادی کے دوران ہی نہیں بلکہ آزادی کی جدوجہد سے قبل اور اس کے مابعد بھی ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا، اردو زبان کی شیرینی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اردو کے اشعار اور اس کے محاورے زبان زد خاص و عام ہو چلے تھے۔ پھر ایک دور ایسا آیا کہ ملک کی مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کے عہد میں مروجہ فارسی آمیز اردو کی محکمہ جاتی اصطلاحات میں تبدیلی ظاہر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ شہروں اور علاقوں کے خالص اردو ناموں کے تلفظ میں بھی کافی فرق محسوس ہونے لگا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ مرور زمانہ کی نیرنگیاں ہوں یا تحفظاتِ لسانی کی ستم ظریفیاں، بہر حال یہ عمل دو مختلف زبانوں کے مصالحے اور معانقے کا سبب بن گیا۔ جیسے ریاستِ کیرل کا مشہور شہر 'قاضی کوٹ'، 'کوزی کوڈی' کی صورت اختیار کرگیا، اسی طرح صوبہ آندھرا پردیش کا بندرگاہی و تجارتی شہر 'اسحاق پیٹ'، 'وساکھا پٹنم' کے نام سے شہرت پاگیا، انھیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شہر بنگلور کا معروف علاقہ 'خوشحال نگر'، 'کشال نگر' کے نام سے موسوم ہونے لگا، غرض اس جیسی سیکڑوں مثالیں ذرا سی توجہ سے ہمیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ اس مقام پر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ناموں کی تبدیلی کا مذکورہ عمل کہیں کلی طور پر ہوا ہے اور کہیں جزوی طور پر۔ مثلاً 'شہر وشارم' (ضلع ویلور) کا قدیم نام 'حراست پور' تھا جو نواب محمد علی والا جاہ کے نسبتی برادر اور والی سات گڈھ نواب حراست خان (متوفی 1165ھ) کے نام سے منسوب تھا، حراست خان کے تعلق سے نامور شاعر ولی ویلوری (متوفی 1162ھ تقریباً) نے اپنی ضخیم مثنوی 'رتن پدم' میں یوں رقم کیا ہے۔ (ڈاکٹر راہی فدائی، تمل اور اردو کا ادبی اشتراک)

''حراست خاں امیر اک نامور تھا......سکونت گاہ
اس کوں سات گھر تھا''

(استشہاد، ص516، از ڈاکٹر راہی فدائی، مطبوعہ 2012ء)

جزوی طور پر شہروں کے ناموں میں جو تغیر واقع ہوا وہ بھی کئی طرح کا ہے۔ کہیں ایک دو حرف بدل گئے ہیں تو کہیں مقامی تلفظ کی وجہ سے کئی حروف کا الٹ پھیر ہوا ہے۔ جیسے تمل ناڈو کا ساحلی شہر جہاں صدیوں پیشتر قاہرہ (مصر) سے لوگ آکر آباد ہوگئے تھے، وہ 'قاہرہ پٹن' کہلاتا تھا مگر اب وہ 'کایل پٹنم' کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح شمالی آرکاٹ کے شہرت یافتہ اطبا کا مسکن شہر 'پرنام بٹ' کا قدیم نام 'پیاری بیگم پیٹ' تھا جو نوابانِ والا جاہ کے خاندان کی قابل احترام خاتون نواب پیاری بیگم کی نسبت سے مشہور ہوا تھا۔ تمل ناڈو اور کرناٹک کی سرحد پر واقع صنعتی شہر ہسور کے قریب ایک قصبہ میں مسلمانوں کی کافی آبادی موجود ہے، جس کو سالہا سال سے 'دکنی کوتا' کہا جاتا تھا مگر اب اس نے 'تین کنی کوٹے' (شہد کا چھتہ) کا روپ دھار لیا ہے۔

ڈاکٹر راہی فدائی 'تمل اور اردو کا ادبی اشتراک' میں رقم طراز ہیں: 'راقم الحروف نے سفر ناگور کے دوران 'چدم برم' کے نزدیک ایک بڑا سا گاؤں دیکھا جس کا نام 'کالی پورمبو' لکھا ہوا تھا، راقم نے وہاں کی مسجد میں نماز عصر ادا کی۔ بعد نماز امام صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے دوران گفتگو کہا کہ اس دیہات کا نام 'قاضی پورم' تھا جو مرور زمانہ کی وجہ سے 'کالی پورمبو' ہوگیا۔ امام موصوف کے قول کی تصدیق بعد میں یوں ہوئی کہ راقم نے اس گاؤں کے آخری سرے پر انگریزوں کا نصب کردہ شکستہ سنگِ میل دیکھا جس پر انگریزی حروف میں 'قاضی پورم' لکھا ہوا تھا۔ یہی کہانی ویلور شہر کے بعض معروف علاقوں کی بھی ہے۔ ویلور کے مشہور دواخانہ سی ایم سی کا ایک بڑا حصہ جو دماغی امراض کے لیے مختص ہے 'باگایم' میں قائم ہے۔ 'باگایم' دراصل باغ عام کا تمل تلفظ ہے۔ باغ عام نوابوں کے دور کا خوبصورت چمن تھا جو بعد کو انگریزوں کے زیر استعمال آگیا۔ یہی کیفیت 'رحمت پالیہ' اور 'قادر پیٹ' علاقوں کی ہے جو بالترتیب 'رامانا کیم پالیم' اور 'کاگیدر پیٹ' کے نئے رنگوں میں رنگ گئے ہیں۔ اسی طرح 'رحمت پالیہ' سے آگے کا علاقہ جو ماضی قریب میں 'سید پیرا پری' کہلاتا تھا اب وہ 'سدو تیری' کے تمل تلفظ کے ساتھ زبان زد ہوگیا ہے۔''

حاصل کلام یہ کہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو اور تمل زبانوں کا اتصال کسی نہ کسی سطح پر تا حال قائم ہے، ہمیں اس پر منفی رویہ اختیار کرنے کے بجائے مثبت طریقے سے غور کرتے ہوئے زبانوں کی تبدیلی کے اس عمل کو قدرت کی کرشمہ سازی کے طور پر قبول کرنا چاہیے۔

جہاں زبانیں ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ وہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس لسانی منظر نامہ میں تاریخ، تہذیب اور ثقافت بھی اپنا رول ادا کرتی ہے۔ کیونکہ شہروں اور علاقوں کے ناموں کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ اس کو سمجھے بغیر ہم ان ناموں کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس موضوع پر باقاعدہ ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح قومی سطح پر ملک میں شہروں اور علاقوں کے جو نام ہیں ان کا اگر لسانی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ اندازہ ہوگا کہ زبانیں کس طرح ان ناموں کو برقرار رکھنے یا ان میں تبدیلیاں لانے میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔

■

Aesha Siddiqa J
Research Scholar, Dept of Urdu
Madras University
Navalar Nagar, Chepauk, Triplicane

ایم ایس ایکسل پر کام شروع کرنا؟

(Getting Started with MS-Excel)

مشق E-1 (Excercise E-1):

اوپر بتائے جاچکے طریقے سے ایک خالی ورک شیٹ کھولیے اور اس میں تصویر E-2.9 کی طرح لیبل اور عدد بھریے۔

اس ورک شیٹ میں کسی طالب علم کے ذریعے مختلف مضامین کے دونوں سوال ناموں میں حاصل نمبرات دکھائے گئے ہیں۔ ابھی اس میں کوئی جمع وغیرہ نہیں بھرا گیا ہے، کیونکہ وہ ہم ایکسل سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس کے لیے فارمولے بھرنے ہوں گے۔

سب سے پہلے ہم ہندی مضمون میں حاصل کیے گئے نمبرات کے جمع نکالیں گے، جو 'Total' کالم کے نیچے سیل E10 میں بھرا جائے گا۔ پہلے اس میں پوائنٹر لے جا کر کلک کیجیے۔ اب اس میں یہ فارمولہ بھر دیجیے۔ 'C10+D10'۔ یہ فارمولہ سیدھے ٹائپ کر کے انٹر دبایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ سیل میں فارمولہ کی بجائے عدد '80' دکھائی دے رہا ہے، جو کہ سیل C10 اور D10 میں بھرے ہوئے عددوں کی جمع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ورک شیٹ میں عام فارمولے نظر نہیں آتے، بلکہ ان کے شمار کے نتیجے دکھائے جاتے ہیں۔

اسی طرح کالم 'Total' کے نیچے سیلوں E11 سے لے کر E15 تک میں دوسرے مضامین میں حاصل کیے گئے نمبرات کو معلوم کرنے کے لیے فارمولہ بھر دیجیے۔ آپ

1		D.A.V. Senior Secondary School				
2		New Delhi				
3						
4		Senior School Examination, 2008				
5						
6	Name:	Richa Sharma			Roll no.	4107304
7	Father's Name:	Shri M.K. Sharma				
8						
9	Subjects	Max Marks	Theory	Practical	Total	
10	English	100	80	0		
11	Hindi	100	72	0		
12	Mathematics	100	73	18		
13	Social Science	100	62	15		
14	Science	100	51	36		
15	Sanskrit	100	94	0		
16	Total					
17						

تصویر E-2.9: ورکشیٹ میں اعداد اور لیبل

2			New Delhi		
3					
4		Senior School Examination, 2008			
5					
6	Name:	Richa Sharma		Roll no.	4107304
7	Father's Name:	Shri M.K. Sharma			
8					
9	Subjects	Max Marks	Theory	Practical	Total
10	English	100	80	0	80
11	Hindi	100	72	0	72
12	Mathematics	100	73	18	91
13	Social Science	100	62	15	77
14	Science	100	51	36	87
15	Sanskrit	100	94	0	94
16	Total	600	432	69	501
17					

تصویر E-2.10: فارمولے بھرنے کے بعد ورکشیٹ

چاہیں، تو E10 کے فارمولے کو E11 سے E15 تک کاپی کرسکتے ہیں، جس کا طریقہ آگے بتایا جائے گا۔ ابھی سب کو سیدھے ٹائپ کر دیجیے۔

اب ہم ابھی مضامین کے زیادہ تر نمبرات (Max.Marks) اور حاصل کیے گئے نمبرات کا جمع نکالیں گے۔ اس کے لیے قطار 16 میں 'Total' کے آگے سیل B16 سے E16 تک مناسب فارمولے بھرے جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ سیل B16 میں سیلوں B10 سے B15 تک جمع بھرا جائے گا، لہٰذا اس سیل میں فارمولہ '=B10+B11+B12+B13+B14+B15' ٹائپ کرنا ہوگا۔ یہ فارمولہ ٹائپ کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ اس کو آسانی کے طور پر SUM فنکشن کے ساتھ اس طرح بھی بھرا جاسکتا ہے '=SUM(B10:b15)'، جس کا مطلب ہے رینج B10:B15 کے سیلوں کا جمع۔ فارمولہ بھرتے ہی اس کا نتیجہ عدد '600' کی شکل میں دکھائی دے گا۔

اسی طرح آپ سیلوں C16, D16, E16 میں مناسب فارمولے بھر دیجیے یا B16 کے فارمولے کو کاپی کیجیے۔ اگر آپ نے فارمولے صحیح صحیح بھرے ہیں، تو E16 میں نتیجہ 501 کی شکل میں دکھائی دے گا۔ اس وقت آپ کی ورک شیٹ تصویر E-2.10 کی

8					
9	Subjects	Max Marks	Theory	Practical	Total
10	English	100	80	0	=C10+D10
11	Hindi	100	72	0	=C11+D11
12	Mathematics	100	73	18	=C12+D12
13	Social Science	100	62	15	=C13+D13
14	Science	100	51	36	=C14+D14
15	Sanskrit	100	94	0	=C15+D15
16	Total	=SUM(B10:B15)	=SUM(C10:C15)	=SUM(D10:D15)	=SUM(E10:E15)
17					

تصویر E-2.11: Excel options کا ڈائیلاگ باکس

طرح دکھائی دے گی۔

اگر آپ فارمولوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، تو آفس بٹن پر کلک کیجیے۔ اس کے بعد کھلنے والے پل- ڈاؤن مینو میں Excel Options ہدایت دیجیے۔ ایسا کرنے پر Excel Options ڈائیلاگ باکس کھلے گا۔ ڈائیلاگ باکس میں بائیں پٹی میں دیے گئے آپشنز میں سے Advanced آپشن کو کلک کیجیے۔ تھوڑا اسکرول کرکے Display options for this worksheet: عنوان کے نیچے دیے گئے Show formulas in cells instead of their calculated results چیک- باکس میں کلک کیجیے (تصویر E-2.11)۔ اس سے فارمولے تصویر E-2.12 کی طرح دکھائی دیں گے۔ عددوں کو پھر سے دیکھنے کے لیے اسی چیک باکس کو ری سیٹ کیجیے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تصویر E-2.12: ورک شیٹ میں بھرے ہوئے فارمولے

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے۔ یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً ترک کی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: ➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

تبصرہ و تعارف

لفظ (شعری مجموعہ)

مصنف: آل احمد سرور

صفحات: 95، قیمت: 70 روپے، اشاعت دوم: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عشرت جہاں، محلّہ ٹنڈولہ، ٹانڈہ، رامپور، یوپی

پروفیسر آل احمد سرور اگر چہ بحیثیت نثر نگار اور ناقد اپنی شناخت رکھتے ہیں مگر ان کی شاعری بھی کم قابل توجہ نہیں ہے۔ اسی لیے کئی ناقدین نے ان کی شاعری کو ان کی نثر سے کم نہیں آنکا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

’’ہمارے دوسرے بڑے جدید نقادوں کی طرح سرور صاحب کے ساتھ بھی یہ زیادتی ہوئی کہ ان کے تنقیدی افکار کے سامنے ان کی شعر گوئی کو کم اہمیت کا حامل قرار دیا گیا۔ ورنہ اگر دیکھا جائے تو جدید اردو شاعری میں بھی آل احمد سرور کا نام نمایاں جگہ کا مستحق قرار پاتا ہے۔‘‘

آل احمد سرور کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ اول ’سلسبیل‘، دوم ’ذوق جنوں‘، سوم ’خواب و خلش‘ اور چہارم ’لفظ‘۔ مجموعہ ’لفظ‘ آل احمد سرور نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مرتب کیا۔ جب ان پر خاصا ضعف طاری ہوگیا تھا۔ بقول آل احمد سرور ’’یہ مجموعہ میری علالت کے زمانے میں مرتب ہوا۔‘‘ اس مجموعے کے حوالے سے انھوں نے ’کچھ اس مجموعے کے بارے میں‘ میں کچھ باتیں لکھی ہیں۔ آخر میں دسمبر 2001 کی تاریخ مرقوم کی گئی ہے۔ جب کہ 2002 میں آل احمد سرور اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آل احمد سرور کا یہ شعری مجموعہ ان کی زندگی کے بالکل آخری دور میں مرتب ہوا مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مجموعے میں جو نظمیں اور غزلیں شامل کی گئی ہیں، وہ بھی زندگی کے بالکل آخری زمانے کی ہیں۔ اس مجموعے میں بعض نظمیں تو وہ ہیں جو ان کے تیسرے شعری مجموعے میں شاملِ اشاعت ہونے سے رہ گئی تھیں، البتہ یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اس آخری مجموعے میں شامل ان کا زیادہ تر کلام ان کی زندگی کے آخری دور کا ہے۔ اس لیے یہ مجموعہ ان کی شاعری کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

’لفظ‘ پہلی بار 2005 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد 2019 میں اسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا۔ دیباچہ عصر حاضر کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ مجموعے میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نظموں میں بعض آزاد نظمیں اور بعض پابند نظمیں ہیں۔ مجموعے کی پہلی نظم ’لفظ‘ ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے۔ اس نظم میں 27/اشعار ہیں۔ نظم پڑھ کر جہاں لفظ کی اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں شاعر کی شاعرانہ پرواز اور رفعتِ تخیل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں جن نظموں کو شامل کیا گیا ہے، ان میں نظم اور غزل، میں بھی زندہ ہوں، اپنی نظر تو ہوگی، قطعہ، اپنے علی گڑھ کی یاد میں، ڈاکٹر عبدالسلام کی نذر، ہمیں سکھایا گیا تھا، لمحے کے اسیر، دانشوری کا زوال، نئے سال کی آمد پر، میرا مسافر، ذاکر صاحب کی واپسی پر۔ ان نظموں میں کئی نظمیں ان کی جوانی کے زمانے کی بھی ہیں۔ جیسے ’نئے سال کی آمد پر‘۔ یہ 1941 کی ہے۔ ’ذاکر صاحب کی واپسی پر‘ 1949 کی نظم ہے۔ ’میرا مسافر‘ 1961 ‘میں لکھی گئی۔ 1970 کی دہائی کی بھی کئی نظمیں اس آخری مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔ ’ہمیں سکھایا گیا تھا‘ 1987 کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ باقی تمام نظمیں 1990 کی دہائی کی ہیں۔ نظم ’لفظ‘ جسے مجموعے میں اول نمبر پر جگہ دی گئی ہے، وہ 2000 کی ہے۔

اس مجموعے میں نظموں سے زیادہ غزلیں ہیں۔ یعنی غزلوں کی مجموعی تعداد 50 سے بھی زیادہ ہے۔ غزلوں کے اس ذخیرے میں دو چار غزلیں ہی ایسی ہیں جو 1980 اور 1990 کی دہائی سے قبل کی ہیں۔ گویا کہ اس مجموعے میں شامل آل احمد سرور کی غزلیہ شاعری ان کی زندگی کی آخری دو دہائیوں کی ہے۔ ان غزلوں میں بہت سے موضوعات کو برتا گیا ہے، تجربات، گہرے مشاہدات اور افکار پر مبنی اشعار کی تعداد خاصی ہے۔ ان کا اس نوع کا کلام بہت عمدہ ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار دیکھیں ؎

دیکھیے کچھ خواب، ان میں گم نہ ہونا سیکھیے
زندگی میں صرف خوابوں پر گزر ہوتی نہیں

علم کے ادارے بھی اب تو کارخانے ہیں
علم کے اداروں میں علمیت نہیں ملتی

خبر بھی ہے کہ اندھیرے نے روپ بدلا ہے
فضا میں گرچہ اجالا دکھائی دیتا ہے

ہیں فاصلے بھی ضروری محبتوں کے لیے
کہ قربتوں کے سرے نفرتوں سے ملتے ہیں

’لفظ‘ میں شامل آل احمد سرور کے کلام کو پڑھ کر ان کی شاعری کے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی کہ جدید اردو شاعری میں ان کا کیا مقام ہے۔

مشاہیر ادبیات مشرقی

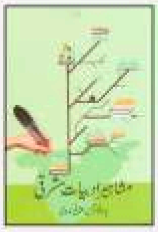

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292، قیمت: 145، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: نایاب حسن، A/22 سیما اپارٹمنٹ

گلی نمبر: 7، ہلال ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو زبان کے عربی اور فارسی سے قریبی اور مضبوط رابطے کی وجہ سے اردو کے طالب علم یا محقق و تخلیق کار کی ان دونوں زبانوں اور ان کے مشاہیر سے ایک حد تک واقفیت ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں کے باہمی روابط اور مناسبتوں پر مختلف پہلوؤں سے کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں، مگر باضابطہ ایک ایسی کتاب کی ضرورت بھی محسوس کی جارہی تھی جس میں ان تینوں زبانوں کے مشاہیر سے متعارف ہونے کی راہ نکالی گئی ہو اور ان کے مختصر حالات جمع کر دیے گئے ہوں۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے 'مشاہیر ادبیاتِ مشرق' مرتب کرکے بڑی حد تک اس ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ موصوف ہندوستان کے علمی و ادبی حلقے میں خاصے متعارف ہیں۔ وہ معلم ہیں اور مصنف بھی ہیں، ادیب ہیں اور ناقد و محقق بھی ہیں، ایک طویل عرصے تک جہاں مختلف دانش گاہوں سے وابستہ رہ کر انھوں نے عربی زبان و ادب کی تدریس کی خدمت انجام دی ہے وہیں ان کا قلم بھی گزشتہ کئی دہائیوں سے سرگرم سفر ہے اور اب تک وہ مختلف علمی، ادبی، تنقیدی، سماجی و سیاسی موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اخبارات و رسائل میں بھی ان کی تحریریں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی ہیں اور وہ خود بھی سہ ماہی 'مطالعات' (دہلی) اور سہ ماہی 'کاروانِ ادب' (لکھنؤ) کے ادارتی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

'مشاہیر ادبیاتِ مشرق' میں انھوں نے مشرق یعنی اردو، عربی و فارسی زبانوں کے مشاہیر کے مختصر حالات جمع کر دیے ہیں۔ یہ کتاب مقدمہ کے علاوہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں مصنف نے ادب کی لفظی و اصطلاحی تعریف پیش کرتے ہوئے عربی و فارسی زبان و ادب سے اردو کے روابط کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کتاب کی تالیف کا جواز فراہم کیا ہے۔ ان کی یہ بات درست ہے کہ "مشرقی ملکوں میں رہنے والے ادیب اور شاعر کے لیے مستحسن بات ہے کہ وہ کم از کم مشرقی ملکوں کی ادبیات سے واقف ہوں، گرچہ یہ واقفیت طائرانہ نظر کی حیثیت رکھتی ہو"۔ (مقدمۂ کتاب) مصنف نے پہلے باب میں اردو شعرا کا تعارف کرایا ہے، جس کا آغاز امیر خسرو سے اور اختتام شکیل بدایونی پر کیا ہے۔ مجموعی طور پر اس باب میں اردو کے پچاس شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اردو کے نثر نگاروں کے تعارف کے لیے خاص ہے اور اس میں کل تیس نثر نگاروں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ تیسرا باب عربی ادب کے شعرا کے تعارف کے لیے خاص ہے اور اس میں 42 قدیم و جدید عربی کے شاعروں کا تعارفی تذکرہ ہے، چوتھے باب میں عربی کے 24 قدیم و جدید نثر نگاروں کا تعارف کروایا گیا ہے۔ پانچواں باب فارسی شاعروں کے تعارف کے لیے خاص ہے اور اس میں کل 28 شاعروں کا تذکرہ ہے اور چھٹے باب میں فارسی کے 22 نثر نگاروں کا تعارف ہے۔

کتاب میں اختصار کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے مشرقی ادبیات کی زیادہ سے زیادہ مشہور شخصیات کے احاطے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے قاری بہ یک وقت اردو، عربی اور فارسی کے تقریباً دو سو قدیم و جدید شعرا، ادبا اور تخلیق کاروں سے متعارف ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے ان شخصیات کا مجمل تعارفی خاکہ اور متعلقہ مراجع بھی آجاتے ہیں اور اس کے لیے حسب ضرورت ان کے بارے میں مزید تفصیلات جاننے کا راستہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔ محسن عثمانی صاحب نے دسیوں کتابوں کے مطالعے سے معلومات کشید کرکے اس کتاب میں جمع کر دی ہیں۔ شعرا کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے کچھ شعری نمونے بھی درج کیے ہیں، ان کے ادبی و شعری مقام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور عربی و فارسی اشعار کے ترجمے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ نثر نگاروں کی تصانیف اور ان کے اسلوبِ نگارش پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ البتہ مؤلف نے ان شخصیات کے تذکرے میں کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، کیف ما اتفق تعارف پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعے کے دوران قاری کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے، ورنہ ذہن میں خلجان پیدا ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں شخصیات کا تعارف ان کے سنینِ پیدائش یا وفات، ان کے ادبی مقام و مرتبہ یا حروفِ تہجی کسی بھی ایک ترتیب کے ساتھ پیش کرنا چاہیے تھا۔ اسی طرح ایک اور خاص بات یہ ہے کہ گرچہ اس کتاب میں تقریباً 200 مشاہیر ادبیاتِ مشرق کا تعارف پیش کیا گیا ہے، مگر اس کے باوجود اردو، عربی اور فارسی کے اہم، مشہور اور نمایاں مصنفین و شعرا انھی لوگوں تک محدود نہیں ہیں جن کا اس کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے، مؤلف نے خود لکھا ہے کہ اس کتاب میں شخصیات کے "استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے"۔ پس عین ممکن ہے کہ ان زبانوں کے کئی بڑے نام ذکر کرنے سے رہ گئے ہوں۔

بہر کیف علمی اعتبار سے یہ کتاب طلبہ، ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ و مصنفین کے علاوہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے اور امید ہے کہ اس کے مطالعے سے غیر معمولی فائدہ ہوگا۔ عثمانی صاحب اردو کے کہنہ مشق قلم کار ہیں، سو ان کے اسلوبِ تحریر میں سلاست و روانی اور زبان و بیان کی شفافیت ایک خاص رنگ میں پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب بھی ان کے منفرد اسلوبِ تحریر کا خوب صورت نمونہ ہے۔ اس کی اشاعت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیرِ اہتمام ہوئی ہے، 292 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت 145 روپے نہایت مناسب ہے۔

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

نگاہ نقد

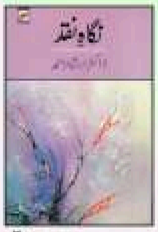

مصنف: ڈاکٹر ارشاد احمد

صفحات: 216، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال

N-93، ٹاپ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

ڈاکٹر ارشاد احمد ہمہ جہت قلم کار کے طور پر معروف ہیں۔ ان کے تنقیدی، تاثراتی مضامین اور مختلف اصناف کی کتب پر تبصرے ملک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تخلیق کاروں کی بجائے ان کی تخلیقات کو مرکز میں رکھ کر گفتگو کی جائے۔ تاکہ تخلیقات کے حوالے سے مصنف کی شناخت قائم ہو اور فن بھی ادب عالیہ میں شامل ہو سکے۔

پیش نظر کتاب 'نگاہ نقد' ڈاکٹر ارشاد احمد کے ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف اور قابل ذکر رسائل و جرائد میں شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر سکے ہیں۔ کتاب کے مشمولات میں 'پریم چند گاندھی کے اثرات'، 'سردار جعفری کا سیاسی شعور'، 'مشرقی ہند میں اردو صحافت'، 'افق کی صحافتی و ادبی خدمات'، 'محمد مستقیم ادب میں سائنس کا متلاشی'، 'ڈاکٹر ریاض احمد: تعلیم و تدریس کا خادم'، 'نمک دان: فکر شعلہ انگیز'، 'اردو تدریس: جدید طریقے اور تقاضے' اور 'لوکو پائیلیٹ: ایک شاندار کریئر' بڑے جامع اور پر مغز مضامین ہیں۔ یوں تو کتاب میں شامل تمام مضامین اچھے ہیں لیکن مصنف کو تعلیم و تدریس کے مسائل سے زیادہ رغبت ہے، اس لیے تعلیمی سلسلے کے مضامین بہت خوب ہیں۔

'اردو تدریس- جدید طریقے اور تقاضے' ڈاکٹر ریاض احمد کی کتاب پر ایک تبصراتی مضمون ہے جس میں مصنف نے اپنے قول کے برعکس کہ مصنف کی تخلیقات کو مرکز میں رکھ کر گفتگو کی جائے، مصنف کے لیے بھی اپنے تبصراتی مضمون کا ایک چوتھائی حصہ وقف کر دیا ہے لیکن ڈاکٹر ارشاد احمد نے یہ بات قطعی درست لکھی ہے کہ ''فی زمانہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو تدریس میں وہ سائنٹفک طریقے اور حربے اپنائے جائیں (اگرچہ یہاں 'حربے' کا محل نہیں ہے) جن سے موضوع، متن اور اسباق میں دلچسپی پیدا ہو اور معنویت میں اضافہ ہو۔'' انھوں نے یہ بات بھی بڑے وثوق کے ساتھ کہی ہے کہ ''یہ کتاب وہ روشن چراغ ہے، جس کی ضیا پاشی سے ایک انسان اپنی منزل تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے۔'' یہ بات بھی یقینی ہے کہ عصری تقاضوں اور تدریس کے جدید اصولوں سے ہم آہنگ ہوئے بغیر اپنی منزل تک رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

کتاب کا بہت اچھا اور اہم مضمون 'مشرقی ہند میں اردو صحافت' ہے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد نے یہ بات حوالوں کے ساتھ ثابت کرنے کی سعی بلیغ کی ہے کہ اردو کی ادبی صحافت کی دنیا میں مشرقی ہند کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہوا، وہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں سے کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ اس خطے کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اردو صحافت کا سفر جو 1822 میں شروع ہوا وہ آج تک نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں تنوع، وسعت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی بھی آ گئی ہے، جو پورے اہل اردو کے لیے خوش آئند بات ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے اپنی تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ میں ریاست بہار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں اردو صحافت کا آغاز پہلے ہوا۔ پھر انگریزی اور ہندی صحافت نے یہاں جنم لیا۔ بہار سے پہلے اردو اخبار کی صورت میں 1853 میں آرہ سے 'نورالانوار' جاری ہوا۔ آرہ اس وقت شاہ آباد ضلع کا مرکز تھا۔ اس اخبار کے مالک سید محمد ہاشم بلگرامی اور ایڈیٹر سید خورشید احمد تھے۔''

مشرقی ہند کے اس خطے کو دوسرے علاقوں کی بہ نسبت ایک تفوق یہ بھی حاصل ہے کہ بہار کے ادبی صحافی اردو ادب و صحافت کا نام روشن کر رہے ہیں اور اپنی شہرت و ناموری میں دوسری ریاستوں سے آگے نظر آتے ہیں، لیکن افسوس ناک پہلو یہ بھی ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کے استعمال میں یہ ریاست بہت پیچھے ہے اور نئے لکھنے والوں کو اردو ادب کی نزاکتوں سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے لیے کوششیں کرنی چاہئیں۔

امید ہے 'نگاہ نقد' ڈاکٹر ارشاد احمد کی ایک اہم تصنیف قرار پائے گی اور ان کی شہرت و ناموری میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

بہت مشکل ہے شجاع ہونا

مرتب: ڈاکٹر سید نورالامین

صفحات: 206، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محسن خان، 14-1-497، سیتارام پیٹ، منگل ہٹ

بیگم بازار، حیدرآباد 500012 (آندھرا پردیش)

مہاراشٹر کے ضلع پربھنی سے تعلق رکھنے والے معروف افسانہ نگار پروفیسر ڈاکٹر نورالامین نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر سید شجاعت علی پر ایک کتاب بہ عنوان 'بہت مشکل ہے شجاع ہونا' مرتب کی ہے۔

کتاب کا پیش لفظ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے 'تخلیق، تنقید اور تحقیق کا مرد میداں شجاع کامل' عنوان کے تحت لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''افسانہ نگاری میں دلچسپی کے باعث میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ پی ایچ۔ ڈی کا موضوع اردو افسانہ رکھیں۔ میں ان کا گائیڈ رہا۔ ان کا موضوع 'جدید افسانے میں ترک وطن وہجرت کے مسائل' تھا۔ انھوں نے بڑی محنت سے اس مقالہ کو لکھا ہے اور اسکے لیے انھوں نے یوروپ کے چند ممالک خصوصاً انگلینڈ اور جرمنی جا کر وہاں کے اردو افسانہ نگاروں سے شخصی ملاقات کی اور مواد جمع کیا۔'' پیش لفظ کے بعد 'تعارفی خاکہ' عنوان کے تحت چار صفحات پر مشتمل سید شجاعت کا بائیوڈیٹا ہے۔ جس میں ان کے تعلیمی سفر سے لے کر ان کی تصنیفات، تعلیمی سرگرمیاں، سمیناروں میں شرکت، لیکچرس، بیرونی سفر اور ایوارڈز کو بیان کیا گیا ہے۔ نورالامین نے اس کتاب میں اردو کے 38 دانشوروں، اساتذہ، اسکالرس اور محبان اردو کے مضامین کو جگہ دی ہے۔ تہران، امریکہ، لندن اور ملک کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے شجاعت علی پر اس کتاب میں مضامین لکھے ہیں۔

ہر مضمون کی ابتدا میں لکھنے والے کا مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے جس سے مضمون نگار کے بارے میں قاری کو معلومات حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نورالامین نے کتاب میں اپنے استاد سے لیا گیا ایک انٹرویو شائع کیا ہے۔

''رودادِ بے کراں.......... آنسو سے تبسم تک'' میں ڈاکٹر شجاعت نے اپنے تعلیمی سفر کو بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک اسکول میں اس طرح بدلہ لیا کہ گرانٹ کو رکوا دیا۔ اور آگے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دشمنوں کو بھی اپنے دستخط کے ذریعہ ریسرچ گائیڈ بنایا۔ مضمون میں ان کی زندگی کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ان کو ملے دھوکے، تکالیف اور نقصانات کا بھی تفصیلی ذکر ہے۔

پاکستان کی یونیورسٹی آف سرگودھا کے استاد ڈاکٹر شفیق آصف نے اپنے مضمون 'تحقیق وتنقید کا ایک معتبر نام...... ڈاکٹر سید شجاعت علی' میں لکھا ہے کہ " ڈاکٹر سید شجاعت علی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا موضوعاتی سطح پر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ انھوں نے شاعری، ناول، افسانہ، رثائی ادب اور ادبی کتب کا فکری وفنی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید شجاعت علی کا اسلوب انفرادیت اور حقائق نگاری کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ اپنی بات دوٹوک اور مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔" (صفحہ: 43) پیشونت کالج ناندیڑ کے شعبہ مراٹھی کے استاد ڈاکٹر شنکر وبھوتے نے مراٹھی زبان میں شجاعت علی پر جو مضمون لکھا اس کا اردو میں ترجمہ نورالامین نے پیش کیا ہے۔

تہنیتی قطعہ فیروز رشید نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر نورالامین کی مرتب کردہ اس کتاب میں شامل مضامین کے عنوانات اور مضمون نگاروں کے نام اس طرح ہیں۔ نقد شجاع کامل (ڈاکٹر سید تقی عابدی۔ کینڈا)، بہت مشکل ہے شجاع ہونا (انٹرویو: ڈاکٹر نورالامین)، روداد بے کراں...... آنسو سے تبسم تک (ڈاکٹر سید شجاعت علی نے اپنا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے)، خاکہ...... شجاع کامل پوت کے پاؤں پالنے میں (نورالحسنین، اورنگ آباد)، تحقیق وتنقید کا ایک معتبر نام...... ڈاکٹر سید شجاعت علی (ڈاکٹر شفیق آصف۔ پاکستان)، ڈاکٹر شجاعت علی کے رثائی مضامین (ڈاکٹر علی بیات۔ ایران)، شخص اتصاف...... ڈاکٹر سید شجاعت علی (غوثیہ سلطانہ۔ امریکہ)، سید شجاعت علی (ڈاکٹر امیر زہرا حسین۔ لندن)، ہم خود جلے چراغ جلانے کے واسطے (ڈاکٹر ارتکاز افضل۔ اورنگ آباد)، ڈاکٹر سید شجاعت علی...... نئی نسل کا سپہ سالار (پروفیسر محمد زماں آزردہ۔ کشمیر)، ڈاکٹر سید شجاعت علی ایک مطالعہ (پروفیسر میر تراب علی ید اللہی۔ حیدرآباد)، ڈاکٹر سید شجاعت علی...... ایک اسم با مسمیٰ شخصیت (عبدالکریم سالار۔ جلگاؤں)، علاقۂ مراٹھواڑہ کا باغی تخلیقی قلمکار (ڈاکٹر فہیم احمد صدیقی۔ ناندیڑ)، کوہ کن کی محنتیں آخری ٹھکانے لگ گئیں! (پروفیسر حبیب نثار۔ حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی)، ڈاکٹر شجاع کامل۔ کچھ یادیں کچھ باتیں (پروفیسر سید فضل اللہ مکرم۔ صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی)، 'ڈاکٹر سید شجاعت علی قوسین' کے حوالے سے (پروفیسر سید حیدر علی۔ الہ آباد)، روداد یاراں (سید عباس)، ایک منفرد شخص: شجاع کامل (پروفیسر عبدالعزیز)، آہنی عزم والی منفرد شخصیت شجاع کامل (ڈاکٹر مسرت فردوس، اورنگ آباد)، مراٹھواڑہ کا ایک ضدی اور سرکش قلم کار ڈاکٹر سید شجاعت علی (ڈاکٹر انیس الحق قمر)، دل پسند شخصیت ڈاکٹر سید شجاعت علی (پروفیسر ڈاکٹر شنکر وبھوتے)، ڈاکٹر سید شجاعت علی: ست یوگ کا ارجن (ڈاکٹر کرتی مالینی وٹھل جاولیے، اورنگ آباد)، ڈاکٹر شجاع کامل ایک بے باک قلمکار (ڈاکٹر سید تحسین حیدر زیدی، نندوربار)، ڈاکٹر شجاعت علی المعروف شجاع کامل (ڈاکٹر ارشاد احمد خان۔ ناندیڑ)، ادبی وسماجی شخصیت کا نام...... ڈاکٹر شجاع کامل (محمد خواجہ معین الدین، اورنگ آباد)، ڈاکٹر شجاع کامل ذہن میں بسا آدمی (محمد قاسم، پربھنی)، ڈاکٹر سید شجاعت علی المعروف شجاع کامل (سید اختر صادق، ناندیڑ)، آوازوں اور چہروں کی بھیڑ کو چیر کر ابھرنے والی ایک مکمل شخصیت ڈاکٹر سید شجاعت علی (وحید امام۔ جلگاؤں)، افسانہ نگار۔ شجاع کامل (ڈاکٹر شیخ زبیر احمد قمر دیگلوری)، 'قوسین' ایک جائزہ (ڈاکٹر مقبول احمد مقبول۔ اودگیر)، میرے حوصلہ کا نام...... ڈاکٹر سید شجاعت علی (ڈاکٹر شیخ عمران)، جودت طبع شخصیت...... ڈاکٹر سید شجاعت علی (قاضی مزمل الدین ندوی، جلگاؤں)، قوسین کا خالق 'قوسین' میں (فاروق سید۔ ممبئی)، ڈاکٹر سید شجاعت علی۔ ایک فعال شخصیت (نورالنسا، محمد سعد الدین صدیقی۔ ناندیڑ)، زندگی کی پگڈنڈیوں کا رہبر...... ڈاکٹر سید شجاعت علی (ڈاکٹر نورالامین۔ پربھنی)۔

ڈاکٹر نورالامین نے دنیا بھر کی اردو کی عظیم شخصیات کی جانب سے ڈاکٹر سید شجاعت علی پر لکھے گئے مضامین اور مقالوں کو بہت ہی عمدگی سے ترتیب دے کر ایک اچھی کتاب مرتب کی ہے۔ اور یہ ایک فرمانبردار، دیانتدار، تعلیم یافتہ اور حقیقی طالب علم کی جانب سے اپنے استاد کو بہترین خراج ہے۔ 206 صفحات پر مشتمل ایک اردو کے سپاہی کی جدوجہد کی داستان اور کارناموں پر مشتمل یہ کتاب ہدیٰ بک ڈپو حیدرآباد، عثمانیہ بک ڈپو کولکتہ، قاسمی کتب خانہ جموں وکشمیر، ڈاکٹر سید شجاعت علی (ناندیڑ) سے فون نمبر 9422419886 سے یا کتاب کے مرتب ڈاکٹر ڈاکٹر نورالامین، پربھنی مہاراشٹر سے فون نمبر 9850776349 پر ربط پیدا کر کے حاصل کی جاسکتی ہے۔

مضامین

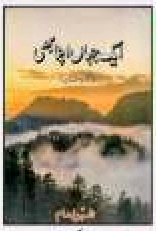

اک جہاں اپنا بھی

مصنف/ ناشر: شبر امام
صفحات: 224، قیمت: 200 روپے
مبصرہ: صبا انجم (ریسرچ اسکالر)
شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ایک جہاں اپنا بھی' اردو کے معروف تخلیق کار شبر امام کی ایک نئی تخلیقی کاوش ہے۔ شبر امام عہد حاضر کی ایک علمی وادبی شخصیت کا نام ہے۔ ان کا وطن بہار کی ایک پالی بستی ہے لیکن مستقل رہائش پٹنہ میں ہے۔ وہ عنفوان شباب سے ہی سماجی ناہمواریوں کے خلاف سینہ سپر رہے اور مختلف نوعیت کی فلاحی ورفاہی تحریکوں میں حصہ لیا۔ سیاسیات وسماجیات اور اردو تحریک سے بھی خاص انداز میں ان کی وابستگی رہی۔ ان مقاصد کے لیے انھوں نے 'ادارہ حسینی سماج' کا قیام عمل میں لایا اور جب تک جسمانی قویٰ ساتھ دیتا رہا، وہ پورے زور وشور سے کام کرتے رہے۔ وہ ایک حقیقت پسند آدمی ہیں، انھوں نے صرف اور صرف تصنیفی کاموں تک خود کو سمیٹ رکھا ہے، شبر امام کی تصنیفی زندگی اب اپنی پانچویں دہائی میں پہنچنے کے قریب ہے۔ انھیں مذہبیات وفکریات اور ادبیات سے خاص شغف ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ 'تال تفکر' سے شروع ہونے والا ان کا تصنیفی وتالیفی سلسلہ آج کئی درجن کتابوں تک پہنچ چکا ہے۔ وہ تاریخ وتہذیب کے ایک مستند قلم کار ہیں۔ ادبیات کی دنیا میں انھوں نے مضامین، انشائیے، افسانے اور متعدد سوانحی خاکوں سے اردو کو نوازا ہے۔ خصوصاً ان کا ناول 'شاہین' اپنی انفرادیت کے باعث لکھنؤ میر اکادمی کے ذریعے انعام سے نوازا گیا، اور آج بھی باذوق حلقوں کے حافظے میں تروتازہ ہے۔ تحقیق وتنقید اور یادداشت وسوانح نویسی سے انھیں بلا کی دلچسپی ہے۔ 'ایک جہاں اپنا بھی' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

اس مجموعے میں کل 13 افراد پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ کتاب کا نام مصنف نے 'ایک جہاں اپنا بھی' اس لیے رکھا ہے کہ اس میں انھوں نے ان چنندہ لوگوں سے جڑی اپنی یادداشتوں کو یکجا کیا ہے جن کا تعلق نہ کہ صرف بہار سے ہے بلکہ ہندوستان کے اور دوسرے شہروں سے بھی ہے، اور ان میں کئی ادب میں بھی اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں شبر امام نے معروف سیاست دان سر سید سلطان احمد کے متعلق بھی لکھا ہے۔

سر سلطان احمد کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں ہی فرقے کے لیڈران سے ملاقات کرتے تھے۔ انگریزوں کو بھی ان پر بھروسہ تھا۔ سر سید

سلطان احمد کی زندگی کئی جہت سے قابل ذکر ہے۔انھوں نے ضلع اسکول گیا سے میٹرک پاس کیا اورآئی اے تک تعلیم حاصل کی، لندن چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے آئے اور 1905 میں کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کی ابتدا کی۔اپریل 1912 میں بہار ایک نیا صوبہ قرار پایا۔اوراس نئے صوبے کا سید سلطان احمد کو ڈپٹی لیگل ریممبرینسر (Deputy Legal Remembrencer) مقرر کیا گیا۔ 1917 میں گورنمنٹ ایڈوکیٹ ہو گئے نومبر 1919 تک اس عہدے پر فائز رہے اوراس کے بعد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔ 15/اکتوبر 1923 سے 1930 تک وہ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔انھوں نے اپنے دور میں یونیورسٹی کو فروغ دیا۔سرسلطان نے اپنے دور میں پٹنہ یونیورسٹی کا معیار اس قدر بلند کیا کہ دنیا بھر میں یہ یونیورسٹی مشہور ہوگئی۔آپ نے پٹنہ میڈیکل کالج 1924 میں قائم کیا۔ وٹزی کالج کی بنیاد 1968 میں ڈالی۔ٹریننگ کالج کی عمارت 1930 تک بن کر تیار ہوگئی اور کلاس شروع ہوگئی۔ سائنس کالج 1967 میں قائم کیا۔سینٹ ہال کا کام 1965 میں شروع ہوااور یہ شاندار عمارت 1929 میں تیار ہوگئی۔ وہ پٹنہ یونیورسٹی کو سنوارنے میں لگے رہے۔ وہ دو ٹرم پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔سر سلطان احمد اور مصنف جناب شبر امام دونوں کا تعلق نہ صرف ایک گاؤ پالی سے تھا بلکہ انھیں (سر سلطان احمد کو) مصنف سے گہرا لگاؤ بھی تھا۔زیر تبصرہ کتاب میں شبر امام اپنی سر سلطان احمد کے ساتھ وابستگی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس وقت وہ پالی پہنچے تو راقم نے بہتر نہیں سمجھا کہ ان سے ملاقات کریں اور موضع پر چلا گیا۔جب انھوں نے مجھے نہیں دیکھا تو دریافت کیا کہ شبر یہاں موجود نہیں ہیں، دریافت کرو۔ان کا ملازم میرے گھر پر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ موضع پر گئے ہیں۔ اس نے واپس ہوکر اطلاع دے دی۔قریب چار بجے دن کو ہم ان سے ملنے گئے۔وہ کمرے کے باہر ہی سائباں پر بیٹھے تھے اور اردگرد کی کرسیوں پر بھتیجے، پوتے وغیرہ بیٹھے تھے ان کی جب میرے پر نظر پڑی تو بولے:

''واہ! مجھے امید تھی کہ تم چائے وغیرہ انتظام کرکے مجھے ریسیو کروگے۔''

شبر امام نے اپنی اس تصنیف میں سر سلطان احمد کے علاوہ جن کا ذکر کیا ہے ان میں اردو کے معروف شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی ہیں جنھیں ادب سے تعلق رکھنے والا اور خصوصاً شاعری میں دلچسپی لینے والا ہر شخص جانتا ہے۔مصنف نے اس کتاب میں ان کی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر کو تقریباً 60,70 صفحات میں قلم بند کیا ہے۔ان کے علاوہ محترم خواجہ حسن ثانی نظامی، مولانا انتظار حسین نقوی، سید آل حسن معصومی مرحوم، شمیم فاروقی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، اور ملک زادہ منظور احمد پر بھی ایسے ہی لکھا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے متعلق لکھتے ہیں:

''خدا بخش اورینٹل لائبریری کی ایسی حالت ہوگئی تھی کہ اسے ایک مسیحا کی اشد ضرورت تھی۔جس شے کی بنیاد خلوص اور نیک ارادے سے رکھی جاتی ہے اس کی نگہبان قدرت ہوتی ہے، لیکن وہ کچھ دنوں تک انتظار کرکے امتحان لیتی ہے۔خدا بخش لائبریری کے لیے ڈاکٹر عابد رضا بیدار مسیحا بن کر عظیم آباد میں وارد ہوئے۔''

آخر میں شبر امام نے اپنی اس کتاب میں اردو کے ایک اور معروف شاعر ملک زادہ منظور احمد پر قلم اٹھایا ہے۔ان کی شاعری میں وہ حلاوت و چاشنی تھی جو انھیں اپنے ہم عصر شاعروں اور دانش وروں میں ممتاز کرتی ہے۔شاعر ملک زادہ منظور اردو زبان اور تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے دبستان لکھنؤ کے ایسے آخری ادیب شاعر اور دانش ور تھے جنھوں نے اپنی جاگتی آنکھوں سے اردو زبان کا عروج و زوال دیکھا تھا۔شبر امام ملک زادہ منظور کے لیے لکھتے ہیں:

''دنیا سے کسی انسان کے گزر جانے سے نہ کام رکتا ہے اور نہ زمانہ کی رفتار کم ہو جاتی ہے، لیکن ایک زمانے تک دلوں میں اس کی یاد آتی رہتی ہے اور جو اس کے گزر جانے سے خلا پیدا ہوتا ہے اس کا پر ہونا ناممکن ہوتا ہے۔انھیں میں سے ایک ملک زادہ منظور تھے۔''

مختصر یہ کہ مصنف نے ایک اہم کتاب لکھی ہے اس کتاب کو لکھ کر نہ صرف انھوں نے اپنی یادوں کو یکجا کیا ہے بلکہ ادب سے جڑے لوگوں کے لیے معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کر دیا ہے۔یقیناً یہ کتاب دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ افادیت سے بھرپور ہے۔

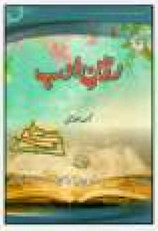

رہین ادب

مصنفہ: ڈاکٹر جہاں آرا سلیم

صفحات: 160، قیمت: 100 روپے

مبصرہ: ڈاکٹر گلشن، ضیا محل، جامع مسجد، دہلی 6

زیر تبصرہ کتاب 'رہینِ ادب' ڈاکٹر جہاں آرا سلیم کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں شامل مضامین زیادہ تر مختلف رسائل اور جرائد میں مختلف اوقات میں شائع ہو چکے ہیں۔

'رہینِ ادب' میں ایک درجن سے زائد مضامین شامل ہیں، جس میں منظر سلیم، احمد فراز، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد سے لے کر وارث علوی، عرفان صدیقی، عابد سہیل، غلام رضوی، سلمان عباسی، والی آسی، انور ندیم، انور جلال پوری، نظیر اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، منشی فیاض علی تک اعلیٰ و غیر معروف قلم کاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔مصنفہ نے یہ تمام مضامین صرف انھیں شخصیات کے بارے میں لکھے ہیں جن کو انھوں نے بہ چشم خود دیکھا، سمجھا، پرکھا یا جن سے متاثر ہوئیں، جوش ملیح آبادی، نظیر اکبرآبادی اور منشی فیاض علی کے علاوہ سبھی سے انھوں نے ایک سے زائد ملاقاتیں کی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں سے سچائی اور خلوص جھلکتا ہے۔اس سلسلے میں رضوان احمد فاروقی اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر جہاں آرا سلیم نے شہر نگاراں کے جن قد آور ادیبوں کو، شاعروں کو جانا اور صحافیوں و دانشوروں کو پہچانا، ان سے ان کی حیات میں ملیں، متعدد ملاقاتوں کے ذریعے انھیں پرکھا اور بہت کچھ ایسا سمجھ لیا جو بعد میں کسی طور ممکن نہ ہو پاتا۔ اسی لیے انھوں نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا، کم لفظوں میں ان کا حق ادا کرنے میں کامیاب رہیں۔...''

ان مضامین میں خاکہ نگاری کی خوبصورت جھلکیاں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں، مثلاً 'منظر سلیم: شخصیت اور فن' میں منظر سلیم کی خاکہ نگاری... 'سفید رنگ کے سوٹ میں ملبوس گلے میں ٹائی کسی ہوئی، گھنیرے بالوں میں ترچھی مانگ، بڑی بڑی غلافی نیم باز آنکھیں بھنویں کمانی، چوڑی پیشانی، دراز قد، گٹھا جسم، صاف رنگ، دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر چہرے اور ٹھوڑی کو ٹکائے بایاں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے، چھل کپٹ سے پاک نورانی چہرہ...'' اسی طرح حسن واصف عثمانی صاحب کا خاکہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں کہ: ''علی گڑھ کٹ پائجامہ اور سفید مل مل کے کرتے میں ملبوس، آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا، چوڑی پیشانی، پتلی پتلی انگلیوں میں سگار دبا، نسیں ابھری ہوئیں دھاردار ناک، اس کے نیچے تراشیدہ ہونٹ، بے ترتیب بال، پیٹ پیٹھ سے چپکا ہوا، کتابی چہرہ، گال اندر کی جانب دھنسے ہوئے...''

وارث علوی سے متعلق: ''کتابی چہرہ، رنگ کھلتا ہوا، پیشانی بہت چوڑی، غرور سے پاک آنکھیں، باریک تراشیدہ ہونٹ اور بیٹھنے کا انداز لقا کبوتر سے ملتا جلتا...''

خاکہ نگاری کے علاوہ مصنفہ اپنے قاری کو نہ صرف بے شمار معلومات کا عمدہ ذخیرہ فراہم کرتی ہیں بلکہ انھوں نے جگہ جگہ شعرا کا خوبصورت کلام بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار

مجھ سے دیکھی نہیں جاتی یہ ہوا کی شوخی
وہ تری زلف سنوارے یہ کوئی بات ہوئی

(والی آسی)

ابھی آنکھوں کی شمعیں جل رہی ہیں پیار زندہ ہے
ابھی مایوس مت ہونا ابھی بیمار زندہ ہے

(انور جلال پوری)

سورج چڑھا تو پگھلی بہت چوٹیوں کی برف
آندھی چلی تو اکھڑے بہت سایہ دار لوگ
جی رہا ہوں دوسروں کے جسم میں
موت جینے سے مجھے روکے گی کیا

(مظہر سلیم)

مختصراً یہ کہ ڈاکٹر جہاں آرا سلیم صاحبہ کا انداز بیان سلیس وشستہ ہے۔ ان کے مضامین سے ان کی تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ امید ہے یہ مجموعۂ مضامین اردو ادب اور اردو زبان کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا۔

شاعری

خیالوں کا سفر

شاعر: اسرار نسیمی
ترتیب وتزئین: بلال راز
صفحات: 136، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2019
مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی
B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی، صاحب آباد، غازی آباد

بریلی ایک ایسا شہر ہے جہاں ہمیشہ سے شاعری کے لیے ماحول سازگار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شہر بہت سے شعرا و ادبا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ تخلیقیت یہاں کی سرزمین میں رچی بسی ہے۔ بریلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز روہیلوں کے دور اقتدار میں ہوا۔ روہیلوں کے سیاسی اقتدار اور ان کی سخن پروری نے بہت سے شعرا کو بریلی کی طرف متوجہ کیا۔ نوابین روہیلہ سخن سنج اور سخن پرور تھے۔ شعروشاعری کا بہت شوق تھا۔ خود نواب حافظ رحمت خاں سخن پرور اور ادب دوست تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب رحمت خاں کے زمانے میں بریلی میں شاعروں کا اجتماع ہوگیا تھا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کئی شعرا و ادبا ایسے ہیں جنھوں نے عالمگیر سطح پر شہرت حاصل کی اور ہندوستان کے کئی شہروں میں بریلی کا نام روشن کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان سے باہر بھی وہ اپنی صلاحیت سے اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔

اسرار نسیمی کا تعلق بھی اسی ادبی گہوارہ سے ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کی شاعری سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دردمند انسان ہیں اور زمانے کی بے راہ روی سے مطمئن نہیں ہیں۔ اسرار نسیمی نے 1956 میں ایک علمی ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو گھر میں ادبی فضا اور شاعرانہ ماحول پایا۔ دادا شعری ذوق رکھتے تھے اور والد جمیل خاں رضوی ایک اچھے نعت گو شاعر تھے۔ اسرار نسیمی نے اپنی شاعری کا آغاز نعت گوئی سے ہی کیا۔ بعد میں غزل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے 'لفظوں کی روشنی'، 'یا نبی' (نعت کا مجموعہ)، 'عقیدت کے چراغ' (مناقب)، 'گلدستۂ نعت' (نعت کا مجموعہ) اور 'خیالوں کا سفر' منظر عام پر آچکے ہیں۔ شاعری خدا کا ودیعت کردہ تحفہ ہوتا ہے اور اگر ماحول سازگار مل جائے تو اس خداداد صلاحیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ خداداد صلاحیت اور ادبی ماحول نے اسرار نسیمی کے فن کو جلا بخشی۔ اسرار نسیمی اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''1990 میں بسلسلۂ معاش میں نے کنگھی ٹولہ بریلی میں سکونت اختیار کی۔ اس زمانے میں شہر میں بزم فکر وفن، روہیل کھنڈ اردو اکادمی، بزم رنگ ونور، بزم خلوص جیسی متعدد تنظیمیں شعروادب کی آبیاری کر رہی تھیں اور مستقل طور پر ماہانہ نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں شرکت کے مواقع دستیاب ہوئے۔ یہاں مجھے ایسا ماحول ملا جو علم وادب اور فن شاعری کی خوشبو سے معطر تھا۔ اس شاعرانہ ماحول میں میرے شعری سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا، جو ہنوز جاری وساری ہے۔''

'خیالوں کا سفر' اسرار نسیمی کا تازہ ترین مجموعہ ہے، جس کا آغاز حمد سے ہوا ہے۔

چاند تاروں میں ترا ہی نور ہے — نور سے تیرے جہاں معمور ہے
ذرے ذرے سے عیاں ہے تیری ذات — ہر جگہ ہر شے میں تو مستور ہے

خدا کی رحمتوں کا بیان کرنے کے بعد رحمت للعٰلمین کے حضور میں نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں۔

نہیں جیسے کوئی مثل نبی اول سے آخر تک — نہیں ایسے کسی کے امتی اول سے آخر تک
بنا کر آپ کو محبوب اپنا حق تعالیٰ نے — فضیلت انبیا میں بخش دی اول سے آخر تک
پڑھا الحمد سے والناس تک اسرار تب سمجھا — ہے قرآں میں مدح نبی اول سے لے کر آخر تک

اس کے علاوہ ایک نعت اور بھی ہے جس میں سرور کائنات کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسرار نسیمی کی غزلوں میں صرف عشق وعاشقی کی باتیں ہی نہیں بلکہ عصری حسیت بھی ہے اور تہذیبی قدروں کے زوال کا شکوہ بھی۔ وہ سماجی ناہمواریوں پر طنز بھی کرتے ہیں اور زمانے کی ستم ظریفیوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ بڑی سادگی سے اپنے خیال کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔

اسرار نسیمی مقصدی شاعری کے قائل ہیں ان کا خیال ہے کہ چاہے اشعار کی تعداد کم ہو لیکن شاعری مقصدی ہو کیونکہ بہت سے اشعار کہنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک ان میں کوئی خاص بات نہ ہو اور کوئی اثر نہ ہو۔ وہ اپنی بات کو ایک شعر میں اس طرح کہتے ہیں۔

فائدہ کیا ہے اگر کہہ لیے اشعار بہت — پُر ہوں مقصد سے تو اسرار ہیں دو چار بہت

اسرار نسیمی کی شاعری کا مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں زندگی کے تلخ وشیریں تجربات بھی ہیں۔ انھوں نے جو سماج میں دیکھا اسے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کر دیا ان کے یہاں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں اخلاقی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جو نہیں جانتے حلال ہے کیا — کرتے ہیں وہ حلال کی باتیں
جو بچوں کی کفالت کر رہے ہیں — وہ گویا اک عبادت کر رہے ہیں
گلے ملنے کی رسمیں بڑھ رہی ہیں — مگر دل دور ہوتے جا رہے ہیں

کتاب کا انتساب اسرار نسیمی نے دنیائے ادب کے ان قلم کاروں کے نام کیا ہے، جنھوں نے اردو ادب کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب کتاب کو اردو ادب سے قلبی لگاؤ ہے۔ کتاب کا نذرانہ بریلی کی مشہور و معروف شخصیت ایم حسین ہاشمی کو پیش کیا ہے، جس سے شاعر کی اپنے وطن عزیز سے محبت کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ واقعی حسین ہاشمی ایسی شخصیت ہیں جن سے بریلی کو بہت شہرت ملی۔ اسرار نسیمی بڑے احترام کے ساتھ اپنی تصنیف کا نذرانہ پیش کرتے ہیں:

''مشہور ومعروف ادبی وسماجی و باغ و بہار شخصیت عزت مآب عالیجناب ایم حسین ہاشمی صاحب کی نذر جن کے دم سے بریلی کی ادبی محفلوں کو وقار حاصل ہے۔''

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اسرار نسیمی کی شاعری موثر ہے۔ انھوں نے بڑی سادگی سے اپنے دل کی بات کہی ہے اور سماجی بدحالی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے ان کا انداز دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے۔ امید ہے کہ دیگر شعری مجموعوں کی مانند 'خیالوں کا سفر' بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

رسائل و جرائد

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب و ثقافت'

مدیر: پروفیسر محمد ظفر الدین

صفحات: 352، شمارہ: 9، سنہ اشاعت: ستمبر 2019

ناشر: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مانو، حیدرآباد

مبصر: معصوم زہرا، T-39، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی 25

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کا ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل 'ادب وثقافت' میرے ہاتھوں میں ہے۔ 352 صفحات پر مشتمل اس شمارہ کے ایڈیٹر پروفیسر محمد ظفر الدین ہیں۔ مجلس ادارت میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر نسیم الدین فریس، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر م۔ن۔ سعید، پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر محمد فاروق بخشی اور انیس اعظمی جیسے اہم نام شامل ہیں۔ یوں تو دنیا بھر سے اردو ادب کے لاتعداد رسائل وجرائد شائع ہوتے ہیں۔ تکنیکی ترقی نے ان رسائل وجرائد تک رسائی حاصل کرنے میں آسانیاں فراہم کی ہیں۔ ساتھ ہی طباعتی مراحل کو بھی آسان بنادیا ہے۔ زیر نظر جرنل کے ادارتی بورڈ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ جرنل اردو ادب کی تنقید و تحقیق کے لیے کتنا معتبر اور اہم ہوسکتا ہے۔ چونکہ یہ شمارہ ششماہی ہے اس لیے طباعتی مراحل سے قبل کی تیاریوں کے لیے کافی وقت مل جاتا ہوگا۔ اس میں ایک منفرد بات یہ ہے کہ ادارتی ٹیم میں تحقیق و تنقید، درس وتدریس میں اپنی زندگیاں صرف کرچکے افراد شامل ہیں۔ جنھیں اس شمارہ کے اشاعتی مراحل میں جن لوازمات یعنی مضامین کے انتخاب، تدوین اور پروف ریڈنگ جیسے معاملات کو حل کرنے کے لیے کافی وقت مطلوب ہوتا ہے۔ ششماہی ہونے کے باعث اس کے لیے کم وقتی کا شکوہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اب بات آتی ہے جرنل میں جگہ پانے والے مقالات کی۔ اس کے لیے جب ہم فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے مدیر موصوف کے خیالات سے سامنا ہوتا ہے۔ جس کو انھوں نے شذرات کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اس جریدے کے آغاز کا سہرا یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر اسلم پرویز کے سر باندھا ہے کیونکہ جس ادارہ کے تحت اس کا آغاز ہوا وہ ڈائرکٹوریٹ ہی وائس چانسلر کی ایماء پر قائم کیا گیا۔ وابستگان 'ادب وثقافت' کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس میں ایسے لوگوں کی تحریروں کو شامل کیا جائے جن کی تحریریں اس میں ابھی تک جگہ نہیں پاسکی ہیں۔ پیش لفظ کے مرحلے کے بعد پہلا نام ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کا آتا ہے جنھوں نے اردو اب کے اہم شاعر ولی دکنی کے کلام پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی غیر مطبوعہ غزلوں کا تذکرہ کیا ہے اور ولی کے تعلق سے کئی اہم مضامین کی طرف اشارہ کیا ہے جو الگ الگ افراد کے تحریر کردہ ہیں اور مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ ولی کے تعلق سے اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں، جو ریسرچ اسکالروں کے لیے نہایت ہی سودمند ثابت ہوسکتے ہیں۔ دوسرا مقالہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کا ہے۔ جس کا عنوان 'کشمیر میں اردو غزل: سمت اور رفتار' ہے۔ اس عنوان کے تحت قاضی صاحب نے کشمیر کی تہذیب وثقافت اور ماحول میں اردو شعر و ادب کی روایات کو پرکھنے اور جانچنے کے ساتھ ساتھ میدان تغزل میں اپنے جوہر دکھانے والے شعرا کی نشاندہی کی ہے۔ جن میں حامدی کاشمیری، جگن ناتھ آزاد جیسے اہم ترین ناموں کے ساتھ شوریدہ کاشمیری، رسا جاودانی، غلام رسول نازکی، حکیم منظور، سیفی سوپوری، عرش صہبائی اور نشاط انصاری وغیرہ جیسے نام ہیں جو کشمیر کے دلفریب مناظر اور سسکتی انسانیت کے درمیان صنف غزل کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

پروفیسر بیگ احساس مضمون 'جمیل مظہری کی شاعری کے فکری میلانات' کے تحت جمیل مظہری کے تعلق سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ نظم کے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں اور ایک زمانے میں جمیل مظہر کا نام اقبال اور جوش کے بعد لیا جاتا تھا۔ انھیں ان کی زندگی میں ہی علامہ کہا جانے لگا جس کے نتیجے میں دبستان عظیم آباد کے اہم ترین شعرا میں ایک نام جمیل مظہری کا ابھر کر سامنے آیا۔

اسی طرح رسالہ میں پروفیسر قدوس جاوید کا مقالہ 'حکیم منظور کی غزل: بخن ثقافت زاد' پروفیسر ابن کنول کا مقالہ 'قاضی عبدالستار اور ان کے تاریخی ناول'، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا مضمون 'قائم شناسی ایک تجزیہ'، پروفیسر اسلم جمشید پوری کا مضمون 'حب الوطنی اور اردو افسانہ (آزادی کے بعد)' پروفیسر نامور سنگھ کا مقالہ 'کارل مارکس اور ادب' جس کا ترجمہ ڈاکٹر رغبت شمیم ملک نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عبدالمالک کا مضمون 'گل نغمہ کے آنگن میں دیوناگری ہنڈولہ (ہنڈولہ کا فنی ولسانی تجزیہ)' جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اہم جائزہ ڈاکٹر جنید ذاکر نے مختلف اداروں میں اردو ترجموں کے تعلق سے لیا ہے۔ جو اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ تراجم پر کام کم کیے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں کچھ نئے ترجمے کے اداروں کی نشاندہی کی ہے۔ جن میں بیشتر سرکاری ہیں۔

دیگر مقالات میں ڈاکٹر سید اسرارالحق سبیلی کا مضمون 'پروفیسر عبدالغفور: بچوں کے ایک اہم معمار شاعر'، ڈاکٹر صبیحہ تبسم کا مضمون 'مغربی بنگال میں اردو شاعری کا ایک جائزہ'، عارف حسین خاں کا 'املے کے تعلق سے کچھ باتیں'، ڈاکٹر مسرت جہاں 'ترنم ریاض کی نظموں میں سماجی وتہذیبی شعور'، ڈاکٹر محمد انظر ندوی کا 'سلیمان خطیب: دکنی زبان کا نمائندہ شاعر'، ڈاکٹر ناہید فاطمہ کا 'عہد برطانیہ کی لسانی سازشیں'، ڈاکٹر نوشاد عالم کا 'شہر آشوب کا ارتقائی سفر ایک جائزہ'، محمد منہاج الدین کا 'پروفیسر اختر اور ینوی کا لسانی سرمایہ' محمد نعمان علی کا 'نظریات ترجمہ بمقابلہ معیار ترجمہ: مشرقی ومغربی افکار اجمالی جائزہ' محمد شریف کا 'لداخ میں اردو افسانہ' وغیرہ جیسے مقالات کو جریدے میں جگہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ اس جریدے کے آخر میں ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد یونیورسٹی کی الگ الگ موضوعات پر 57 مطبوعات کی فہرست کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز اور مدیر پروفیسر ظفر الدین کی یہ کوشش اہم ثابت ہوگی۔ ادارہ کے ذمے داروں کی کوشش لائق تحسین ہے۔ مجھے یہ امید ہے کہ یہ جریدہ اردو ادب کے طلبا کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

نئی قومی تعلیمی پالیسی اردو مخالف ہرگز نہیں ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مہاتما گاندھی بین الاقوامی یونیورسٹی وردھا میں شعبۂ اردو کو برقرار رکھنے اور مہاتما گاندھی سینٹرل یونیورسٹی موتیہاری میں شعبۂ اردو کے قیام کے سلسلے میں وائس چانسلرز کے نام کونسل کی جانب سے مکتوب روانہ

نئی دہلی: موجودہ حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی میں کہیں بھی اردو کی مخالفت نہیں کی ہے اور نہ ہی بنیادی تعلیمی نظام سے اردو کو خارج کرنے کا کوئی ذکر ہے۔ ملک کو 34 برسوں بعد ایک جامع قومی تعلیمی پالیسی ملی ہے جس کا سبھی کو استقبال کرنا چاہیے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے نئی تعلیمی پالیسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ پالیسی میں یہ واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ آئین کے آٹھویں شیڈول میں درج سبھی زبانوں کے فروغ پر توجہ دی جائے گی اور اس مقصد سے اکیڈمیوں کا قیام کیا جائے گا، ساتھ ہی ان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ہر ممکن اقدامات کیے جائیں گے۔ ملک کا آئین جب مادری زبان میں بنیادی تعلیم کی وکالت کرتا ہے تو پھر ملک کی تعلیمی پالیسی میں اس کی خلاف ورزی کیسے ہوسکتی ہے؟ اس پالیسی میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ شروع سے پانچویں کلاس تک لازمی طور پر اور آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر ذریعۂ تعلیم مادری اور مقامی زبان ہوگی، اس سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو میں ہی تعلیم حاصل کرنے کے مجاز ہوں گے۔ اس پالیسی کے تحت ملک کی تمام زبانوں کے تحفظ اور ان کی ترقی کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ انٹرپریٹیشن (آئی آئی ٹی آئی) کے قیام کے ساتھ ساتھ پالی، فارسی اور پراکرت جیسی زبانوں کے فروغ کے لیے قومی سطح کے اداروں کی بھی تشکیل کی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ یہ پالیسی اس لیے بھی بہتر ہے کہ اس میں فرسودہ نظام تعلیم کو ختم کرکے نئے انداز میں تعلیم دینے کی بات کی گئی ہے۔ طالب علموں کو بنیادی سطح پر ہی ووکیشنل تربیت دی جائے گی، انھیں کوڈنگ سکھائی جائے گی اور درجہ 6 سے ہی انٹرنشپ کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ کتابی علم سے زیادہ خود سے کرنے اور سیکھنے پر توجہ دی جائے گی، آن لائن نظام تعلیم اور ورچوئل کلاسز کا سسٹم بہتر کیا جائے گا۔ حکومت کا مقصد ہے کہ 2030 تک ملک میں خواندگی کی شرح 100 فیصد تک پہنچائی جائے۔ یہی نہیں 2020 میں اسکول چھوڑ چکے 2 کروڑ بچوں کو دوبارہ اسکول سے جوڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ اعلیٰ تعلیمی نظام میں مضامین منتخب کرنے کی آزادی ہوگی، چنانچہ اگر ہندی، سماجیات یا فلسفے کے ساتھ کوئی حساب یا علم حیوانات پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح علم کیمیا کے ساتھ تاریخ بھی پڑھ سکتا ہے۔ اردو والے اپنی دلچسپی کا کوئی بھی سبجیکٹ منتخب کرسکتے ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں طالب علم خود ہی اپنی جانچ اور تعین قدر کرسکیں گے۔ ایک بہت اچھی بات یہ بھی ہے کہ اس پالیسی میں جی ڈی پی کا 6 فیصد تعلیم پر خرچ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

اس پالیسی کے نفاذ کے بعد ملک کا ایک بڑا طبقہ جو تعلیم سے دور تھا وہ بھی مین اسٹریم سے جڑے گا اور تعلیم کی جانب راغب ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو کسی بھی طرح کے خدشات دل سے نکالنے ہوں گے اور موجودہ حکومت کے تئیں کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر عقیل نے یہ بھی بتایا کہ مہاتما گاندھی انٹرنیشنل یونیورسٹی وردھا کے داخلہ نوٹیفکیشن سے اردو کو حذف کیے جانے کے سلسلے میں ہم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو خط لکھ رہے ہیں کہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کو برقرار رکھا جائے، اسی طرح کونسل کی جانب سے مہاتما گاندھی سینٹرل یونیورسٹی موتیہاری (بہار) کے وائس چانسلر کو بھی خط بھیجا جارہا ہے کہ وہاں شعبۂ اردو قائم کیا جائے کیونکہ اردو ہمارے ملک کی بائیس شڈولڈ زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے، اس نے ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کو سنوارنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے اور ہماری مشترکہ وسیکولر ثقافت کا گراں قدر سرمایہ اس زبان میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ اس حوالے سے جو بھی بحث طلب امور ہیں ان پر میں خود وزیر تعلیم عالی جناب رمیش پوکھریال نشنک جی سے بات کروں گا اور ان سے اردو پر خصوصی توجہ دینے کی گزارش کروں گا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 اگست 2020

’ہندوستان کے قانونی اور انتظامی نظام میں اردو کا رول‘

نئی دھلی: ہندوستان کے عدالتی و انتظامی شعبے میں اردو زبان کا استعمال سیکڑوں برسوں سے ہو رہا ہے اور آج کے دور میں بھی عدالتی کارروائیوں میں بے شمار اردو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں۔ یہ بات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر نے ’ہندوستان کے قانونی اور انتظامی نظام میں اردو کا رول‘ کے عنوان سے منعقدہ آن لائن مذاکرے میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کہی۔ قبل ازاں پروگرام کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عدالتوں میں اردو زبان ایک زمانے سے رائج ہے، مگر موجودہ دور میں اس حوالے سے کچھ دشواریاں سامنے آرہی ہیں اور انھی سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے کے مقصد سے یہ مذاکرہ منعقد کیا گیا ہے۔ انھوں نے دہلی پولیس کے ذریعے ہائی کورٹ میں دی گئی ایک عرضی کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ آج بھی تھانے میں اردو کے بہت سے الفاظ و اصطلاحات رائج ہیں جنھیں ہمارے لیے سمجھنا مشکل ہے لہٰذا ان کے استعمال پر روک لگائی جائے۔ شیخ عقیل احمد نے کہا کہ چوں کہ یہ الفاظ سیکڑوں برس سے عدلیہ و پولیس محکمہ میں مستعمل ہیں اور یہ ہماری مشترکہ تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہیں لہٰذا انھیں ختم کرنے کے بجائے یہ کیا جاسکتا ہے کہ متعلقہ محکموں تک ایسی کتابیں پہنچائی جائیں جن میں ان الفاظ کے تلفظ کی تفصیلات کے ساتھ ان کے ہندی و انگریزی معانی بھی درج ہوں۔ انھوں نے وائس چیئر مین کی تائید کرتے ہوئے کونسل کی جانب سے ایسی کتابوں کی اشاعت کی یقین دہانی کرائی۔ اس آن لائن مذاکرے میں پٹنہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اقبال احمد انصاری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فیکلٹی آف لا کے سابق ڈین پروفیسر محمد شبیر، آئی اے ایس سراج حسین، سپریم کورٹ کے وکیل سدھارتھ لوتھرا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر نعمانی اور دہلی یونیورسٹی فیکلٹی آف لا کے اسسٹنٹ پروفیسر پرکشت سروہی نے مہمان مقررین کی حیثیت سے شرکت کی۔ مقررین نے اپنی تقریروں میں کہا کہ ہندوستان کا عدالتی نظام سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے علاوہ ضلعی عدالتوں تک پھیلا ہوا ہے اور ان میں انگریزی کے علاوہ دیگر مقامی زبانیں بھی استعمال ہوتی ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے۔ مقررین نے یہ بھی کہا کہ ججز اور وکلا ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو آسانی سے سمجھی جاسکے اور یہی وجہ ہے کہ اردو کے الفاظ بھی ہندوستانی عدالتی سسٹم میں ایک زمانے سے رائج ہیں۔ مقررین نے کہا کہ اردو زبان کو مختلف شعبوں میں مسائل کا اس لیے سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اسے ایک مذہب سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ حقیقت کے برخلاف ہے، اردو شروع سے ہی ہندوستان کے ثقافتی تنوع اور اشتراک کی نمائندگی کرتی رہی ہے اور یہ زبان پورے ملک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ انھوں نے دو باتوں پر خصوصی توجہ دلائی، ایک تو یہ کہ ملک بھر کی مختلف یونیورسٹیز میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی اردو تعلیم کا نظم کیا جائے اور دوسری یہ کہ قانون کے نصاب اور قانونی اصطلاحات پر مشتمل اہم کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔ پروگرام کی نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فیکلٹی آف لا کی سابق ڈین اور قومی اردو کونسل کے لیگل اسٹڈیز پینل کی چیئر پرسن پروفیسر نزہت پروین خان نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اخیر میں ڈاکٹر فیضان الرحمٰن (اسسٹنٹ پروفیسر، فیکلٹی آف لا، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے شکریے کی رسم ادا کی۔ اس آن لائن مذاکرے میں کونسل کے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، فیاض احمد، نوشاد منظر کے علاوہ شعبۂ قانون کے بہت سے اساتذہ، طلبہ و اسکالرز شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 اگست 2020

اردو ڈراما کے فروغ کے لیے قومی کونسل ہر ممکن اقدام کرے گی: پروفیسر شاہد اختر

قومی کونسل کے زیر اہتمام ’اردو ڈراما: ہندوستانی سماج وتہذیب‘ پر آن لائن مذاکرہ

نئی دھلی: اردو ڈراما نے ہر دور میں سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور ہندوستان کے تکثیری سماج اور معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر نے قومی کونسل کے زیر اہتمام ’اردو ڈراما: ہندوستانی سماج اور تہذیب‘ کے موضوع پر منعقدہ آن لائن مذاکرے میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ڈراما سب سے بہترین اور موثر میڈیم ہے۔ قبل ازاں مذاکرے کے آغاز میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ڈراما انسانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے ذریعے فنکار سماج میں پائے جانے والے مختلف مسائل کو

پیش کرتے ہیں، اردو ڈرامے کے اندر بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ موجودہ وزیر برائے فروغ انسانی وسائل رمیش پوکھریال نشنک جو خود ایک ادیب ومصنف ہیں، وہ بھی ڈراما سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے ہندوستان کے مشترکہ کلچر کا نمائندہ قرار دیتے ہیں، انھی کی ہدایت پر آج کی یہ مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی ہے۔ اس مذاکرے میں ڈراما سے تعلق رکھنے والی ممبئی، دہلی، جموں وکشمیر اور کولکاتا سے ممتاز شخصیات نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سلیم عارف نے کہا کہ ہندوستانی ڈراما کے آغاز سے ہی اس میں اردو زبان کی شمولیت رہی ہے اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں پیش کیے جانے والے ڈراموں میں بھی اردو زبان کے الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈراما نگار یا ڈراما کے اداکار و ڈائرکٹر دراصل یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسی زبان استعمال کی جائے، جسے عوام آسانی سے سمجھ سکیں اور اردو ایک ایسی زبان ہے جسے کم و بیش پورے ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے۔ مشتاق کاک نے اپنے تجربات کی روشنی میں اردو ڈرامے کے مسائل پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جموں وکشمیر، دہلی، ممبئی و کولکاتا میں انھوں نے جو ڈرامے پیش کیے، ان کے ذریعے ان شہروں اور مقامات کی تہذیب وسماج کی عکاسی کی گئی اور بنیادی طور پر ہر ڈرامے میں کسی نہ کسی قوم، سماج یا معاشرے کی ترجمانی کا عنصر شامل رہتا ہے۔ ممبئی سے زماں حبیب نے مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں ڈرامے کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ حقدار تھا۔ اردو کے ناقدین اور تحقیق کاروں نے ڈراما کے ماحول اور اس کی پیش کش کے بجائے زبان والفاظ پر توجہ دی جس کے نتیجے میں بہت سے اچھے ڈراموں پر بھی گفتگو نہیں ہوسکی۔ معروف ڈائرکٹر و ڈراما نگار ظہیر انور نے کہا کہ کوئی بھی تخلیق سماج اور سماجی پس منظر سے الگ نہیں کی جاسکتی۔ ڈراما ایک حیرت انگیز و آفاقی فن ہے جس میں ہمیشہ معاصر سماج وتہذیب کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اردو ڈرامے میں بھی یہ وصف بخوبی پایا جاتا ہے۔ ترپی پراری شرما

نے قدیم ہندوستانی ڈرامے پر روشنی ڈالتے ہوئے موجودہ دور کے ہندوستانی ڈرامے کی صورت حال کا تجزیہ کیا۔اس حوالے سے انھوں نے نواب واجد علی شاہ کے کردار پر خاص روشنی ڈالی۔ مذاکرے کی نظامت کے فرائض دہلی یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔شرکا مجلس نے کونسل کو یہ مشورہ دیا کہ اردو کے موجودہ بہترین ڈراموں کا ایک انتخاب شائع کیا جائے،جس کی کونسل کے وائس چیئر مین پروفیسر شاہد اختر اور ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے بھر پور تائید کی اور کہا کہ جلد ہی کونسل کی جانب سے پلے رائٹ اور ڈرامے پر ورکشاپ کا بھی انعقاد کیا جائے گا اور اردو ڈرامے کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل ہر ممکن اقدام کرے گی۔اس مذاکرے میں مذکورہ مہمانوں کے علاوہ کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)،ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)،فیاض احمد اور نوشاد منظر وغیرہ شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل،21 جولائی 2020

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ادبی پینل کی آن لائن میٹنگ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے ادبی پینل کی آن لائن میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی، کرنول کے وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔قبل ازاں میٹنگ کا افتتاح کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔انھوں نے تمام مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ کورونا وائرس کی وجہ سے پیدا ہونے والے نازک حالات کی وجہ سے ہم یہ میٹنگ آن لائن اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہماری سرگرمیاں جاری رہیں اور اردو زبان وادب کے فروغ کا سلسلہ رکنے نہ پائے۔اس میٹنگ میں گزشتہ میٹنگ کی تجاویز پر تبادلۂ خیال کے بعد متعدد اہم شعری کلیات اور ادبی کتابوں کی اشاعت پر اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا اور نئے تحقیقی منصوبوں پر بھی غور وخوض ہوا۔شرکا نے اس بات پر زور دیا کہ عام موضوعات کے بجائے کونسل ایسی کتابوں کی اشاعت پر توجہ دے جو غیر معمولی تحقیقی، ادبی وتاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ شرکا نے یہ بھی کہا کہ نئے پروجیکٹ کے طور پر پامال موضوعات کے بجائے ایسے پروجیکٹس کو منظور کیا جائے جن پر موجودہ دور میں کام کرنے کی ضرورت ہے اور جنھیں شائع کرنے سے قارئین کو خاطر خواہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بعض ایسے اہم موضوعات ہیں جن پر اس وقت بھی اردو زبان میں کتابیں یا تو بالکل نہیں ہیں یا بہت کم ہیں،ان موضوعات پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ اردو زبان کا دامن نئے علوم وفنون سے بھی مالا مال ہوسکے۔میٹنگ کے دوران انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے پیش کردہ ایک تجویز بھی زیر بحث آئی کہ انجمن نے اپنے یہاں سے شائع شدہ اٹھارہ نادر اور اہم کتابوں کے حقوق طباعت کونسل کے نام کرنے کی پیش کش کی ہے،شرکا نے کہا کہ ماہرین کے ذریعے ان کتابوں کا جائزہ لینے کے بعد کونسل ان کتابوں کو ضرور شائع کرے۔ڈاکٹر عقیل احمد نے بھی شرکا کی رائے کی تائید کی اور کہا کہ کونسل تجارتی نقطۂ نظر کے بجائے علمی وادبی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتابیں شائع کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔اخیر میں پینل کے چیئر مین پروفیسر مظفر علی شہ میری اور شیخ عقیل احمد نے میٹنگ کے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔میٹنگ میں پروفیسر شمیم حنفی،ڈاکٹر نریش،ڈاکٹر قدسیہ قریشی، پروفیسر قاضی حبیب احمد، پروفیسر شبنم حمید، ڈاکٹر خان حسین رضا، پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر نگلون کندوت وثیل اور کونسل سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اکیڈمک) ڈاکٹر محمد فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) اور محمد انصر (ریسرچ اسسٹنٹ) شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل،29 جولائی 2020

قومی اردو کونسل میں جشن آزادی و پرچم کشائی کی تقریب

نئی دہلی: 74 ویں یوم آزادی کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں جشن آزادی و پرچم کشائی کی تقریب منعقد کی گئی۔جس میں کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے پرچم کشائی کی،اس موقعے پر قومی ترانہ بھی پڑھا گیا۔قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر نے اپنے مختصر خطاب میں تحریک آزادی اور مجاہدین آزادی کی قربانیوں پر

روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہم اپنے وطن عزیز کی آزادی کا چوہترواں جشن منا رہے ہیں جو ہمیں اپنے آبا واجداد اور قائدین کی بیش بہا قربانیوں سے حاصل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جشن آزادی کے اس پر مسرت موقعے پر ہمیں اپنا محاسبہ بھی کرنا چاہیے اور یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنے ملک میں آزادی کے احساس کو پختہ کرنے اور اس کی تعمیر وترقی میں ہر ممکن حصہ لیں گے اور کسی بھی موقعے پر وطن عزیز کی عزت ووقار پر حرف نہیں آنے دیں گے۔انھوں نے اردو زبان اور تحریک آزادی کے باہمی ربط کی طرف خصوصی اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جنگ آزادی کے دوران فرزندان وطن کے دل دماغ میں حصول آزادی کی تڑپ پیدا کرنے میں اردو صحافت اور اردو شاعری نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے،اسی طرح اس دوران مجاہدین آزادی کی زبانوں پر جتنے بھی نعرے ہوتے تھے ان میں سے بیشتر کا تعلق اردو زبان سے تھا،یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کے اندر حب الوطنی اور ہندوستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔وطن سے الفت، ملک اور مٹی سے محبت، اتحاد و یگانگت اور امن و یکجہتی اس زبان کی جبلت میں شامل ہے۔اس زبان کے ادیبوں،شاعروں،صحافیوں اور خطیبوں نے ہر دور میں اپنی قوم اور ملک کی بے مثال خدمت انجام دی ہے اور ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ اس موقعے پر کونسل کے اسٹاف بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل،15 اگست 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

مادری زبانوں کو فروغ دینے کی ضرورت: نائب صدر

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ہند ایم وینکیا نائیڈو نے تعلیم سے انتظامیہ تک مختلف میدانوں میں مادری زبان کا

استعمال کر کے مختلف بھارتی زبانوں کو تحفظ اور فروغ دینے کے لیے کہا۔ علم کی فراہمی: مادری زبان کے موضوع پر ایک آن لائن ویبنار کا افتتاح کرتے ہوئے جس کا انعقاد یونیورسٹی آف حیدرآباد کے تیلگو ڈپارٹمنٹ اور تیلگو اکادمی نے مل کر کیا تھا، جناب نائیڈو نے ہر ریاستی سرکار کی طرف سے متعلقہ سرکاری زبان کو خصوصی طور پر آگے بڑھانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ زبان کسی تہذیب کی شہ رگ ہوتی ہے۔ اس سے لوگوں کی شناخت، ثقافت اور روایات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ موسیقی، رقص، ریت، رواج، تہوار، روایتی علم اور وراثت کو تحفظ دینے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ پرائمری اسکول تک مادری زبان میں تعلیم فراہم کرانے کے بارے میں انھوں نے زور دے کر کہا کہ کوئی زبان تبھی مقبولیت حاصل کرتی ہے جب اسے بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ محض ہماری سوچ ہے کہ کامیابی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب تعلیم انگریزی میں حاصل کی جائے۔ تحقیق سے پتہ لگا ہے کہ جو لوگ اپنی مادری زبان میں ماہر ہوتے ہیں، وہی دوسری زبانیں بھی سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے کہا کہ 2017 تک کے نوبل انعام یافتگان (نوبل امن انعام جیتنے والوں کو چھوڑ کر) وہ شخصیتیں ہیں، جنھوں نے اپنی مادری زبان میں تعلیم مکمل کی۔ اسی طرح دیگر ملکوں کے سروے نے بھی عالمگیریت پر بڑا اثر ڈالا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ جن قوموں نے مادری زبان کو اہمیت دی وہ آج سرفہرست 50 قوموں میں شامل ہیں۔ جناب نائیڈو نے کہا کہ یہ سوچنا بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اگر کوئی انگریزی میں مہارت کا حامل ہے تو وہ جدید تحقیق کرسکتا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اختراع سے متعلق عالمی انڈیکس میں 40 سے 50 سرفہرست ملکوں میں سے تقریباً 90 فیصد وہ ممالک ہیں جن میں تعلیم ان کی مادری زبانوں میں دی گئی۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ بہت سی غیر ملکی اہم شخصیتیں، انگریزی جاننے کے باوجود بھارتیہ سرکردہ شخصیتوں کے ساتھ بات چیت کے دوران اپنی مادری زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ وہ ایسا کر کے عزت نفس کا پیغام دیتی ہیں۔ جدید ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مادری زبانوں کو فروغ دینے کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ پیچیدہ سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کو بھارتی زبانوں میں آسان بنانا چاہیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 جولائی 2020

نئی تعلیمی پالیسی کو منظوری

نئی دھلی: مرکزی کابینہ نے ملک میں اسکولی اور اعلیٰ تعلیم میں غیر معمولی تبدیلی لانے کے لیے تاریخی اور زیرِ انتظار نئی تعلیمی پالیسی کو آخرکار بدھ کو منظوری دے دی۔ نئی تعلیمی پالیسی میں انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کا نام بدل کر وزارت تعلیم کر دیا گیا ہے۔ تقریباً 34 برس کے بعد ملک کو ایک بار پھر نئی تعلیمی پالیسی ملی ہے۔ وزیر اعظم مودی کی صدارت میں آج کابینہ کی میٹنگ میں اس پالیسی کو منظوری دی گئی۔ میٹنگ میں انسانی وسائل کے فروغ کے وزیر ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر نشنک نے کابینہ کی میٹنگ کے بعد نامہ نگاروں کو بتایا کہ آج کا دن تاریخی دن ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میل کا پتھر ثابت ہوگی۔ نئی تعلیمی پالیسی پر تبادلہ خیال کے دوران 2 لاکھ 25 ہزار مشورے آئے۔ ملک کی تاریخ میں نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں اتنے طویل عرصے تک کوئی تبادلہ خیال نہیں ہوا۔ اطلاعات ونشریات کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے اس نئی پالیسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ 34 برس بعد ملک میں نئی تعلیمی پالیسی آئی ہے۔ تعلیم گھر گھر کا موضوع ہے۔ اس پالیسی کو ملک ہی نہیں پوری دنیا میں تعریف ملے گی، آج کا دن تاریخی ہے۔ واضح رہے کہ نئی تعلیمی پالیسی نے 2035 تک اعلیٰ تعلیم میں مجموعی اندراج کے تناسب کو بڑھا کر کم سے کم 50 فیصد کرنے کا ہدف مقرر کیا ہے، جس میں اسکول کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کئی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت متعدد داخلی اور خارجی نظام نافذ کیے گئے ہیں۔ آج کے نظام میں، اگر چار سال انجینئرنگ یا 6 سمسٹرس کے بعد، طلبا کسی وجہ سے آگے تعلیم حاصل کرنے سے قاصر ہوجاتے ہیں تو پھر اس کا کوئی حل نہیں ہوتا لیکن ملٹی پل انٹری اور ایگزٹ سسٹم (متعدد داخلی اور خارجی نظام) میں ایک سال کے بعد سرٹیفکیٹ، دو سال بعد ڈپلوما اور 3 اور 4 سال بعد ڈگری مل جائے گی۔ طلبہ کے مفاد میں یہ ایک اہم فیصلہ ہے۔ اسکول کی تعلیم میں کی گئی تبدیلی کے تحت 6-9 سال کی عمر کے بچوں کے لیے جو عام طور پر 1-3 کلاسوں میں ہوتے ہیں۔ ایک قومی مشن شروع کیا جائے گا تاکہ بچے بنیادی خواندگی اور اعداد کو سمجھ سکیں۔ اسکولی تعلیم کے لیے خصوصی تعلیم نصاب 5+3+3+4 نافذ کیے گئے ہیں۔ اس کے تحت 3-6 سال کا بچہ اسی طرح تعلیم حاصل کرے گا، تاکہ اس کی بنیاد خواندگی کی صلاحیت اور اعداد و شمار میں اضافہ کیا جاسکے۔ اس کے بعد مڈل اسکول یعنی 6-8 کلاس میں، مضمون کا تعارف کرایا جائے گا۔ کلاس 6 کے بعد سے بچوں کو کوڈنگ کی تعلیم دی جائے گی۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت، 3-6 سال کے درمیان تمام بچوں کے لیے معیاری ابتدائی بچپن کی دیکھ بھال اور تعلیم کو یقینی بنانے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 جولائی 2020

اردو کو جدید ٹکنالوجی اور بدلتے حالات سے ہم آہنگ کرنا ضروری: ڈاکٹر عقیل احمد

نئی دھلی: اردو ایک زندہ زبان ہے۔ اسے جدید ٹکنالوجی اور بدلتے حالات سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان یوں تو پہلے سے اس سمت میں کام کر رہی تھی، اب کورونا اور لاک ڈاؤن کے عواقب کو نظر میں رکھتے ہوئے مزید شدت سے فروغ اردو کی کوششوں کو ٹکنالوجی کی مدد سے جاری و ساری کرنے کا

ارادہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں آن لائن سمینار، ویبینار کے علاوہ آن لائن مشاعرے بھی منعقد کرنے کا ارادہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے آئیڈیا کمیونی کیشنز، تسمیہ ایجوکیشنل وسوشل ویلفیئر سوسائٹی اور دی پین فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام سالانہ مشاعرہ جشن چراغاں کی آن لائن مشاعرہ کے نقش ثانی سے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اپنے صدارتی کلمات میں معروف سماجی شخصیت اور تسمیہ کے چیئر مین اور آئیڈیا کے وائس چیئر مین ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ جشن چراغاں کے ذریعے نہ صرف محبت اور خدمت انسانیت کا پیغام ساری دنیا میں جا رہا ہے بلکہ باذوق افراد کو اچھی شاعری اور ادب سننے اور سامعین کی پذیرائی سے حوصلہ پاکر شعرا کو اچھا ادب تخلیق کرنے کا موقع بھی مل رہا ہے۔ کویت کے معروف این آر آئی بزنس مین اور سماجی کارکن عرفان کریم نے بحیثیت مہمان اعزازی اپنے خطاب میں ملک عزیز ہندوستان کی سیکولر روایات کی حفاظت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ کام شعرا اور ادبا بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ انھوں نے جشن چراغاں کی پہل کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہاں اردو، ہندی اور بھوجپوری سبھی زبانوں کے شعرا کو مدعو کرکے اچھا پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئیڈیا کے ڈائرکٹر آصف اعظمی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ جشن چراغاں کا مقصد ادب کی خدمت کے علاوہ وبائی نحوست کے اس دور میں دلوں میں خوشیوں کا چراغ جلانا اور گھروں میں بیٹھے سامعین کو صاف ستھری تفریح مہیا کرنا ہے۔ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر پرکھر مالویہ کانہا نے انجام دیے۔ اس موقعے سے جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا، ان میں ڈاکٹر اے عبداللہ (امریکہ)، شیرازی مہدی ضیا (سعودی عرب) اور ہندوستان سے پروفیسر جتیندر سریواستو، سید راشد حامدی، عرفان احمد، اعظم عباس شکیل، ارشد ندیم، عزم شاکری، سنتوش پٹیل، آشکارا خانم کشف، عامر سلیم خان، سلمان فیصل اور تالیف حیدر شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جولائی 2020

دھلی

منشی پریم چند کی 140 ویں سالگرہ

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے منشی پریم چند کی 140 ویں سالگرہ کے موقعے پر انھیں یاد کیا۔ منشی پریم چند کا جامعہ سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنے صدی سال میں داخل ہو چکی ہے اور یہ جامعہ کے لیے افتخار کی

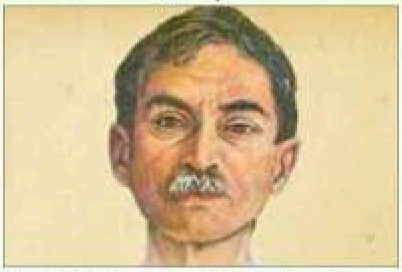

بات ہے کہ پریم چند کے نام سے موسوم سینٹر کے ذریعے جامعہ نے اپنی تاریخ کو سمیٹ کر رکھا ہے۔ منشی پریم چند کو جامعہ سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے اپنا مشہور زمانہ افسانہ 'کفن' جامعہ میں کنویں کے منڈیر پر بیٹھ کر لکھا تھا۔ یہ کہانی انھوں نے ذاکر حسین جو اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے کی گزارش پر تحریر کی تھی جو رسالہ جامعہ میں پہلی مرتبہ دسمبر 1935 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

پریم چند کی حیثیت عالمی تاریخ میں انفرادیت رکھتی ہے کیونکہ انھیں دو زبانوں (اردو اور ہندی) اور ان کی ادبی روایات کا امین اور سرخیل مانا جاتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنی فکر اور تاریخ سے وابستہ روایت وثقافت اور اثاثہ جات کو باقی رکھنے کے لیے 2006 میں پریم چند آرکائیوز سینٹر کا قیام عمل میں لایا تھا۔ مذکورہ سینٹر کی ڈائرکٹر پروفیسر صبیحہ زیدی کے بقول اس ادارہ کے مقاصد میں پریم چند کی باقیات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ان کی میراث کو آنے والی نسلوں تک بطرز احسن پہنچانا ہے۔ وہ کہتی ہیں اس میں پریم چند سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، مخطوطات، تصاویر، ان کے کام، ان پر ہونے والے کام نیز ترجمے وغیرہ کو اکٹھا کرکے محفوظ کرنا شامل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پورے ملک میں اپنی نوعیت کا واحد مرکز ہے جو اپنے مقصد کی تکمیل میں بہت حد تک کامیاب ہے اور جامعہ سے متعلق نادر و نایاب چیزیں اس مرکز میں محفوظ ہیں۔

پریم چند کے مطالعے اور تحقیق کی اس وراثت میں سب سے اہم کام پریم چند کی کہانیوں پر مشتمل کلیات کی اشاعت ہے، جن کی تعداد 301 ہے، یہ کام گذشتہ کئی سالوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ انگریزی کے ذریعے ان کے کام کا انگریزی ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ پروفیسر ایم اسدالدین کی سربراہی میں اس بڑے کام میں کم و بیش 61 مترجمین حصہ لے چکے ہیں اور اب تک تقریباً سو کہانیوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز'، دہلی 1 اگست 2020

اردو اساتذہ اور اسکولوں کے مسائل

نئی دھلی: اکھل دلی پراتھمک شکشک سنگھ کے تحت اردو اساتذہ اور اسکولوں کے مسائل اور ان کی ترقی کے موضوع پر ایک ویبنار کا انعقاد کیا گیا۔ اس ویبنار کی نظامت کی ذمے داری اردو استاد واحد علی اور خورشید مزمل نے کی جس میں احمد عبداللہ کا اہم رول رہا۔ ویبنار کی صدارت اے ڈی پی ایس ایس کے قومی جنرل سکریٹری رام چندر ڈباس نے کی جبکہ پروگرام کے افتتاحی کلمات دابیا نے ادا کیے۔ پروگرام میں مہمان خصوصی جنوبی دہلی میونسپل کارپوریشن کی میئر انامیا کا متھلیس بطور خاص موجود رہیں۔ ویبنار کا مقصد اے ڈی پی یو ایس ایس سے اردو اور خصوصاً مسلم اساتذہ کو جوڑنا اور ان کے مسائل کو حل کرنا ہے۔ پروگرام کو تکنیکی طور پر نیل کمل اگروال نے عمل پیرا کیا۔ ویبنار میں جن حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں سینئر ٹیچر واحد علی، خورشید مزمل، فیروز اختر، محمد ساجد، اسداللہ، صبیحہ اختر، نکہت فاطمہ، روشن تنویر وغیرہ شامل ہیں۔ اردو اساتذہ کے لیے مستقبل کا لائحہ عمل گری راج شرما، اور احمد عبداللہ نے پیش کیا۔ ویبنار میں تمام مسائل اور ان کے حل پر بولتے ہوئے اے ڈی پی ایس ایس کے صدر اروند مشرا نے کہا کہ اردو اساتذہ کے جو بھی مسائل ہیں، ان کا ہر سطح پر حل کیا جائے گا اور اردو اسکول اور اساتذہ کو وہی اہمیت اور ترقی دی جائے گی جو ہندی اسکولوں کو دی جاتی ہے۔ انھوں نے اردو میڈیم اسکولوں کو سینئر سیکنڈری سطح تک دوبارہ قائم کرنے کی بھی یقین دہانی کرائی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جولائی 2020

فرانسیسی ڈائس پورہ میں عربی ادب

نئی دھلی: عربی ادب نے نہ صرف فرانسیسی ادب کو متاثر کیا ہے، بلکہ یوروپ کی دیگر زبانوں اور ادب پر بھی گہرا اثر چھوڑا ہے، مشرقی علوم وفنون جیسے طب، ریاضیات، فلسفہ، ادب وغیرہ عربی زبان کے واسطے سے ہی یوروپ تک پہنچے ہیں، کلیلہ ودمنہ اور الف لیلہ جیسی شاہکار کتابوں سے یوروپی ادب نے خوب استفادہ کیا ہے۔ان خیالات کا اظہار ممتاز ماہر تعلیم اوراوری وسوربون یونیورسٹی، پیرس کی پروفیسر ڈاکٹر امیرہ عبدالعزیز نے ایک روزہ بین الاقوامی ورچوئل سیمنار میں کیا جسے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات، جے این یو نئی دہلی نے اکسیلینس اکادمی، انڈیا اور عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن، لندن کے مشترکہ تعاون سے منعقد کیا تھا۔اس سے قبل پروگرام کے ڈائریکٹر، ہندوستان میں عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن، کے برانچ آفس کے سربراہ وشعبۂ عربی جے این یو کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمن نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اور عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن،لندن کے اہداف ومقاصد بیان کیے۔

افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے مشہور شاعرہ، رائٹر اور عالمی تخلیقی تنظیم برائے امن، لندن کی بانی وصدر محترمہ وفا عبدالرزاق نے کہا کہ عالمی تخلیق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تخلیق کار انسانیت جیسی اعلیٰ قدر سے متصف ہو اور اس کا ذہن وقلم ہر قسم کی عصبیت سے خالی ہو، انھوں نے مزید کہا کہ 'الف لیلہ' ایک ایسا شاہکار ہے، جس سے شیکسپیئر بھی متاثر ہوئے ہیں۔ الجزائر کے ناول نگار، مشہور ماہر تعلیم وسوربون یونیورسٹی، پیرس کے پروفیسر ڈاکٹر واسینی اعراج نے 'تاریخی ناول نگاری کا ذاتی تجربہ' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان میں تاریخی ناول کو فروغ دینے میں جرجی زیدان نے کلیدی کردار ادا کیا ہے، انھوں نے 22 سے زائد تاریخی ناول لکھے، موجودہ دور میں اس صنف کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس سال عربی کا مین بوکر پرائز بھی تاریخی ناول ہی کو ملا ہے۔انھوں نے مزید کہا کہ تاریخی ناول میں ماضی کے عناصر ضرور ہوتے ہیں، لیکن وہ عصر حاضر کا ترجمان ہوتا ہے۔ قابل غور ہے کہ اس ورچوئل سیمنار میں عرب، افریقہ، انڈونیشیا، ملیشیا اور ہندوستان سے چار سو سے زائد اساتذہ، ریسرچ اسکالر اور طلبہ نے حصہ لیا۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جولائی 2020

شاعری اور معاشرہ

نئی دھلی: 25 جولائی کو آل انڈیا ایسوی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالرس کے زیر اہتمام اکیڈمی آف اکسیلینس انڈیا کے اشتراک وتعاون سے زوم ایپ کے ذریعے شاعری اور معاشرہ کے موضوع پر ایک لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں مقرر کی حیثیت سے جامعہ ازہر (مصر) کے تنقید وادب کے سینئر استاد پروفیسر علا احمد نے شرکت کی اور شاعری اور معاشرہ کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے آغاز میں اکادمی آف اکسیلینس انڈیا کے روح رواں ڈاکٹر صابر نواس نے مہمانوں اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور اسکالرس کا استقبال کرنے کے بعد آل انڈیا ایسوی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالرس کے صدر اور سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر حبیب اللہ خان کو افتتاحی کلمات پیش کرنے کی دعوت دی۔ موصوف نے اپنے افتتاحی کلمات میں تمام شرکا اور مہمان خطیب، مہمان خصوصی کا استقبال کیا اور اپنے استاذ پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کو یاد کرتے ہوئے سب سے دعائے مغفرت کی درخواست کی اور ان کے لیے سب نے دعا کی۔ پروفیسر خان نے خطیب محترم اور اس پروگرام کے مہمان خصوصی جامعہ ازہر (مصر) کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر احمد عبدالرحمن قاضی کا تعارف پیش کیا اور ان دونوں حضرات کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ لیا۔ اس موقعے پر صدر آل انڈیا ایسوی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالر نے ڈاکٹر صابر نواس کا اس پروگرام کو منعقد کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا اور اس طرح کے پروگرام منعقد کرنے کے لیے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے عربی زبان وادب کے اساتذہ کو مبارکباد پیش کی۔ یہ آن لائن لیکچر گذشتہ لیکچرس سے اس حیثیت سے منفرد تھا کہ اس پروگرام کے ناظم ڈاکٹر صابر نواس مہمان محترم سے شعر وادب اور اس کے معاشرہ پر اثرات کے متعلق سوالات کرتے تھے اور موصوف بہت ہی خوبصورت انداز میں جوابات دیتے تھے۔ ڈاکٹر صابر نے شرکا سے بھی سوالات کرنے کی درخواست کی اور ہندوستان اور بیرون ملک کے عربی زبان وادب کے اساتذہ اور اسکالرس نے سوالات کیے جن کے جوابات مہمان خطیب نے تفصیل سے دیے۔ پروگرام میں مہمان خصوصی پروفیسر احمد عبدالرحمن قاضی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان میں اپنی طالب علمی کے گزرے ہوئے دنوں کا تذکرہ کیا اور شعر وادب کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے آخر میں آل انڈیا ایسوی ایشن آف عربک ٹیچرز اینڈ اسکالر کے جنرل سکریٹری پروفیسر رضوان الرحمن نے مہمان خطیب، مہمان خصوصی، منتظمین اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس پروگرام میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ، کویت، مصر، مراکش، ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ کے عربی زبان وادب کے تقریباً 300 اساتذہ اور اسکالرس نے شرکت کی۔

روز نامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 جولائی 2020

اترپردیش

مرادآباد میں غزل کا سفر

مرادآباد: مرادآباد لٹریری کلب کے زیر اہتمام مرادآباد کے معروف محقق اور ناقد ڈاکٹر محمد آصف حسین کی تازہ ترین تصنیف 'مرادآباد میں غزل کا سفر' پر آن لائن مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مقامی ادیبوں کے علاوہ بیرونی ادیبوں نے بھی شرکت کی، کتاب کی اہمیت وافادیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ واضح رہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر آصف کی اردو تصنیف 'تذکرہ شعرائے مرادآباد' کا ماحصل ہے جو دیوناگری رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر عارف حسن خان سابق صدر شعبہ اردو ہندو کالج مرادآباد نے کہا کہ اگر آپ علمی وادبی ثقافتی تاریخ کے تعلق سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر آصف سے بے جھجک رجوع کر سکتے ہیں۔ان سے آپ کو مستند معلومات حاصل ہوگی۔ڈاکٹر عابد حسین حیدری (پرنسپل ایم ایم کالج سنبھل) نے کہا کہ ڈاکٹر آصف نے کتاب کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے، انھوں نے کتاب کو چار صدیوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر صدی کے ان تمام شاعروں کی فہرست دی ہے جن کے نام انھیں دستیاب ہو سکے۔ پھر صدی کے معروف شاعروں کے مختصر حالات اور اشعار دیے ہیں اور پھر ہر صدی کے ایک نمائندہ شاعر کا انتخاب کیا ہے جیسے سترہویں صدی میں حضرت شاہ بلاقی جن کے دوہے ملتے ہیں، اٹھارویں صدی میں راجہ نول رائے وفا جو مرادآباد میں غزل کے پہلے شاعر ہیں، انیسویں صدی میں ذکی مرادآبادی اور بیسویں صدی میں جگر مرادآبادی۔ معروف نوگیت کار ڈاکٹر مہیشور تواری نے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہر جگر میں ڈاکٹر آصف صاحب نے یہ کتاب تیار کر کے ایک اہم قدم بڑھایا ہے۔ معروف شاعر ضمیر درویش نے کہا کہ اس کتاب میں بہت سے ادبی موتیوں کو بغیر کسی مصنوعی پالش کے پیش کیا گیا ہے۔ منصور عثمانی نے کہا کہ مرادآباد کے خاموش قلم کار، ایماندار مورخ اور ہونہار ادیب ڈاکٹر آصف نے یہ کتاب تصنیف کر کے بجائے خود ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔

طنز ومزاح کے شاعر مکھن مرادآبادی نے کہا یہ ایک

بڑا کام ہے جسے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر اجے انوپم نے کہا کہ یہ کتاب مراد آباد کی چار صدیوں کی تاریخ کا ادبی روزنامچہ ہے۔ مشہور شاعر کرشن کمار ناز نے کہا کہ یہ کتاب جگر سے پہلے کی مکمل شعری روایت کا احاطہ کرتی ہے۔ مشہور شاعر ڈاکٹر مجاہد فراز نے کہا کہ اس کتاب سے ثابت ہوگیا کہ مراد آباد صرف پیتل کی چمک ہی نہیں لٹاتا بلکہ ادب کی خوشبو بھی اس کی بنیادوں میں شامل ہے۔ ڈاکٹر منوج رستوگی نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اردو کے علاوہ ہندی کے ریسرچ اسکالرز کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی اور وہ اسے نظرانداز نہیں کرسکتے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 21 جولائی 2020

مدھیہ پردیش

انتساب پبلی کیشنز کی جانب سے آن لائن افسانوی نشست

سرونج: انتساب پبلی کیشنز اور سدبھاؤنا منچ کے زیراہتمام ایک آن لائن افسانوی نشست منعقد کی گئی۔ اس پروگرام میں آٹھ افسانہ نگاروں نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت سینئر افسانہ نگار عبدالستار نے کی اور نظامت کے فرائض استوتی اگروال نے انجام دیے۔ محمد قمر سلیم (ممبئی) نے اپنا افسانہ 'خواہش ناتمام' پیش کیا جو ایک عورت کی زندگی پر مشتمل تھا جس کے مرکزی کردار 'صنوبر' اور 'عادل' تھے۔ استوتی اگروال (سرونج) نے افسانہ 'مایوسی' پیش کیا جو ایک حساس دل لڑکی کے اردگرد گھومتا ہے۔ وسیم عقیل شاہ (جلگاؤں) نے 'آشواسن' پڑھا جس میں مزدور طبقے کی عکاسی کی گئی تھی۔ ارشد منیم (پنجاب) نے افسانہ 'انسانیت' سنایا جو قومی یکجہتی پر مشتمل تھا۔ محمد علیم اسماعیل (مہاراشٹر) کا افسانہ 'رنجش' عائشہ صدیقی نے پڑھا۔ سید اسماعیل گوہر نے افسانہ 'شکوہ' سنایا۔ طاہر انجم صدیقی (مالیگاؤں) نے 'باپو کا کا' پڑھا۔ آخر میں سبھی حاضرین، ناظرین اور سامعین کا اس پروگرام میں شرکت کرنے اور کامیاب بنانے کے لیے انتساب پبلی کیشنز اور سدبھاؤنا کی جانب سے استوتی اگروال نے شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: استوتی اگروال، سرونج، 30 جولائی 2020

اعزاز واکرام

کمل دیوبندی

دیوبند: راشٹریہ ایکتا امبیڈکر سوسائٹی دیوبند کی جانب سے تعلیم وتحریر کے میدان میں طویل خدمات کے پیش نظر سید وجاہت شاہ عرف کمل دیوبندی کو شال پیش کی گئی۔ اس موقعے پر پروگرام کی صدارت کررہے سوسائٹی کے بانی نواب اختر نے کہا کہ کمل دیوبندی 1976 سے اردو ہندی، انگریزی کے مختلف اخبارات ورسائل میں 1100 کے قریب مضامین، تبصرے، خطوط تحریر کرچکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کی 9 کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں جن میں دیوبند گورو، تذکرہ خانوادہ شاہی، تحریر شاہی، وکیتی جو وشیش اور شاہ پریوار قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل انھیں مختلف تنظیموں کے ذریعہ 50 سے زائد اعزازات حاصل ہوچکے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کمل دیوبندی نے اپنے خاندان کی علمی وتحریری روایات کو برقرار رکھا اور اپنے والد ماجد سید ازہر شاہ قیصر اور برادر اکبر مولانا نسیم اختر شاہ قیصر کی قلمی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ اس موقعے پر صحافی ممتاز احمد نے کہا کہ کمل دیوبندی نے دونوں زبانوں میں بھرپور لکھا ہے اور توازن برقرار رکھا ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ اپنی کتابوں کے ذریعہ دیوبند کے اکابرین، صحافی، شعرا، عوامی خدمت گار اور تعلیم کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دینے والی شخصیات کو متعارف کرانا اور زندہ رکھنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر فیصل نورشبو، شاہ فیصل مسعودی، ارشد صدیقی، نبیل مسعودی، وجاہت انور وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 1 اگست 2020

رسم اجرا

سرسید اکیڈمی کی دو کتابوں اور قدیم اکیڈمک کیلنڈر کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے سرسید اکیڈمی کے ذریعے شائع کی گئی دو کتابوں اور ایک تاریخی اکیڈمک کیلنڈر کا آج آن لائن اجرا کرتے ہوئے کہا کہ ان کی یہی کوشش ہے کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک پر جو بھی مواد دستیاب ہے اسے شائع کیا جائے، ساتھ ہی سرسید اکیڈمی کے سبھی دستاویز ڈیجیٹائز کیے جائیں۔ وائس چانسلر نے اے ایم یو کے صدی سال پر جن کتابوں کا اجرا کیا ان میں سرسید کی مشہور کتاب 'تبیین الکلام' کا کرسچین ڈبلیو ٹرال کے ذریعے کیا گیا انگریزی ترجمہ اور کرسچین ڈبلیو ٹرال کی کتاب 'سید احمد خاں: اے ری انٹرپریٹیشن آف مسلم تھیولوجی' اور ایم اے او کالج کا 12-1911 کا اکیڈمک کیلنڈر جسے سرضیاء الدین نے تیار کیا تھا، شامل ہیں۔ پروفیسر منصور نے کہا کہ میڈیکل کالج کا قیام سرضیاء الدین کا خواب تھا اور انھوں نے اپنی وائس چانسلرشپ کے دور میں ہی قلعہ روڈ پر اس کا سنگ بنیاد رکھ دیا تھا۔ سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر علی محمد نقوی نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے اکیڈمی کی سرگرمیوں اور اشاعتی منصوبہ کا ذکر کیا۔ یوجی سی، ایچ آر ڈی سنٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے ٹرال کے ذریعے ترجمہ کی گئی کتاب 'تبیین الکلام' کا بھرپور تعارف کراتے ہوئے کہا کہ بائبل پر کسی مسلم اسکالر کی یہ پہلی تفسیر ہے اور کتاب کے عنوان سے ہی واضح ہوجاتا ہے کہ یہ بین مذاہب ڈائیلاگ کی سمت بھی ایک اہم قدم ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ کتاب ادیان و مذہبی عقائد کے سلسلہ میں سرسید کے احترام کا بھی ثبوت ہے۔ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار نے ٹرال کی کتاب 'سید احمد خاں: اے ری انٹرپریٹیشن آف مسلم تھیولوجی' پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ٹرال نے یہ کتاب لندن یونیورسٹی سے 1975 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1978 میں جب وہ وِدیا انسٹی ٹیوٹ آف ریجنس اسٹڈیز، دہلی میں اسلامی علوم کے پروفیسر تھے، شائع کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ 1937 میں برلن (جرمنی) میں پیدا ہوئے ڈاکٹر ٹرال متعدد بار اپنی تحقیق کے سلسلے میں اے ایم یو تشریف لائے تھے۔ 2018 میں ٹرال کو سرسید انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا اور 2020 میں ان کی کتاب دوبارہ شائع ہوئی ہے جس کے لیے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور اور سرسید اکیڈمی کے ڈائرکٹر پروفیسر علی محمد نقوی اور ان کے رفقا مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سرسید اکیڈمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شاہد نے اکیڈمی کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی یہ کوشش ہے کہ صدی تقریبات کے موقعے پر متعدد کتابیں شائع کی جائیں۔ انھوں نے بھی مقررین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید حسین حیدر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 جولائی 2020

وفیات

ابراہیم القاضی

نئی دھلی: ہندوستانی تھیٹر کی شہرہ آفاق شخصیت ابراہیم القاضی طویل علالت کے بعد 4 اگست سہ پہر کو یہاں کے پرائیوٹ اسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئے۔ وہ 95

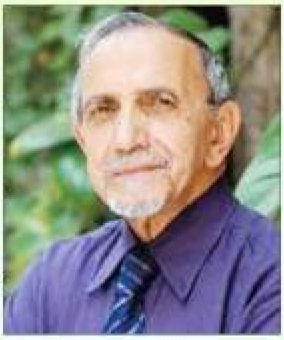

سال کے تھے اور برسوں سے الزائمر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا فیصل القاضی اور بیٹی اہل الاناہیں۔ نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے ڈائرکٹر سریش شرما اور سابق ڈائریکٹر دیویندر راج انکور، ستیش آنند، رویندر ترپاٹھی سمیت متعدد فنکاروں اور تھیٹر کے نقادوں نے القاضی کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

وزیراعظم نریندر مودی نے بھی جدید ہندوستانی تھیٹر کی اہم شخصیت ابراہیم القاضی کے انتقال پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور کہا کہ انھوں نے پورے ملک میں تھیٹر کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مودی نے ٹوئٹ کر کے القاضی کے انتقال پر غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر القاضی نے تھیٹر کو مقبول بنایا اور اسے ملک میں پھیلایا۔ اس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر القاضی نے آرٹ اور ثقافت کے شعبہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے انتقال سے مجھے گہرا دکھ ہوا اور میں غم کی اس گھڑی میں ان کے اہل خانہ کے ساتھ ہوں۔ ایشوران کی روح کو شانتی دے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 اگست 2020

پروفیسر افصح ظفر

نئی دہلی: معروف ترقی پسند ادیب اور اردو کے ممتاز و جید ناقد پروفیسر افصح ظفر کا شہر گیا میں 2 اگست کو انتقال ہوگیا۔ ان کا شمار پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر عقیل رضوی اور پروفیسر شارب ردولوی جیسے اہم ناقدین کی صف میں ہوتا ہے۔ مغربی ادبیات

بالخصوص مغربی تنقید پر پروفیسر افصح ظفر کی گہری نظر تھی۔ بساطِ نقد، نخزن ادب اور کلچر ادب اور جنگ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ پروفیسر افصح کو مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ اردو ادب کے علاوہ انگریزی کتابوں کا وہ پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ پروفیسر افصح ظفر شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے پہلے پی ایچ ڈی سند یافتہ تھے۔ انھوں نے پروفیسر محمد حسنین کی نگرانی میں 'اکبر الہ آبادی کا سیاسی وسماجی شعور' موضوع پر اپنا مقالہ لکھا تھا۔

ان کے اندر تنقیدی بصیرت کے ساتھ ادارتی صلاحیتیں بھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کلام حیدری کے بعد بہ حسن وخوبی ماہنامہ 'آہنگ' کی ادارتی ذمے داریاں ادا کیں۔ واضح رہے کہ 31 جولائی بروز جمعہ ساڑھے پانچ بجے شام ان کی رہائش گاہ وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ گیا میں ان کا انتقال ہوا۔ یکم اگست کو ان کی تدفین کریم گنج قبرستان میں ہوئی۔ ان کی پیدائش 22 اکتوبر 1933 کو ہوئی تھی۔ پسماندگان میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ دونوں بیٹے اریب افصح اور شکیب افصح امریکہ میں مقیم ہیں اور بیٹی بہارینہ افصح بھوپال میں رہائش پذیر ہیں۔ پروفیسر افصح ان دنوں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنّفین اردو کے کارگزار صدر تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اگست 2020

راحت اندوری

اندور: معروف شاعر راحت اندوری کا کورونا سے متاثر ہونے کے بعد ایک پرائیویٹ اسپتال میں علاج کے دوران 11 اگست کو انتقال ہوگیا۔ وہ 70 برس کے تھے۔ راحت اندوری دل کے عارضہ، گردے کی تکلیف اور ذیابیطس جیسی

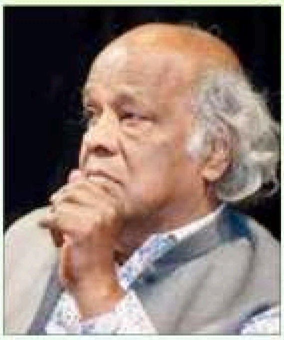

بیماریوں میں مبتلا تھے۔ مسٹر راحت اندوری کے انتقال کی خبر سے اندور سمیت ملک اور دنیا میں ان کے مداحوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ پسماندگان میں 4 بچے ہیں۔ ٹوئٹر پر اپنے آخری ٹوئٹ میں راحت اندوری نے مداحوں کو کورونا ٹیسٹ مثبت آنے اور اسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے دعائے صحت کے لیے اپیل کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ اپنی صحت کے بارے میں ٹوئٹر پر ہی آگاہ کرتے رہیں گے، تاہم انھیں اجل نے مہلت نہ دی۔

راحت اندروی کی غزلیں اور نظمیں زبان زد عام تھیں اور انھیں ہند-پاک میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ راحت اندوری مقامی کالج میں درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے۔ وہ دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور میں اردو ادب کے پروفیسر بھی رہے۔ راحت اندوری ایک مصور بھی تھے اور انھوں نے شاعری کے علاوہ فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔ انھوں نے منا بھائی ایم بی بی ایس، مینا کشی، خوددار، ناراض، مرڈر، مشن کشمیر، قریب، بیگم جان، گھاتک، عشق، جانم، سر، آشیاں اور میں تیرا عاشق جیسی فلموں میں گیت لکھے۔

راحت اندوری کی پیدائش اندور میں یکم جنوری 1950 کو ایک ٹیکسٹائل مل کے ملازم رفعت اللہ قریشی اور مقبول النسا بیگم کے یہاں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم نوتن اسکول اندور میں ہوئی۔ انھوں نے اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے 1973 میں اپنی بیچلر کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد 1975 میں راحت اندوری نے برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ 1985 میں انھوں نے مدھیہ پردیش کی مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ راحت اندوری ایک اچھے شاعر اور گیت کار ثابت ہوئے۔ ممتاز شاعر کے انتقال پر اعلیٰ حکومتی حکام، ادبی شخصیات اور شوبز ستاروں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ان کے دنیا سے چلے جانے کو علم وادب کا بڑا نقصان قرار دیا۔ ان کے انتقال میں سیاسی، سماجی اور ادبی دنیا کے لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا، جن میں کانگریس کے سابق صدر راہل گاندھی، مرکزی وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ، مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان، مدھیہ پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ کمل ناتھ سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 اگست 2020

نصرت ظہیر

نئی دہلی / سہارنپور: مشہور صحافی اور مزاح نگار روزنامہ 'انقلاب' کے معروف کالم نگار نصرت ظہیر کا طویل علالت کے بعد 68 برس کی عمر میں 22 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ گو کہ وہ دہلی میں رہائش پذیر تھے لیکن آج کل اپنے آبائی وطن سہارنپور میں مقیم تھے۔ وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔ نصرت ظہیر ایک عرصے سے صاحب فراش تھے۔ ان کے انتقال سے طنز و مزاح کی صحافت کا ایک باب بند ہوگیا ہے۔

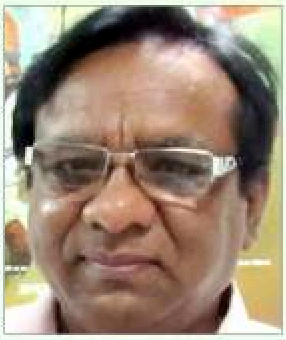

پسماندگان میں اہلیہ اور چار بیٹیاں ہیں۔ 'بقلم خود'، 'تحت اللفظ' اور 'خراٹوں کا مشاعرہ' کے مصنف نصرت ظہیر نے ایک سہ ماہی 'ادب ساز' بھی نکالا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل

کے سہ ماہی رسالے 'فکر و تحقیق' کی اعزازی ادارت کی ذمے داری بھی ادا کی۔ مرحوم کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ترجمے پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یوپی اردو اکیڈمی اور دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے بھی وہ اعزاز یافتہ تھے۔ نصرت ظہیر نے روزنامہ 'قومی آواز'، روزنامہ 'سہارا'، دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کو بھی اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ 'انقلاب' کے لیے وہ ہفتہ واری کالم 'نمی دانم' صاحب فراش ہونے سے پہلے تک مستقل لکھتے رہے، جو کافی مقبول تھا۔ ان کے انتقال کی خبر سے ادبی اور صحافتی حلقے صدمے میں آگئے ہیں۔ نصرت ظہیر تقریباً 40 برس قبل سہارنپور سے دہلی ہجرت کر گئے تھے۔ ہندوستان میں مجتبیٰ حسین کے بعد مزاح نگاروں میں انہی کا نام آتا تھا۔ وہ اپنے کالم میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ شامل کر دیا کرتے تھے۔ ان کا شمار عمدہ شعرا میں بھی ہوتا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جولائی 2020

خان لطیف محمد خان

حیدرآباد: حیدرآباد کے معروف اردو روزنامہ 'منصف' کے ایڈیٹر ان چیف خان لطیف محمد خان کا رات دیر گئے

شکاگو میں 7 اگست کو انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں اہلیہ، فرزندان وسیم محمد خان اور ڈاکٹر اسلم محمد خان کے علاوہ چار دختران موجود ہیں۔ خان لطیف محمد خان پندرہ روز قبل ہی حیدرآباد سے شکاگو روانہ ہوئے تھے۔ وہاں اچانک طبیعت بگڑ گئی اور قلب پر حملہ کے باعث انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے ساتھ ہی اردو صحافت کا چمکتا ستارہ غروب ہوگیا۔ مرحوم روزنامہ منصف اخبار کے ذریعہ اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ خان لطیف محمد خان کا انتقال اردو صحافت کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ انھوں نے 23 سال قبل روزنامہ 'منصف' کو عصری تقاضوں سے لیس کرتے ہوئے اردو صحافت کو بلندی پر پہنچایا۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 8 اگست 2020

کریم رضا مونگیری

کلکتہ: بزرگ اردو صحافی اور روزنامہ عکاس کے ایڈیٹر و مالک کریم رضا مونگیری کا 25 جولائی کو علی الصبح انتقال ہوگیا۔ وہ 75 برس کے تھے۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور

داماد ہیں۔ اہل خانہ کے مطابق گذشتہ ایک ہفتے سے ان کی طبیعت علیل چل رہی تھی۔ اردو کے صحافتی، ادبی اور علمی حلقے کریم رضا مونگیری کے اچانک جدا ہونے سے سخت صدمے میں ہیں۔ مرحوم کے بھتیجے و داماد کاشف رضا مونگیری نے بتایا کہ کریم صاحب کو کوئی ایک ہفتے سے بخار تھا۔ مجموعی طور پر ان کی حالت مستحکم تھی اور معالج کے نزدیک تشویش کی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ کمزوری کافی بڑھ گئی تھی۔ کریم رضا مونگیری اپنی زندگی کی چھٹی دہائی سے بیٹے اور داماد کے سرپرست بنے ہوئے تھے۔ بنگال کی اردو صحافت میں ان کی حیثیت ایک ستون کی تھی۔ روزنامہ 'عکاس' نے ان کی ادارت میں گولڈن جبلی منایا۔ یہ اخبار گذشتہ 55 برسوں سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ کلکتے کے اردو اخبارات میں اشاعت کے اعتبار سے عکاس کی حیثیت ایک انسٹی ٹیوشن کی تھی۔ یہاں سے وابستہ کئی صحافیوں نے قومی صحافت میں اپنی شناخت بنائی اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر مشہور ہوئے۔ کریم رضا مونگیری نے اپنے اخبار کو تجارتی اعتبار سے نہ صرف مستحکم کیا تھا بلکہ دوسروں کے لیے وہ ہمیشہ اس رخ پر صحت مند طریقے سے نظیر رہے۔ شہزادہ سلیم کی ادارت میں 1966 میں اشاعتی سفر شروع کرنے والے 'عکاس' کو بلندیوں تک پہنچانے میں کریم رضا مونگیری نے اہم کردار ادا کیا۔ فلم ویکلی سے پہلے اس اخبار کو انھوں نے شام نامہ کیا اور اس کے بعد روزنامہ۔ 1971 میں روزنامہ 'عکاس' کریم رضا مونگیری کی ملکیت میں آگیا تھا۔ بہار کے ضلع مونگیر سے تعلق رکھنے والے کریم رضا مونگیری کی تعلیم و تربیت کلکتہ میں ہوئی اور زمانہ طالب علمی میں صحافت سے وابستہ ہوگئے تھے، روزنامہ آزاد ہند، عصر جدید و دیگر اخبارات میں انھوں نے ترجمہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے کام کیا۔ ریلوے اور دیگر حکومتی اداروں کے اشتہارات کی ترجمہ نگاری میں انھیں مہارت کاملہ حاصل تھی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 جولائی 2020

سعدیہ دہلوی

نئی دہلی: معروف کالم نگار، صحافی، مصنفہ اور سماجی کارکن سعدیہ دہلوی کا پچھلی شب اچانک انتقال ہوگیا۔ وہ 62 سال کی تھیں اور انھیں کینسر کا عارضہ لاحق تھا۔ ان کی تدفین شیدی پورہ قبرستان میں ہوئی۔ ان کا پورا نام سعدیہ سید کرامت علی تھا، لیکن سعدیہ دہلوی کے نام سے مشہور دہلی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کا لازمہ حصہ تھیں اور ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ اکثر انگریزی اخبارات و جرائد میں مضامین لکھتی تھیں۔ پسماندگان میں والدہ زینت کوثر دہلوی، بڑے بھائی وسیم دہلوی اور صاحبزادہ ارمان علی ہیں۔ خیال رہے کہ فلمی اور ادبی رسالہ 'شمع' نکالنے

والے مشہور زمانہ یوسف دہلوی خاندان کی تیسری نسل کی نمائندگی کرنے والی خاتون تھیں۔ مرحومہ بالترتیب حافظ یوسف دہلوی اور یونس دہلوی کی پوتی اور بیٹی تھیں۔ ان کے انتقال کی خبر پر علمی، ادبی و سماجی تنظیموں نے شدید رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور صحافت کا عظیم خسارہ قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں سعدیہ دہلوی کی شادی کلکتہ کی مشہور سماجی شخصیت اور محمد جان ہائیر سکنڈری اسکول کے بانی خان بہادر محمد جان کے بیٹے محمد عثمان سے ہوئی تھی جو نبھ نہ سکی اور جلد علاحدگی ہوگئی۔ مرحومہ نے اس کے بعد 1990 میں ایک پاکستانی شہری رضا پرویز سے شادی کی۔ دونوں نے کچھ وقت کراچی میں گزارا جہاں 1992 میں ان دونوں کا بیٹا ارمان پیدا ہوا، پھر وہ واپس بھارت آگئیں۔ سعدیہ دہلوی کے مضامین اخبارات اور میگزین میں اکثر شائع ہوتے رہے۔ وہ اجمیر کے خواجہ غریب نواز اور دہلی کے حضرت نظام الدین اولیا کی بہت عقیدت مند تھیں۔ مرحومہ نے ٹی وی کے کئی پروگرام بھی لکھے اور کئی دستاویزی پروگرام پر وڈیوس بھی کیے جن میں 'اماں اور فیملی' شامل ہیں جسے ایک تجربہ کار اسٹیج اداکارہ زہرہ سہگل پر فلمایا گیا تھا۔ سعدیہ دہلوی نے 2009 میں صوفی ازم پر کتاب لکھی جس کا نام 'صوفی ازم اسلام کا دل' ہے جو ہارپر کولنز پبلشرز کی مدد سے شائع ہوئی تھی۔ ان کی دوسری کتاب 'صوفی کا آنگن' فروری 2012 میں شائع کی

گئی۔ 1989 میں انھیں بہترین صحافی کا ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی سماجی تنظیموں نے ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اگست 2020

ڈاکٹر اشرف جہاں

پٹنہ: شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ کی سابق صدر اور مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر اشرف جہاں کا 18 راگست کو میڈیکا اسپتال، راجندر نگر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر لگ بھگ 70 رسال تھی۔

ڈاکٹر اشرف جہاں کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی، اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹریٹ مکمل کیا۔ حصول تعلیم کے بعد ان کی تقرری گردنی باغ گرلس کالج پٹنہ میں لکچرر کے عہدہ پر ہوئی اور یہاں انھوں نے 1981 سے 1987 تک درس و تدریس کا کام انجام دیا۔ بعد ازاں انھوں نے پٹنہ کالج میں اکتوبر 1987 سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور پٹنہ یونیورسٹی کی صدر شعبہ ہوئیں۔ ان کے افسانوی سفر کا آغاز دورِ طالب علمی سے ہوا، تب سے زندگی کے آخر تک ان کا یہ سفر کامیابی کی اونچائیوں تک پہنچا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'شناخت' ہے۔ 'اکیسویں صدی کی نرملا' اور 'اگر میں نا ہوتی' ان کے دیگر افسانوی مجموعے ہیں۔ اردو افسانے کا بدلتا مزاج، اردو ناول کے آغاز میں دبستانِ عظیم آباد کا حصہ، شاد عظیم آبادی کا ناول صورۃ الخیال عرف ولایتی کی آپ بیتی کے مختصر ایڈیشن پر ان کے تنقیدی مضامین بھی شائع ہوئے۔ ان کا ایک انشائیہ 'ہم اردو کے ٹیچر ہوئے' بھی کافی مقبول ہوا۔ ان کے پسماندگان میں تین بیٹیاں، ایک بیٹا اور شوہر انجینئر نظیر حیدر ہیں۔

روزنامہ 'پندار' پٹنہ، 18 اگست 2020

ڈاکٹر رزاق اثر

گلبرگہ: گلبرگہ کے ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر رزاق اثر کا مختصر سی علالت کے بعد 84 برس کی عمر میں انتقال ہوا اور تدفین قدیم قبرستان ریلوے گیٹ شاہ آباد میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں دو فرزندان اور تین دختران شامل ہیں۔ مرحوم نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری اور بالخصوص طنز و مزاح نگاری میں اپنی علاحدہ شناخت قائم کی۔ ان کی بیشتر کتابوں کی اشاعت انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام انجام پائی۔ وہ نعت شریف کے ممتاز شاعر حضرت صابر شاہ آبادی کے قریب ترین احباب میں شمار کیے جاتے تھے جنھوں نے علاقہ شاہ آباد میں صابر شاہ آبادی اور محب کوثر و قاسم شاہ پوری کے تعاون سے یہاں کئی یادگار ادبی نشستیں اور مشاعرے منعقد کیے۔ ابتدائی زمانے میں انھوں نے حمد، نعت شریف اور منقبت لکھی اور بعد ازاں مختلف اصناف سخن میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا، اردو ادب میں انھیں ایک اچھے شاعر و ادیب اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 19 جولائی 2020

سید اطہر علی ہاشمی

کراچی: اردو کے سینئر صحافی اور استاد 74 سالہ سید اطہر علی ہاشمی 7 اگست کو انتقال کرگئے۔ سید اطہر علی ہاشمی 18 اگست 1946 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کا آبائی وطن دیوبند کے قریب واقع راجوپور تھا۔ انھوں نے لاہور اور جامعہ کراچی میں تعلیم حاصل کی۔

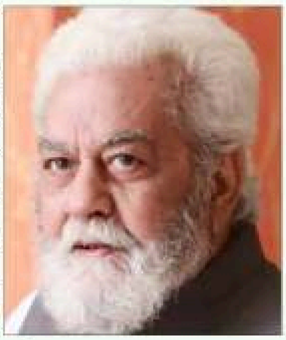

وہ پاکستان کے ممتاز روزنامہ 'جسارت' کے چیف ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے عرب نیوز اور اردو نیوز (سعودی عرب) جیسے اخبارات میں بھی کام کیا تھا۔ 'اردو نیوز' (جدہ) میں ان کا کالم 'آدھا آدمی پوری بات' بہت مقبول تھا۔ ان کے ہاں حس لطیف کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اردو کی نزاکت اور زبان کی صحت کے تعلق سے بہت سنجیدہ شخص تھے۔ جسارت کے ویکلی میگزین 'فرائیڈے اسپیشل' میں ان کا کالم 'خبر لیجیے زباں بگڑی' اپنے موضوع پر بہت اہمیت رکھتا تھا جسے پوری اردو دنیا میں پڑھا جاتا تھا۔ سید اطہر علی ہاشمی ایک دینی و علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ روزنامہ 'امت' اور روزنامہ جنگ (لندن) میں بھی صحافتی خدمات انجام دے چکے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اگست 2020

پروفیسر عنایت علی خان

کراچی: طنز و مزاح کے ممتاز شاعر پروفیسر عنایت علی خان

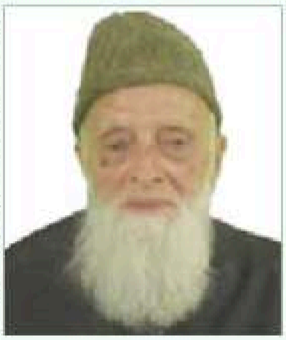

85 برس کی عمر میں 26 جولائی کو انتقال کرگئے۔ کراچی میں مرحوم کے اہل خانہ کے مطابق پروفیسر عنایت علی خان دل کا دورہ پڑنے کے باعث نجی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ علاوہ ازیں وہ کئی ماہ سے علیل تھے۔ شعبہ ادب و تدریس سے وابستہ افراد نے عنایت علی خاں کے انتقال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں درس و تدریس اور شعر و ادب کا ایک اور روشن چراغ بجھ گیا۔ عنایت علی خان قیامِ پاکستان سے پہلے ہندوستانی ریاست ٹونک میں 1935 میں پیدا ہوئے تھے۔ پروفیسر عنایت علی خان کے اہل خانہ نے 1948 میں ہجرت کے بعد سندھ کے شہر حیدرآباد میں سکونت اختیار کی اور وہیں انھوں نے اپنی تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے۔ مرحوم نے حیدرآباد میں ہی درس و تدریس، شعر و سخن اور سیاست میں حصہ لیا۔ طنز و مزاح کے علاوہ عنایت علی خان نے سنجیدہ شاعری میں منفرد اسلوب اپنایا تھا۔ آپ کے شعری مجموعوں میں 'ازراہِ عنایت'، 'عنایات' اور کلیات 'عنایتیں کیا کیا' بہت مقبول ہوئیں۔ علاوہ ازیں تدریس سے وابستہ پروفیسر عنایت علی خان کو 6 کتب پر انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 27 جولائی 2020

پروفیسر فیضان اللہ فاروقی

دہلی: سینٹر آف عربک اینڈ افریکن اسٹڈیز، جے این یو کے سابق سربراہ پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کا 22 جولائی

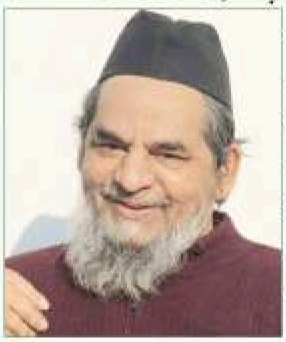

فجر سے پہلے انتقال ہوگیا۔ مرحوم خطۂ اعظم گڑھ کے ایک نیر تاباں تھے، وہ عربی اردو اور فارسی زبان و ادب کے زبردست عالم، نقد و بلاغت اور فن عروض کے فاضل یگانہ تھے، تینوں زبانوں کی ادبیات بالخصوص شاعری پر ان کی تقابلی نظر تھی، حافظہ قدرت نے کچھ ایسا بخشا تھا کہ سیکڑوں اشعار

ان کی نوک زبان پر ہوتے تھے، بڑی خوبیوں اور امتیازات کے مالک تھے۔ 2017 میں جے این یو سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ ان کی نماز جنازہ میں جامعہ ملیہ، جے این یو، اور ڈی یو کے اساتذہ وطلبا شریک تھے۔ تدفین آئی ٹی او قبرستان میں ہوئی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جولائی 2020

اسلم بقائی

امروهه: حلقہ ادب وشاعری میں قومی سطح پر امروہہ کی کامیاب نمائندگی کرنے والے معروف شاعر اسلم بقائی امروہوی کا 17 جولائی کی صبح حرکت قلب بند ہوجانے کے سبب انتقال ہوگیا۔ مرحوم کم وبیش 65 سال کے تھے۔

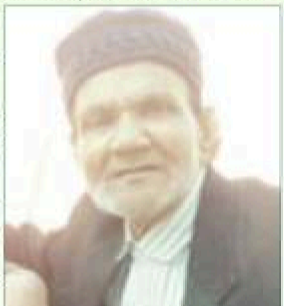

اردو ادب میں منفرد مقام رکھنے والے اسلم بقائی کے مداحوں میں اس خبر کے بعد شدید رنج وغم کا ماحول دیکھنے کو مل رہا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ اسلم بقائی امروہوی ملک بھر میں اپنے خوبصورت اشعار ومنفرد ترنم کے ساتھ امروہہ کی کامیاب نمائندگی کرتے تھے۔ شہر وملک کی مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہ کر مرحوم شاعری کے ساتھ دیگر ادبی وسماجی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ مرحوم بین الاقوامی ادبی تنظیم انجمن ترقی اردو کے سرگرم رکن تھے۔ اس کے علاوہ علاقائی سطح پر وہ حلقہ ارباب ذوق الانچی کلب امروہہ، بزم زندہ دلان امروہہ وغیرہ کے بھی سرگرم رکن تھے۔ مرحوم امروہہ کی نمائندہ سماجی تنظیم مسلم کمیٹی امروہہ میں رہتے ہوئے کمیٹی کی سالانہ تقریبات میں جوش وخروش کے ساتھ شرکت کیا کرتے تھے۔ مرحوم کے انتقال پر ملال پر ادبی وسماجی شخصیات نے اسلم بقائی کو خراج عقیدت پیش کیا اور دعائے مغفرت کے ساتھ پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 18 جولائی 2020

متین عمادی

پٹنه: پٹنہ کے مشہور ومعروف شاعر وادیب سید شاہ متین الحق عمادی کا 27 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ تجہیز وتدفین بعد نماز عشا خانقاہ عمادیہ منگل تالاب میں کی گئی۔ مرحوم کے پسماندگان میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ اپنے ہزاروں شاگردوں کے علاوہ مرحوم نے 6 کتابیں اور بہت سے مطبوعہ و

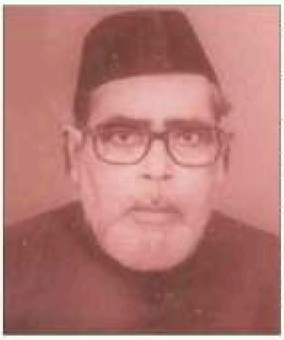

غیر مطبوعہ کلام یادگار چھوڑے ہیں جن میں نقوش صبیح (1981)، مراثی ظہور (2006)، فضل حق آزاد (2006)، انشائیہ کا مجموعہ 'میری آنکھیں اٹھا لیتی ہیں اس کو' اور دو شعری مجموعے 'گلشن عقیدت' اور 'لہجے کی شناسائی' شامل ہیں۔ سید شاہ متین الحق عمادی 28 فروری 1942 کو خانقاہ عمادیہ میں پیدا ہوئے۔ وہ فارسی اور اردو کی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ انگریزی میں بی اے پاس کیا اور حمید عظیم آبادی کے شاگرد ہوئے۔ اس دوران انھوں نے ایک سرکاری اسکول میں بارہ سال تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے پھر دو ماہ کے لیے جے۔ جے کالج میں لکچرار مقرر ہوئے اور پھر محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول (پٹنہ) میں اردو کے استاد مقرر ہوئے اور وہیں سے 2002 میں سبکدوش ہوئے۔ فن شعر وسخن میں وہ اپنے والد مولانا سید شاہ صبیح الحق عمادی سے تلمذ رکھتے تھے۔ شاہ متین الحق عمادی کا تعلق ایک ایسے صوفی گھرانے سے تھا جس میں تبلیغ دین اور علوم وفنون کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ ان کے اسلاف میں سب سے قدیم نام حضرت خواجہ عماد الدین قلندر عماد پھلواری بانی خانقاہ عمادیہ کا ہے جو بہار میں اردو زبان وادب کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان ہی کی نسبت سے متین خود کو عمادی لکھتے تھے۔ حضرت عماد کے صاحبزادے حضرت غلام نقشبند سجاد عہد میر سے قبل کے شاعر ہیں۔ اسی خانوادے میں شاہ نور الحق طپاں اور ظہور الحق ظہور پیدا ہوئے۔ شاہ متین الحق عمادی کے والد خانقاہ عمادیہ سید شاہ صبیح الحق عمادی کے آٹھویں سجادہ نشیں تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جولائی 2020

جلیل یار خاں

بارہ بنکی: ضلع کی مقبول ترین علمی وادبی شخصیت محمد جلیل یار خاں وارثی (79) نے مختصر علالت کے بعد میو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں قائم کیے گئے کورونا ایل-3 وارڈ میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ وہ محض ایک ہفتہ قبل لکھنؤ کے ایک نرسنگ ہوم میں علاج کے دوران کورونا پازیٹو پائے گئے تھے اور تبھی سے محکمہ صحت کے زیر انتظام کورونا وارڈ میں زیر علاج تھے۔ ان کی تدفین شہر کے قمریا باغ عام قبرستان میں کی گئی۔ مرحوم آبائی طور سے ضلع بریلی کے رہنے والے تھے اور آگرہ یونیورسٹی سے اردو اور ایکنامکس میں ڈبل ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جبلٹ اسلامیہ انٹر کالج میں اردو لکچرر کے طور پر انھیں تقرری اس وقت کے پرنسپل مرحوم ارادت حسین قدوائی کے زمانے میں سال 1971 میں ملی، جو سال 1975 میں اقلیتی تعلیمی ادارہ بننے کے بعد سال 1977 میں عظیم الدین اشرف اسلامیہ انٹر کالج سے تبدیل ہوگیا۔ جلیل یار خاں (مرحوم) منشی گنج محلّہ جو خاں صاحبان کے محلّہ کے نام سے جانا جاتا تھا میں مرزا اصغر ابیگ ایڈوکیٹ کے گھر میں کرائے دار بن کر سکونت پذیر ہوگئے اور اپنی شیریں زبان، خوش اخلاق واخلاص کے سبب کم وقت میں وہ شہر کی ہر دلعزیز شخصیتوں میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ کالج میں اپنے ہم پیشہ اساتذہ سے لے کر کالج کے مینجمنٹ میں بھی انھوں نے اپنی مقبولیت کافی بڑھالی۔ ان کی انھیں خصوصیات کے اعتراف میں انھیں 47 سال کی عمر میں عظیم الدین اشرف اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل کا چارج دے دیا گیا۔ اس عہدہ سے وہ 30 جون 2001 کو سبکدوش ہونے کے بعد کنگ چارج انٹر کالج انگلش میڈیم کے تھوڑے وقفہ تک پرنسپل رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جولائی 2020

ڈاکٹر عبدالباری

ممبئی: ملک کے مشہور ومعروف دینی، دعوتی، تعلیمی، تکنیکی اور رفاہی ادارہ جامعہ اسلامیہ خیر العلوم (خیر ٹیکنیکل سوسائٹی) ڈومریا گنج اور اس کے تمام ذیلی اداروں کے بانی اور روح رواں، کامیاب اور بہترین معالج ڈاکٹر عبدالباری

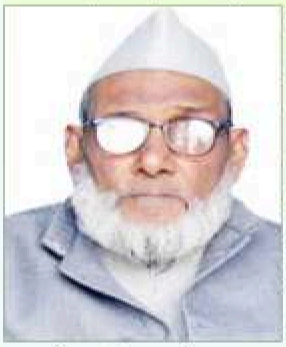

خان صاحب کا مورخہ 9 جولائی 2020 جمعرات کی رات لکھنؤ میں علی الصبح انتقال ہوگیا، سا کی ناکہ میں واقع جامع مسجد اہل حدیث خیرانی روڈ کے امام وخطیب مولانا عاطف سنابلی نے ان کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ آپ ملک وملت کے ایک عظیم ہمدرد شخصیت تھے، آپ کی پوری زندگی حرکت وعمل سے تعبیر ہے، آپ نے اپنی کوششوں سے نہ صرف متحدہ گونڈہ بستی بلکہ لکھنؤ سے لے کر پورے مشرقی اترپردیش میں تعلیمی، دینی اور تکنیکی اداروں کا ایک جال بچھا

دیا، تعلیم وتربیت، دعوت واصلاح، خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے میدان میں آپ کی خدمات جلیلہ انتہائی قابل قدر وتحسین ہیں۔ آپ نے ڈومریا گنج میں جامعہ اسلامیہ خیر العلوم کی شکل میں تعلیم ودعوت کا ایک چراغ روشن کیا جس سے آج پوری قوم اور پورا ملک فیضیاب ہو رہا ہے، بچوں کے لیے جامعہ اسلامیہ خیر العلوم ڈومریا گنج، بچیوں کے لیے کلیۃ الطیبات (عربی نسواں کالج)، خیر ٹیکنیکل سنٹر، خیر انٹر کالج، خیر گرلس انٹر کالج، یتیم خانہ وغیرہ جیسے کئی ایک ادارے قائم کیے، آپ کے قائم کردہ کئی ایک ادارے پورے ملک بھر میں سرگرم عمل ہیں اور ملک وملت کی خدمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی تعلیمی خدمات اور تعلیمی اداروں میں دینی وعصری علوم کا ایک حسین اور بہترین امتزاج نظر آتا ہے، آپ مرکزی و صوبائی جمعیت اہل حدیث کے ایک سرگرم اور موقر رکن تھے، اپنے علاقے کے برادران وطن اور دیگر مسالک و مکاتب فکر کے لوگوں کے ساتھ اچھے اور انتہائی بہترین مراسم اور خوشگوار تعلقات تھے، علاقے کی تمام سیاسی، سماجی اور سرکردہ شخصیات اور سبھی لوگ ڈاکٹر صاحب کو قدر واحترام اور عزت ووقار کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

https://urdu.millattimes.com/archives/58410

سردار انور

سہارنپور: 17 جولائی کی شب یہاں ضلع کی معروف

سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ادبی شخصیت ترقی پسند شاعر 'تم اپنی آنکھ کو روکو کسی سے کچھ نہ کہے/ ہمارے غم تو ہنسی کا لباس رکھتے ہیں' جیسے شعر کے خالق سردار انور کا چند روز کی مختصر علالت کے بعد یہاں انتقال ہوگیا۔ وہ 4 دن سے شیخ الہند میڈیکل کالج میں زیر علاج تھے جہاں انھوں نے آخری سانس لی۔ تجہیز وتکفین کے بعد نماز جنازہ اونچی مسجد میں ہوئی اور تدفین قطب شیر کے قبرستان میں رات ہی میں کردی گئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 70 سال کے قریب تھی۔ سردار انور نظریاتی لحاظ سے ترقی پسند اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ قومی ایکتا کمیٹی کے بانیوں میں شامل تھے۔ عمر بھر اسی سے وابستگی رہی، انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن (اپٹا) کے علاوہ آئی ٹی سی کی سگریٹ ورکس یونین کے صدر رہے آئی ٹی سی کی ملازمت سے ریٹائر تھے۔ ایمرجنسی کے زمانہ میں ایمرجنسی مخالفت میں جیل جا چکے تھے اور لوک تانترک سینانیوں میں تھے اور سرکاری وظیفہ پاتے تھے، انڈسٹریل مسلم گرلس انٹر کالج کی کمیٹی کی منتظمہ کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ مرحوم کا مطالعہ وسیع اور حلقہ احباب بھی وسیع تھا جس میں سماج کے سبھی طبقات اور مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ تاحیات انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے، شعری، ادبی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں اور قومی ایکتا کے پروگراموں میں شریک رہے۔ انتہائی فعال شخصیت تھے۔ سردار انور کے انتقال سے سہارنپور کے شعری اور ادبی حلقے سوگوار ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جولائی 2020

حسن نواز سیوانی

نئی دھلی: معروف نعت گو شاعر حسن نواز سیوانی کا 52 سال کی عمر میں ان کے آبائی گاؤں لیلورا، قصبہ مصطفیٰ آباد (سیوان) میں لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ جیسے ہی یہ افسوسناک خبر عام ہوئی اہل خانہ، احباب ورفقا اور ارباب فکر وفن میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ مختلف مساجد ومدارس کے ذمے داران، مقررین اور شعرا وادب نواز حضرات نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے ان کی بلندی درجات کی دعائیں اور اہل خانہ کو صبر وتحمل کی تلقین کی۔

مولانا سید قیصر خالد فردوسی نے اپنے شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حسن نواز سیوانی نے اصناف شعر و سخن کی سب سے نازک، مقدس اور پاکیزہ صنف نعت گوئی سے اپنے شعری سفر کا آغاز کیا اور عشق وعرفان سے لبریز معیاری حمد ونعت ومناقب گوئی اور خداداد انداز ترنم کے سبب ملکی سطح پر اپنی ایک منفرد پہچان بنائی، اور رفتہ رفتہ وہ دینی جلسوں، نعتیہ مشاعروں اور بزرگوں کے اعراس کی روحانی محفلوں کی ضرورت بن گئے۔ ان کے اچانک انتقال سے اس شعبے میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا ماضی قریب میں پر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی

قدر سہوانی

نئی دھلی: دہلی کے ادبی حلقوں میں معروف استاد شاعر قدر سہوانی کا 12 اگست کو انتقال ہوگیا۔ ان کی اچانک طبیعت بگڑ جانے پر لیڈی ہارڈنگ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں رات گیارہ بجے انھوں نے

آخری سانس لی اور اس دار فانی کو الوداع کہہ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم مشہور شاعر علامہ اخلاق سہوانی کے شاگرد تھے، ان کا اصل نام ظاہر حسین انصاری تھا۔ وہ بدایوں ضلع کے قصبہ سہوان کے محلہ چاہ شیریں کے رہنے والے تھے۔ گذشتہ 35 برسوں سے دہلی کے نبی کریم علاقے میں مقیم تھے جہاں ان کی پرس، بیگ بنانے کے میٹریل کی دکان تھی۔ وہ مذہبی ذہن ومزاج کے استاد شاعر تھے، ان کے حلقے کے بہت سے شعرا ان سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے، علاقہ نبی کریم میں ادبی تنظیم اردو برادری کے قیام میں انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا اور بہت سی شعری محفلوں کے وہ کنوینر بھی رہے۔ ان کی رحلت سے اردو شعر وادب کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ مرحوم قدر سہوانی کی عمر 64 سال تھی اور وہ شوگر کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ سمیت تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2020

خراج عقیدت

ڈاکٹر صادقہ ذکی کی رحلت پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق استاد ڈاکٹر صادقہ ذکی کے سانحۂ ارتحال پر صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم کی صدارت میں آن لائن تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ انھوں نے مرحومہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی علمی وادبی تصانیف کے حوالے سے کہا کہ پروفیسر محمد مجیب پر انھوں نے نہایت عمدہ تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شاگرد تھیں اور انھوں نے نہایت یکسوئی اور دیانت کے ساتھ علم وادب اور جامعہ سے اپنا قلبی وذہنی رشتہ وابستہ رکھا۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے کہا کہ ڈاکٹر صادقہ ذکی ایک مثالی استاد، خوش سلیقہ منتظم، عمدہ ادیب ومصنف اور اعلیٰ سیرت کی مالک خاتون تھیں۔ پروفیسر شہناز انجم نے کہا کہ مرحومہ نہایت نرم مزاج، مشفق، شائستہ اور خورد نواز تھیں۔ پروفیسر خالد محمود نے بتایا کہ صادقہ ذکی کی سات کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ بہت

مذہب پسند اور اعلیٰ علمی خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ان کی فیاضی اور کشادہ قلبی ناقابلِ فراموش ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے صادقہ ذکی کی سیرت واخلاق، سنجیدگی اور ذمہ دارانہ رویوں کے حوالے سے انھیں یاد کیا۔ پروفیسر شہپر رسول نے انھیں نہایت نفیس طبع، خوش شکل، خوش لباس، خوش خلق اور خوش اسلوبی سے طلبا کی تعلیمی وثقافتی سرگرمیوں کو انجام دینے والی خاتون قرار دیا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے ان کے حوالے سے اپنی خوشگوار یادوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موجودگی سے محفلوں میں ایک خاص قسم کی مہذب فضا برقرار رہتی تھی۔ پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ ڈاکٹر صادقہ ذکی ایک ایسی باوقار خاتون تھیں جن کی وجہ سے شعبے میں ایک اعتدال قائم ہوا۔ ایسی خواتین کا کسی بھی تعلیمی شعبے میں ہونا بہت ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالرشید نے ان کی نیکیوں کا ذکر کرتے ہوئے بہترین اخروی زندگی کی دعا کی۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے بحیثیت طالب علم اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میڈم بہت شفیق تھیں، طلبا کی سچی ہمدرد تھیں اور تدریسی وتربیتی سرگرمیوں میں منہمک رہتی تھیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر خالد مبشر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 17 اگست 2020

ناظم علی خان

ٹانڈہ / رامپور: انجمن ترقی اردو پردیش کے جنرل سکریٹری وسابق میونسپل چیئرمین محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ نے سینئر و بزرگ صحافی اور رامپور کے قدیم اردو اخبار روزنامہ ناظم کے چیف ایڈیٹر و مالک الحاج ناظم علی خاں کے سانحۂ انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ اپنے چھوٹوں سے بھی محبت شفقت اور انکساری سے پیش آتے تھے اور سب کا خندہ پیشانی سے احترام کرتے تھے۔ انھوں نے یا اپنے والد محب علی قادری کی وفات کے بعد روزنامہ ناظم اخبار کی اشاعت کو اپنی محنت اور جدوجہد سے پابندی کے ساتھ جاری رکھا۔ اردو ادبا اور رامپوری تہذیب کے اعلیٰ نمونہ اور شناخت تھے۔ مشاعروں کی صدارت اور نظامت کی خدمات انجام دیتے ہوئے اسٹیج کی نمایاں زینت نظر آتے تھے۔ رحمانی نے کہا کہ ناظم دفتر کے مرکزی ہال میں مغرب کے بعد شہر کے سماجی سیاسی ادبی اور شعرا وتبصرہ نگار حضرات کی نشستیں پابندی کے ساتھ ہوتی تھیں اور چائے کی تواضع اور چسکیوں کے ساتھ ملک کے حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ ان کی کمی کا احساس مدتوں ستائے گا۔ اللہ ان کا بدل عطا فرمائے۔ ان کی مغفرت اور درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ پسماندگان میں ان کے چھوٹے بھائی عاصم خاں، بیٹے اودنان ناظم خاں، مجاہد ناظم خاں و دیگر تمام ہی جملہ احباب کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جولائی 2020

ضیا شادانی

مرادآباد: شہر کی عظیم شخصیات میں سے ایک شاعر ضیاءالاسلام عرف ضیا شادانی کو پہلی برسی کے موقعے پر ضلع کے تمام ادبی حلقوں میں یاد کیا گیا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ سہل الفاظ میں معنی خیز شاعری کے لیے مشہور شاعر

ضیا شادانی 28 دسمبر 1948 کو محلہ نئی بستی تخت والی مسجد کے قریب سنبھل والی گلی میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں والد کے انتقال کی وجہ سے کنبہ کی کفالت کی ذمہ داری بھی ان کے کاندھوں پر آگئی۔

بچپن سے ہی شعر وادب سے دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کردی تھی۔ 67-1966 میں انصار انٹر کالج سے ہائی اسکول کر رہے تھے، تب ہی انھوں نے پہلا مشاعرہ پڑھا۔ خانگی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ شاعری کا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ مراد آباد اور دوسرے شہروں میں بہت سارے مشاعرے پڑھے اور خوب داد وصول کی۔ لکھنے میں دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے 1971 میں شعبہ صحافت میں قدم رکھا اور اخبار 'صدائے حق' اور 'ہماری زبان' میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ 2013 میں ان کی پہلی کتاب 'ایوان وفا' منظر عام پر آئی، جسے عوام میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کتاب کو 2014 میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے اپنی رہائش گاہ پر نقد ایوارڈ اور توصیفی سند دے کر نوازا تھا۔ سال 2017 میں ضیا شادانی کا دوسرا مجموعہ غزل 'سمندر پیاسا ہے شاید' شائع ہوا، اسے بھی خوب پسند کیا گیا۔ اس کتاب کو یوپی سرکار نے نقد انعام اور ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی تیسری کتاب بھی تقریباً مکمل ہوچکی تھی، لیکن اس دوران ان کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ مستقل علالت کی وجہ سے 20 جولائی 2019 کو رات 9 بجے کے قریب گلشن اردو ادب کا یہ نایاب گل ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا۔ ان کے انتقال کے تقریباً 2 ماہ 9 دن بعد ان کی اہلیہ سعیدہ ضیا کا بھی اس صدمے سے انتقال ہوگیا۔ ان کے دونوں بیٹوں کامران ضیا (صحافی) اور عدنان ضیا (اردو شاعر) نے ان کی یاد میں 'بزم ضیا' نام سے ہفت روزہ اخبار شروع کیا ہے۔ جلد ہی ان کی تیسری کتاب بھی شائع ہونے کی امید ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 جولائی 2020

منہاج نقیب

نئی دھلی: داؤدنگر کے معروف شاعر منہاج نقیب کی رحلت پر ایک آن لائن تعزیتی میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی کے ریٹائرڈ پروفیسر شاعر ادیب ناقد وسینئر صحافی ڈاکٹر محمد نوشاد عالم آزاد نے کی۔ منہاج نقیب مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے صدائے انصاری ویکلی دہلی کے مدیر ساحر داؤدنگری نے ان کی رحلت کو اردو شعر و ادب کا عظیم اور ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ انھوں نے مرحوم کی مغفرت اور ان کے صاحبزادے صفدر حیات کے لیے صبر کی دعائیں کیں۔

مرحوم کے دوست دہلی کے معروف شاعر عمران عظیم اور رانچی سے مرحوم کے قریبی دوست شاعر پرویز رحمانی نے مرحوم کی جدائی کو ناقابل برداشت بتایا۔ بنارس کے معروف شاعر ڈاکٹر بختیار نواز نے بھی اپنے ادبی ہمسفر کی جدائی پر اظہار افسوس کیا۔ پروفیسر عرفان آصف جنھوں نے ان کی شخصیت اور شاعری پر ایک کتاب مرتب کی ہے نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ داؤدنگر کے معروف شاعر ڈاکٹر اعجاز داؤدنگری نے بھی گہرے رنج وغم کا اظہار کیا۔ تمام لوگوں نے مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کی اور ان کے صاحبزادے صفدر حیات و دیگر متعلقین و متاثرین کے لیے صبر کی دعائیں کیں۔ آن لائن میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالقدوس، خورشید خان، سلیم انصاری جبل پور، حافظ خورشید، مناعزیز قریشی اور سعید احمد شامل تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 28 جولائی 2020

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

جزیرہ نہیں ہوں میں

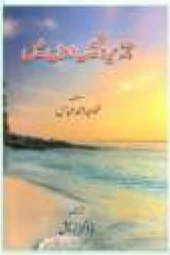

مصنف: خواجہ احمد عباس

ترجمہ: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 669، قیمت: 300 روپے

رامپور کے فارسی گو شعرا

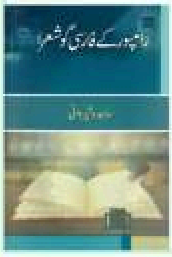

مولفہ: ساجدہ شیروانی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 290

قیمت: 160 روپے

بابر نامہ

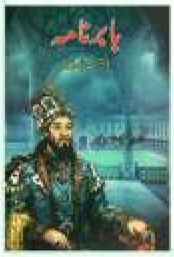

مصنف: ظہیر الدین محمد بابر

چھٹی طباعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 25 روپے

کلیم عاجز

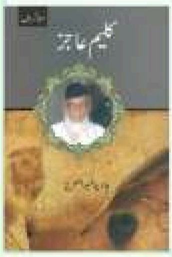

مصنف: جاوید عبدالعزیز

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: بابا نون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

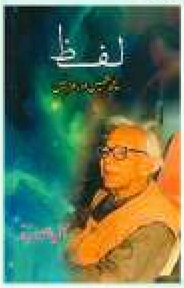

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

صحت الفاظ

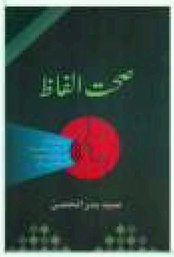

مصنف: سید بدر الحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

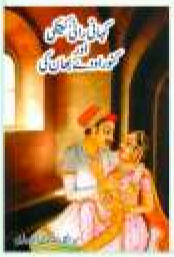

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746-011 فیکس: 26108159-011، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, September-2020, Vol.22, Issue:09
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/08/2020
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025